WWW.PAKSOCIETY.COM
حکایت
2015
نریندر مودی چاروں شانے چت!
RAHEEL
PAK ARMY
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

حقیقت نگار قلم کار میاں محمد ابراہیم طاہر کی شاہکار کتابیں

پاکستان 800 روپے

1 — 7000 روپے

سعودی عرب، کویت، اُردن، ایران، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، فرانس، ملائشیا، سوئٹزرلنڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی

2 — 7000 روپے

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ، نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گریناڈا

- غیر ممالک سے رقوم بھجوانے کے لئے "وقاص شاہد" کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں۔
- پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانی ضروری ہے۔
- کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔
- خط و کتابت اور بدل اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ: تبدیلی پتہ کی اطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیجئے۔

26-پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، لاہور۔ فون: 042-37356541

خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا بُرے کرے گا تو اُسے اُن کا نقصان پہنچے گا۔ اے پروردگار! ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کیجیو۔ اے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار! جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اُتنا ہمارے سر پر نہ رکھیو اور (اے پروردگار) ہمارے گناہوں سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا مالک ہے۔ اور ہم کو کافروں پر غالب کر (۲۸۶)

سورۃ البقرہ

جلد 44 | جولائی 2015ء | شمارہ 11

بانی
عنایت اللہ رح
شاہد بن عنایت اللہ

مدیراعلیٰ. صالحہ شاہد
مدیر عارف محمود
منتظم سعد شاہد

سرکولیشن منیجر
فضل رزاق
عرفان جاوید

شعبہ اشتہارات
خرم اقبال
محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ
محمد زبیر
پرائم کمپیوٹرز - لاہور

قانونی مشیر
وقاص شاہد ایڈووکیٹ

شعبہ تعلقات عامہ
میاں محمد ابراہیم طاہر

مجلس مشاورت
ابدال بیلا — عظمت فاروق
میم الف — ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر نغمی — ڈاکٹر نصیر اے شیخ
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
فضل رزاق 0343-4300564
عرفان جاوید 0322-4847677

قیمت -/90 روپے

ہیڈ آفس 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 2-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے: monthlyhikayat44@gmail.com primecomputer.biz@gmail.com

اس شمارے میں

اس شمارے میں

مسلم لیگ کا پہلا ”مسلمان“ بجٹ

موجودہ مسلم لیگ تیسری مرتبہ برسراقتدار ہے۔ یہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور تاجروں کی حکومت ہے اور یہ ہمیشہ انہی طبقات کے مفادات کو سامنے رکھ کر بجٹ بناتی اور پیش کرتی ہے لیکن وزیرخزانہ کی ہر بجٹ تقریر کی تان اس فقرے پر ٹوٹتی ہے کہ ”اس سے عام آدمی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا“۔

تاجروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے بجٹ سے پہلے ہی خوراک اور دوسری عام آدمی کے استعمال کی اشیاء کی وسیع پیمانے پر ذخیرہ اندوزی کررکھی ہوتی ہے لہٰذا نئے بجٹ کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے ہی مہنگائی کا ایک نیا طوفان آجاتا ہے اور عوام الناس جو مہنگائی، اشیاء ضروریہ کی نایابی، بے روزگاری اور امن و امان کی ناگفتہ بہ صورت حال سے بلبلا رہے ہوتے ہیں، نیا بجٹ ان کی مزید چیخیں نکال دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ امیر، امیر سے امیر تر اور عام آدمی غریب سے غریب تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ غریبوں کو نہ بجلی میسر ہے، نہ پانی، ہوا پر چونکہ تاحال حکومت کو کنٹرول حاصل نہیں ہوسکا، لہٰذا وہ عوام الناس کو میسر ہے لیکن وہ بھی امیروں کی گاڑیوں کے دھوئیں سے زہر آلودہ۔

موجودہ مسلم لیگی حکومت جب بھی برسراقتدار آئی ہے اس نے انتہائی بے رحمی سے غریب پنشنروں، معذوروں اور ضعیف العمر شہریوں کی قومی بچت سکیموں کے منافعوں پر ہاتھ صاف کیا ہے اور شرح منافع اتنی کم کر دی ہے کہ یہ لوگ زندہ درگور ہوکر رہ گئے ہیں۔ دوسری طرف عدالت عظمیٰ (سپریم کورٹ) نے حکومت کو حکم دیا تھا کہ پرائیویٹ اداروں سے ریٹائرڈ ملازمین کی ماہانہ پنشن، جو کئی سال سے 3600 روپے کی ہے، حالانکہ ای او بی آئی کے فنڈ میں تین سو ارب سے زائد روپے پڑے ہیں اور ان پر ہر حکومت کی رال ٹپکتی رہتی ہے۔ گزشتہ پیپلز پارٹی کے متعلقہ وزیر نے محنت کشوں اور ضعیف العمر پنشنروں کے اس سرمائے سے کروڑوں روپے خورد برد کیے ہیں اور سپریم کورٹ نے اسے جیل یاترا کرائی ہے اور کیس اب نیب کے پاس ہے۔

آئیے اب آپ کو ہم مسلم لیگ کے اس اوّلیں بجٹ کا حال سناتے ہیں جو تقسیم ملک سے چند ماہ پہلے،

متحدہ ہندوستان کے وزیر خزانہ خان لیاقت علی خان نے فروری 1947ء میں انڈین پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا جس نے ہندو سیٹھوں اور سرمایہ داروں کی "ماں ماردی تھی" اور غریبوں اور عام آدمی کو بے شمار ناروا اور بے جا ٹیکسوں سے نجات دلائی تھی۔ عام غیر مسلموں نے اسے "غریبوں کا بجٹ" اور مسلم عوام نے اسے "مسلمان" بجٹ کے نام سے شہرت دلائی تھی۔

ہندوستان کی عبوری حکومت کے تمام کلیدی عہدوں پر کانگریسی مہاشے براجمان تھے۔ وزارت خزانہ اس خیال سے مسلم لیگ کو پیش کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو مالیاتی امور کا کیا پتہ؟ وزارت خزانہ پر مسلم لیگ کی ناکامی، مجوزہ پاکستان کے منصوبے پر خطِ تنسیخ کھینچ دے گی کہ مسلمان ملکی امور چلانے کے اہل نہیں ہیں۔ وزارت خزانہ نوابزادہ لیاقت علی خان کو پیش کی گئی تھی جنہیں مالیاتی شعبے کا واقعی کوئی تجربہ نہ تھا لیکن وزارت خانہ کے جائنٹ سیکرٹری چوہدری محمد علی (مرحوم) مالیاتی امور میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ لیاقت علی خاں کا پارلیمنٹ میں پیش کردہ بجٹ چوہدری محمد علی کے تر دماغ کی اختراع تھا۔

گزشتہ جنگِ عظیم دوم میں ہندوستان کو اس قدر اخراجات برداشت کرنے پڑے تھے کہ ہر طرف خسارہ ہی خسارہ نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف خوفناک حد تک گرانی اور مہنگائی تھی۔ حکومت کے بھاری بھرکم ٹیکسوں نے غریب اور متوسط طبقے کا کچومر نکال دیا تھا لیکن ہندوستان کے سرمایہ داروں نے جنگ کے دوران خوب ہاتھ رنگے تھے۔ ہزار والے لکھ پتی اور لاکھوں والے کروڑ پتی بن گئے تھے اور یہ سب کے سب ہندو یا غیر مسلم تھے اور یہی کانگریس کی اصل "تجوری" تھے۔

لیاقت علی خاں کے بجٹ نے ٹیکسوں کا تمام بوجھ غریب اور متوسط طبقے سے ہٹا کر ان سرمایہ داروں، کارخانہ داروں، صنعت و حرفت سے وابستہ طبقے، بنکوں اور انشورنس کمپنیوں اور دیگر مالیاتی اداروں پر ڈال دیا جو سب کے سب ہندوؤں کی ملکیت تھے۔ اس طرح اس مالیاتی شعبے سے "نابلد" مسلمان بجٹ نے ہندو ساہوکاروں کی صفوں میں کھلبلی مچادی، بمبئی سٹاک ایکسچینج کریش کر گئی جس پر سو فیصدی ہندوؤں کا قبضہ تھا۔

اس بجٹ کے اصل تیار کنندہ مرحوم چوہدری محمد علی تھے جو پاکستان بننے کے بعد پہلے چیف سیکرٹری، پھر وزیر خزانہ اور آخر میں پاکستان کے وزیراعظم بنے اور پاکستان کے پہلے اسلامی دستور 1956ء کے خالق کہلائے۔ وہ انتہائی شریف النفس، محنتی اور محبِ وطن انسان تھے۔ انہوں نے جب پاکستان میں جاگیرداری، سرمایہ داری نظام پر ضرب لگانے کی کوشش کی تو مسلم لیگی اسمبلی پارٹی، جس کے بیشتر ممبران، اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے خلاف اکٹھے ہو گئے۔ چوہدری محمد علی نے اپنی کرسی بچانے کے لئے سیاسی جوڑ توڑ کی بجائے مستعفی ہو جانے کو ترجیح دی۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی وزیراعظم کے باعزت طور پر استعفیٰ دینے کی

غالباً پہلی اور آخری مثال ہے۔

بعد میں چوہدری محمد علی مرحوم نے نظام اسلام پارٹی کی بنیاد رکھی تو مشرقی پاکستان کے مشہور رہنما مولوی فرید احمد بار ایٹ لاء اس پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ ان دونوں عظیم اور محب وطن رہنماؤں کے ساتھ راقم کو کام کرنے اور قریب سے دیکھنے اور ان کی قیادت میں پنجاب بھر کا دورہ کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کی سادگی اور پارٹی کارکنوں سے محبت اور اپنائیت کا یہ عالم تھا کہ وہ اس دورہ کے دوران کسی وڈیرے، جاگیردار یا سرمایہ دار کی حویلی یا کوٹھی میں ٹھہرنے کی بجائے اپنے ورکروں کے درمیان کسی سکول، ڈسٹرکٹ کونسل کی بلڈنگ یا کسی احاطے میں فرش پر سونے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔

کیا موجودہ مغلیہ طرز کی نام نہاد جمہوریت جس میں ہر پارٹی سربراہ نے اپنا اپنا "ولی عہد" پال رکھا ہے، ابتدائی دور کی جمہوریت سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟

میاں محمد ابراہیم طاہر

ہر گچھا زخمایا!

کیسی قوم ہیں ہم؟

نہ اذان کے اوقات پر ایک، نہ عید پر اتفاق اور نہ اس معمولی سی بات پر متفق کہ اگر ہفتہ میں دو دو چھٹیاں ہوں اور دکانیں سر شام بند کر دی جائیں تو انرجی کرائسز کو بہتر طور پر ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔ ہم سوائے زلزلے، سیلاب اور دہشت گردی کے اور کہیں اکٹھے کیوں نہیں ہوتے۔ ہمیں تو متحد کرنے کے لیے ایک کتاب کافی ہے۔

جنگل میں شیر بھی متحد نہ ہوں تو کتے ہی ہو جاتے ہیں اور کتے بھی ایسے جنہیں جنگلی بھینسے بھی آگے لگا لیتے ہیں۔ دنیا کے تمام عظیم لیڈروں کی بنیادی فتح ہوتی ہی یہ ہے کہ وہ اپنے عوام کو کسی نہ کسی ایجنڈے پر متحد کر لیتے ہیں۔ ایجنڈا بھلے بدصورت اور غیر انسانی ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے چنگیز خان کا ایجنڈا تھا۔ "آؤ مل جل کر پوری دنیا کو پھڑکا کے رکھ دیں" اور اس نے ایسا کر دکھایا کہ زمانہ ہی ننگی جارحیت دھاندلی کا تھا۔ نہ دشت نہ دریا نہ بحر ظلمات، لوگ تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوئے اور تیغوں کے سائے میں مر جاتے۔ یا اپنا ورلڈ آرڈر نافذ کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ یہی آرڈر آف دی ڈے تھا اور سچی بات یہ کہ آج بھی یہی مسئلہ رائج الوقت ہے۔ کبھی گھوڑے دوڑاتے تھے۔ آج ڈرون اڑاتے ہیں اٹی بال اور اٹیلا دی ہن سے لے کر صدر اوباما تک بنیادی فرق یہ ہے کہ ماضی میں جو قتل و غارت ننگی ہوتی تھی، آج اس نے یو این او کو زیب تن کر رکھا ہے لیکن باطن آج بھی اتنی ہی برہنہ ہے جتنی ماضی میں تھی۔ جرم ضعیفی کی سزا کل بھی موت تھی آج بھی مرگ مفاجات ہے۔ قیصر و کسریٰ کے خزانوں سے لے کر زرمبادلہ کے ذخائر تک کہانی وہی...... واردات وہی لیکن طریقہ واردات تبدیل ہو گیا۔

لیڈر شپ کا کام ہی عوام کو کسی ہدف پر متحد اور منظم کرنا ہے اور اس ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی سونے کا نوالہ کھلانا پڑتا ہے، کبھی شیر کی آنکھ سے دیکھنا ہوتا ہے اور کبھی شیر کی طرح چیرنا پھاڑنا ضروری قرار پاتا ہے۔ لیڈر شپ رحم اور بے رحمی، سزا و جزا، سختی اور نرمی کا عجیب امتزاج ہے۔ کوئی ایسی قوم ہے ہی نہیں جس کا کوئی نہ کوئی سربراہ نہ ہو کہ اس کے بغیر تو قبیلے کیا گھر بھی نہیں چلتے۔ سربراہوں کے پاس سر کا ہونا ضروری ہے اور سروں کے اندر مغز لازمی لیکن ہمارے ہاں مغز سروں میں نہیں معدوں میں پائے جاتے ہیں۔

قائداعظمؒ نے لوگوں کو پاکستان بنانے پر یکجا کیا اور تحریک دی۔ دنیا نے دیکھا کہ معجزہ ہو گیا۔ اس کے بعد لے دے کر صرف ایک ذوالفقار علی بھٹو ہے جس کے ذہن میں ادھورا سا اک نقشہ ضرور تھا کہ افتادگان خاک کو اوپر اٹھانا ہے۔ وہ نیم تقریروں میں دیوانوں کی طرح عوام سے یہ وعدے لیتا تھا "لڑو گے...... مرو گے کام کرو

گے۔" لیکن پھر بھٹو بھٹک گیا۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو گیا۔

آج ایک ہجوم ہے جس کے پاس کچھ تجریدی نعروں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مثلاً پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔

ایشین ٹائیگر بننا ہے۔

کشکول توڑ دیں گے۔

کشمیر بنے گا پاکستان۔

مسلم امہ کی قیادت کریں گے۔

لال قلعہ پر جھنڈا لہرائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

خود اپنے آپ سے پوچھیے! کیا پچاس پچپن سال پہلے والے پاکستانی معاشرہ کا عکس بھی آج کے معاشرے میں کہیں دکھائی دیتا ہے؟ کیا آج کی لائف سٹائل کا کوئی تعلق پچاس ساٹھ سال پہلے والی زندگی سے ہے؟

ابھی کل کی بات ہے، گھر مرلوں میں لیکن دل کنالوں اور ایکڑوں میں ہوتے تھے اور آج گھر کنالوں اور ایکڑوں میں جبکہ دلوں میں گنجائش مرلوں جتنی بھی نہیں۔ کبھی فلم بینی تماش بینی کے زمرے میں آتی تھی اور آج ہر بیڈروم میں سینما ہاؤس کھلا ہے۔ آنے والے چالیس پچاس سالوں میں ہماری سماجی، معاشرتی اور ثقافتی اقدار کے ساتھ کیا کچھ ہو چکا ہو گا۔ چند عشروں قبل تک جو جہاں جنم لیتا وہیں پروان چڑھتا۔ لڑکپن، جوانی، بڑھاپے کے بعد وہیں کے کسی قبرستان میں سپرد خاک ہوتا۔ جبکہ آج کی نسلیں اپنی دھرتی سے دور ملکوں ملکوں خاک چھانتے ہوئے خوش ہی نہیں، بہت خوش ہیں اور خود کو کامیاب بھی سمجھتی ہیں۔

آج ہم میں کوئی کمی، کم ذات نہ رہا۔ کوئی ملک بن گیا، کوئی میاں بن گیا، کوئی چوہدری بن بیٹھا، کسی نے خود کو سادات ڈکلیئر کر دیا، کوئی رانا ہو گیا، کسی کو اچانک خیال آیا کہ وہ تو بھٹی تھا، کچھ شیخ صاحبان ہو گئے، کچھ نے خان بننے کا کامیاب فیصلہ کر لیا اور مغلوں کا تو جیسے اتوار بازار لگ گیا۔ بابا جی بھلے وقتوں میں کیا خوب کہہ گئے۔

تھاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا
کیکر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

موضوع سمندروں اور صحراؤں جیسا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ٹرانزٹ میں موجود یہ آدھا تیتر آدھا بٹیر معاشرہ اس یلغار کے ساتھ ڈیل کیسے کرے؟ اس کو ہینڈل کیسے کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور ہماری اقدار کی دیمک زدہ لاٹھیاں بھی بچ جائیں لیکن شاید یہ للوؤں پنجوؤں کے بس کی بات ہی نہیں۔ یہ ڈنگ ٹپاؤ لوگوں کا نہیں، ان کا کام ہے جو صدیوں پار دیکھ سکتے ہیں۔ یہ بقلول تو اگلے الیکشن سے آگے دیکھنے کے قابل نہیں۔

دستگیر شہزاد

خصوصی فیچر

نریندر مودی چاروں شانے چت

پاکستان اب ایک مسلمہ ایٹمی طاقت ہے اور یہ 1971ء کا دور نہیں ہے۔ ملک کی حفاظت وسلامتی مضبوط ترین ہاتھوں میں ہے جسے 18 کروڑ عوام کا مکمل تعاون حاصل ہے۔

افضال مظہر انجم
afzalmazhar@gmail.com

پاکستان کا وجود روز اول سے ہی بھارتی لیڈروں کی آنکھ میں کھٹک رہا ہے اور وہ اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہے۔ بھارت خطے میں تھانیدار بننے کا خواب دیکھ رہا ہے اور اس میں سب سے بڑی رکاوٹ چین اور پاکستان ہیں۔ حالیہ پاک چین دوستی کی تجدید اور چین کی طرف سے پاکستان میں 46 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کے معاہدے نے بھارت کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے اور انتہا پسند نریندر مودی پاکستان کے خلاف سرگرم ہو گیا اور نصف صدی سے زائد کے روایتی حریفوں پاکستان اور بھارت میں کشیدگی کو انتہا تک پہنچا دیا۔ کسی ایک فریق کی معمولی سی غلطی بھی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

65ء اور 71ء کی طرح اس مرتبہ بھی خطہ میں کشیدگی پھیلانے کی تمام تر ذمہ داری بھارت پر عائد ہوتی ہے۔ بھارت کی انتہا پسند ہندو قیادت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت خطے میں جنگی بخار پیدا کر رہی ہے۔ نریندر مودی کی زبان شعلے برسا رہی ہے۔

عرصہ دراز سے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویدار بھارت جس طرح سے جنوبی ایشیا میں منی سپر پاور کا رول ادا کرنے کے لئے بے چین ہے اسی طرح سے بنیا فطرت کاروباری میدان میں بھی اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے عرصہ دراز سے پر تول رہا ہے۔ بھارتی سیاسی لیڈروں، اعلیٰ فوجی حکام اور سرمایہ دار کی رگ اس وقت پھڑکی جب چین نے پاکستان میں 46 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کے تاریخی معاہدہ کا اعلان کیا۔ گو چینی صدر شی جن پنگ نے بھارت کے ساتھ بھی 10 ارب ڈالر کے کاروباری اور سرمایہ کاری معاہدے کئے لیکن اس کے باوجود بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے پاکستان سے چین کے ساتھ کئے گئے معاہدوں پر کھل کر تحفظات کا اظہار کیا۔ نریندر مودی نے اپنے چین کے دورہ کے دوران چینیوں کو رام کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ چینیوں کو آسان شرائط پر ویزہ دینے کی پالیسی کا اعلان کیا۔ انہیں احساس دلایا کہ دنیا کی آبادی کا 33 فیصد حصہ صرف دو ممالک چین اور بھارت میں بستا ہے لیکن پھر بھی چینی عوام کے دلوں میں بھارتیوں کے لئے جگہ پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب دو ممالک کے عوام ہی ایک دوسرے کے قریب آنے سے کترائیں تو حکومتی سطح پر ان ممالک کے درمیان کس طرح سے نفرت کی دیواریں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔

بھارت، امریکہ اور اسرائیلی معاہدے

بھارت نے چند ماہ پہلے امریکہ سے اربوں ڈالر کے تجارتی اور دفاعی معاہدے کیئے۔ اسرائیل سے اربوں ڈالر کے اسلحہ کی سب سے بڑی خریدار دنیا کی بھی سب سے بڑی جمہوری مملکت پاکستان کے 18 کروڑ عوام کے لئے ترقی اور روزگار کے راستے کھلنے کے تجارتی اور صنعتی معاہدوں پر پریشان کیوں ہے؟ بھارت ایسا ملک ہے جہاں کے 64 کروڑ عوام پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں کھا سکتے لیکن اسلحہ کے پوری دنیا سے انبار اکٹھے کرنے سے اس کی نیت سب کے سامنے آشکار ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ خطے میں تھانیداری کے لئے امریکہ سرکار اس کی مکمل پشت پناہ ہے اور اس تھانیداری کا مطلب دنیا کی ابھرتی ہوئی سپر پاور چین کے علاوہ پاکستان جیسے چھوٹے ملک کے مقابل بھی اسے بنیادی رول دیا گیا ہے۔ مودی کے اسرائیل کے دورے کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔

مسلمانوں کے ازلی دشمن اسرائیل سے بھارت کے گہرے تعلقات بھی پاکستان دشمنی پر مبنی ہیں۔ دونوں ہی مسلمانوں کی واحد ایٹمی طاقت کو پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتے۔ اسرائیلی ماہرین انڈیا کو نیوکلیئر آرسنل منظم کرنے کے لئے تکنیکی مدد فراہم کر رہے ہیں۔ اسرائیل دنیا کا واحد ملک ہے جس کی سائبر کمپنیاں انڈیا میں سرگرم عمل ہیں۔ پاکستان سے ہزاروں میل دور واقع اسرائیل کا بھارت کے ساتھ دفاعی تعاون صرف اور صرف پاکستان کے خلاف ہے کیونکہ اسرائیل نہ تو پاکستان کا ہمسایہ ہے اور نہ ہی اس کے پاکستان کے ساتھ کسی قسم کے تنازعات موجود ہیں۔ صرف مسلم دشمنی دونوں کے مشترکہ اتحاد کا ایجنڈہ ہے۔

نریندر مودی کی لفظی جنگ

نریندر مودی کے پاکستان کے ساتھ مخاصمانہ رویہ اپنانے، دونوں ملکوں کے تعلقات معمول پر لانے کی بجائے نفرت انگیز جذبات فروغ دینے حتیٰ کہ جنگی ماحول تک پیدا کرنے، پاکستانی تاریخ کے اہم ترین الیہ یا سانحہ میں کھل کر پہلی مرتبہ سانحہ کی ذمہ دار پارٹی کی برسراقتدار وزیراعظم سے پاکستان کی علیحدگی پر ایوارڈ وصول کرنے اور کھلم کھلا علیحدگی میں بھرپور مدد دینے کے اقدامات کے پس منظر میں مودی کی شخصیت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ نریندر مودی بھارت کی فرقہ وارانہ تنظیم آر ایس ایس کے رکن تھے جس کے صرف 2000ء تک 40 لاکھ اراکین موجود تھے۔ 2002ء میں مودی بھارتی ریاست گجرات کا وزیراعلیٰ تھا جب متنازعہ ایودھیا مسجد کو مسمار کر کے ہندو بلوائی ٹرین پر واپس لوٹ رہے تھے۔ اس ٹرین کو نامعلوم افراد نے آگ لگا دی اور 57 بلوائی جل کر ہلاک ہو گئے۔ ردعمل کے طور پر اس صوبہ گجرات کے ہندو انتہا پسندوں نے سینکڑوں مسلمانوں کو زندہ جلا ڈالا، قتل و غارت کی اور مسلمان خواتین کی بے حرمتی بھی کی۔ نتیجہ کے طور پر ایک لاکھ مسلمان بے گھر بھی ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ بھارتی پارلیمنٹ (لوک سبھا) کے مسلمان رکن احسان جعفری جو گجرات کے علاقے سے ہی منتخب ہوئے تھے، کے گھر پر ہزاروں ہندوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔ احسان جعفری نے اس موقع پر پولیس سے مدد مانگی لیکن قانون نافذ کرنے والے ادارے مسلمان ممبر پارلیمنٹ کی مدد کو نہ پہنچے۔ حتیٰ کہ بلوائیوں نے احسان جعفری کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں کاٹ ڈالے۔ اس ظلم و بربریت کو برداشت نہ کرتے ہوئے جعفری موت کے منہ میں چلے گئے۔ ان کے گھر میں پناہ لینے والے مسلمانوں کو بھی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اس وقت مودی جو ریاست کے وزیراعلیٰ تھے، نے اپنا ردعمل اس

طرح ظاہر کیا کہ کسی بھی کارروائی کا ردعمل تو ضرور ہوگا۔ ہندوؤں کی تنظیم راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ (آر ایس ایس آر) کے گھٹاؤنے نظریات کا اندازہ اس کے ایک سربراہ ایم ایس گول واکر کے فکر و نظریات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو اس نے اپنی کتاب میں واضح الفاظ میں کیا ہے۔ گول واکر لکھتا ہے:

''وہ منحوس دن تھا جب مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا تھا۔ اس دن سے آج تک ہندو قوم ان کے خلاف بڑی بہادری سے لڑ رہی ہے۔ ہندوستان میں صرف ہندوؤں کو ہی رہنا ہے اور باقی سب قومیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ غدار اور قومی مفاد کے دشمن ہیں۔ ان تمام قوموں کو ہندوؤں کے زیر نگیں رہنا چاہیے۔ نہ ہی وہ کوئی حق مانگیں اور نہ ہی کوئی مراعات''۔

ان خیالات سے آپ نریندر مودی اور ان جیسے انتہا پسندانہ خیالات رکھنے والے ہندوؤں کی فطرت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جس کی وجہ سے 69 سال پہلے بانی پاکستان کو مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت وجود میں لانا پڑی تھی۔

ارون دتی رائے بھارت کی عالمی شہرت یافتہ مصنفہ اور انسانی حقوق کی کارکن ہیں۔ انہوں نے بھارتی عوام کو بروقت متنبہ کیا تھا کہ مودی کو اقتدار میں مت لائیں یہ خطے کو تباہ کر دے گا۔ بی جے پی کی طرف سے مودی کو وزیراعظم کے امیدوار کے طور پر نامزد کرنے کو ارون دتی رائے نے المیہ قرار دیا تھا۔

میں کشمیریوں اور دیگر پسے ہوئے طبقات کی آواز بلند کرنے والی ارون دتی رائے کا یہ تجزیہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔

پاک چین اقتصادی راہداری پر بھارت کا واویلا

پاکستان عرصہ دراز سے دہشت گردی کی کارروائیوں سے دوچار رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد اس میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سابقہ حکومتوں نے بھی دہشت گردی کے عفریت کو ختم کرنے کے لئے کئی آپریشن کئے لیکن یہ سب وقتی حل ہی تھے۔ ان دہشت گردوں کے خاتمہ کے لئے آج تک کوئی حتمی آپریشن بروئے کار نہیں لایا جا سکا۔ اس کی وجوہات سابقہ حکومتوں کا مصلحتوں کا شکار ہونا اور خصوصاً امریکہ کے خطہ میں موجود ہونے کی وجہ سے اس کے دباؤ کی وجہ سے کھل کر کوئی کام نہ کر سکنا تھا۔ امریکی افواج کا خطہ سے انخلاء شروع ہوا تو دہشت گردی کے واقعات کا تسلسل کم ہونے کی بجائے بڑھتا چلا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان دہشت گردوں کو ہر سطح پر غیر ملکی عناصر کی مدد اور تعاون حاصل تھا۔ خصوصاً انڈیا کی خفیہ تنظیم را قبائلی علاقہ، بلوچستان اور کراچی میں دہشت گردی، گھیراؤ جلاؤ اور ہر قسم کی افراتفری کے واقعات میں ملوث تھی یا ان سیاسی، قوم پرست اور مذہبی تنظیموں کو اس تخریب کاری کے لئے بھرپور مدد فراہم کرتی تھی۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے افواج پاکستان نے جنرل راحیل شریف کی قیادت میں ان سارے عناصر کا قلع قمع کرنے کے لئے پہلے تو قبائلی علاقہ میں اس کے منبع یا نیٹ ورک کو تباہ کرنے کے لئے آپریشن ضرب عضب شروع کرنے اور پھر تمام سیاسی جماعتوں کے مشترکہ تعاون اور پوری قوم کی حمایت سے کراچی، بلوچستان اور ملک کے دوسرے حصوں میں نیشنل ایکشن پروگرام شروع کرنے کا اعلان کیا۔ امریکہ کو بھی تخریب کاری میں ملوث غیر ملکی اداروں 'را' وغیرہ کی تخریبی کارروائیوں کے ثبوت پیش کئے گئے۔ مودی سرکار نے جب دیکھا کہ چین جو دنیا کا اقتصادی جائنٹ بھی بن چکا ہے پاکستان جیسے ملک سے 46 ارب ڈالر کے معاہدوں سے منسلک ہو چکا ہے جس سے پاکستان کو بھی اقتصادی اور دفاعی طور پر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے مواقع حاصل ہوں گے اور وہ ترقی کی ایسی منازل طے کرتا چلا جائے گا

جس کا انڈین حکومت تصور بھی نہیں کر سکتی۔ دوسری طرف پاکستانی افواج کے ہر قسم کے دہشت گردوں اور ملک دشمنوں کے نیٹ ورک کو توڑنے کے لئے لگائی جانے والی کاری ضرب نے اس نیٹ ورک کے خاتمہ اور دہشت گردوں کی کمر توڑنے سے بھی پاکستان میں تجارتی اور صنعتی ترقی پُرامن ماحول کی وجہ سے اپنا سفر تیزی سے طے کرنا شروع ہوگی۔ مودی حکومت نے خواہ مخواہ کا تناؤ پیدا کرنے اور دونوں ممالک کو جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کر دینے والے بیانات اور حرکات کرنا شروع کر دیں جو ایک اچھے سیاست دان کے شایانِ شان نہیں تھیں۔

حکومت پاکستان خصوصاً چیف آف سٹاف نے بھی پاکستانی قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے ترکی بہ ترکی ان بیانات کے جواب دے کر انہیں خاموش کرادیا۔ ہر ملک کو دوسرے ممالک کے ساتھ سیاسی اور اقتصادی میدان میں معاہدے کرنے کا حق حاصل ہے۔ ایسے معاہدوں پر کسی دوسرے ملک کا واویلا کرنا مضحکہ خیز حکمت عملی ہی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی مودی نے لفظوں کی اس جنگ کے لئے غلط وقت کا چناؤ کیا اور انہیں نہ صرف اپنے ملک بلکہ عالمی سطح پر بھی تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات یا حرکت ہے کہ دو ممالک کے درمیان تجارتی معاہدوں پر تیسرا ملک خواہ مخواہ واویلا مچا رہا ہے۔ یہ نہ صرف سفارتی آداب کے خلاف ہے بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی اس کا جواز نہیں بنتا۔

مودی کا اپنا امیج خراب ہوا

نریندر مودی نے لگا تار پاکستان کے متعلق جن بے سروپا، حقائق کے برعکس اور غیر منطقی تاویلیں دے کر پاکستان کو دباؤ میں لانے یا عالمی سطح پر اس کا امیج خراب کرنے کی کوشش کی اس شکنجے میں وہ خود ہی پھنس کر رہ گئے۔ برما کے متعلق انہوں نے جو بڑ ہانکی بھارتی میڈیا نے ہی ان کا تمسخر اڑانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ بھارتی ڈی جی ملٹری آپریشنز نے بھارتی وزیر سے مختلف بیان دے کر سارا کھیل ہی خراب کر دیا۔ گویا مودی پاکستان کے لئے گڑھا کھودنا چاہتے تھے لیکن اس میں ان کو نہ صرف ناکامی ہوئی بلکہ پوری دنیا کے سامنے سبکی اٹھانا پڑی اور ایک سنجیدہ سیاست دان کی حیثیت سے ان کے قد و قامت میں کمی آئی۔

شنگھائی تعاون تنظیم کی رکنیت

نریندر مودی کی بے سروپا باتوں اور خواہ مخواہ کی لفظی جنگ سے نہ تو ان کے ملک کو کوئی فائدہ پہنچ سکا، نہ ان کا سیاسی قد بلند ہو سکا بلکہ بھارت کے میڈیا میں اور عالمی سطح پر مودی کا ایسا چہرہ سامنے آیا جس کے پیچھے انتہا پسند ہندو چھپا ہوا تھا۔ آج کی مہذب دنیا میں اس قسم کے لیڈروں کے خیالات کو پذیرائی حاصل نہیں ہوتی جس نے بغل میں چھری منہ میں رام رام جیسا رویہ اپنایا گیا ہو۔ مودی بعد میں خود ہی اپنا رویہ اس لئے بھی بدلنے پر مجبور ہوئے کہ شنگھائی تنظیم کے جولائی میں ہونے والے اجلاس میں بھارت اور پاکستان کو مکمل رکنیت حاصل ہونے کا امکان ہے اور پاکستان نے اس اجلاس میں بھارت کے دہشت گردی کے ثبوت عالمی اداروں کو پیش کرنے کا مکمل پروگرام بنایا ہوا ہے جس کی وجہ سے مودی اب کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے پر مجبور ہیں۔ بھارتی قیادت کو یہ سوچ لینا چاہئے کہ پاکستان اب ایک مسلمہ ایٹمی طاقت ہے اور یہ 1971ء کا دور نہیں ہے۔ ملک کی حفاظت و سلامتی مضبوط ترین ہاتھوں میں ہے جسے 18 کروڑ عوام کا مکمل تعاون حاصل ہے۔ پاکستان کو جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کرنے کے بعد ہونے والے نقصان سے بھارت 20 سال پیچھے کی طرف چلا جائے گا اور دوبارہ سنبھل نہیں سکے گا۔

O

نے ہاتھ باگ پہ ہے نے پا ہے رکاب میں

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کئی عام سے لوگوں کی اولادیں محض کالے دھن، فارن کرنسی اکاؤنٹ کو ضبط کر کے اور قرض اتارو ملک سنوارو سکیم سے اربوں پاؤنڈ، ڈالرز، یورو، ریال ہتھیا کر اربوں کھربوں پتی بن چکے ہیں

☆ سکواڈرن لیڈر (ر) سید ریاض الحسن

پاکستان اور چین کا حالیہ معاہدہ جس پر چھیالیس ارب ڈالر لاگت آئے گی۔ ایک عظیم الشان منصوبہ ہے۔ یہ ایک طویل المیعاد اور کافی قیمتی پراجیکٹ ہے جس سے چین اور پاکستان کے اکثر علاقے مستفید ہوں گے۔ یہ ایک انتہائی صبر آزما مرحلہ ہے جس پر اکثر تجزیہ نگار تو بہت خوش نظر آتے ہیں لیکن بعض تنگ نظر سیاستدان اپنے تحفظات کا بھی اظہار کرتے رہے ہیں۔ ہمارے تجربکار اور جہاندیدہ وزیراعظم نے اے پی سی بلا کر سب کو مطمئن کر دیا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اتنے شدید اعتراضات کیا تھے جن کی بناء پر ایک دوسرے کو غدار اور بکاؤ مال قرار دیا گیا تھا۔ یہ سب گھناؤنے الزامات چند گھنٹوں کی ملاقات، گفتگو اور خورد و نوش میں ہوا ہو گئے۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں جس کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا

آخر ہمارے یہ سیاستدان کس پائے کے ہیں کہ جب مخالفت پہ آتے ہیں تو پورے ملک میں آگ لگانے کی دھمکیاں دیتے ہیں لیکن ان کے شور و غوغا کی ہوا خوان من و سلویٰ پہ ہی نکل جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں 'را' نے جو اربوں روپے تقسیم کیے تھے وہ کس کی تجوری میں گئے۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ آخر ایسے سیاستدانوں اور تبصرہ نگاروں کو کون بے نقاب کرے گا جو طرح طرح کے سکینڈل اچھالتے ہیں اور چند دنوں میں ہی جھاگ کی

طرح بیٹھ جاتے ہیں۔

سوئس اکاؤنٹ کا سکینڈل، ہیش خاں کی لوٹ مار اور اب ایگزیکٹ کا کاروبار وغیرہ سب قوم کو بے وقوف بنانے کے ڈرامے ہیں یا ان سے کچھ حاصل بھی ہوگا۔ یہ سارے سیاسی لیڈر مل کر سابق صدر صاحب سے یہ درخواست کیوں نہیں کرتے کہ وہ اپنا مال و دولت سوئس بینک سے نکال کر موجودہ راہداری منصوبہ میں پاکستان کا حصہ ہی ادا کر دیں۔ قوم ان کو ایک دفعہ پھر صدر اور ان کے ٹیلنٹڈ سپوت کو وزیراعظم بنانے کے لئے تیار ہے۔ موجودہ وزیراعظم تو سمجھوتوں کے علاوہ کچھ کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ موجودہ (ن) لیگ حکومت پبلسٹی کی تو ماہر ہے۔ اگر اخبارات اور ٹی وی تبصروں کو مدنظر رکھا جائے تو پاکستان میں خوشحالی، ترقی اور امن و امان کا دور دورہ ہے لیکن عوام زیادہ تر پریشان حال ہی ہیں اور حکمران طبقہ خوش حال ہے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ پاک چین دوستی کوہ ہمالیہ سے بلند اور سمندروں سے گہری ہے لیکن اس کا زمین پر کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ 1970ء میں پاکستان نے امریکہ اور چین میں رابطہ کا اہم کارنامہ سرانجام دیا اور ایک سال کے اندر انڈیا کی اندرا پالیسی کے تحت پاکستان ٹوٹ گیا تو امریکہ اور چین کسی نے بھی پریشانی کا بھی مظاہرہ نہیں کیا، مدد کرنا تو دور کی بات ہے۔ پاکستان کا جو وفد قائد عوام کی سربراہی میں چین گیا تھا اس نے وہیں بیٹھ کر حکومت کا تاج قائد عوام کے سر رکھنے کی سازش کر لی۔ یہ سازش پاکستان توڑے بغیر کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا سقوط ڈھاکہ سے مغربی حصہ کے عوام بھی خوش اور قائد عوام بھی مطمئن ہو گئے۔ البتہ سازش کو عملی جامہ پہنانے والے جرنیل ملک بدر کر دیے گئے۔

قائد عوام نے بظاہر پاکستان اور چین کی دوستی کو مضبوط کیا لیکن حقیقتاً اپنے روٹی کپڑا مکان کے منشور کے ذریعے سوشلزم کا راستہ روک لیا تاکہ جاگیرداری نظام پہ زد نہ پڑے۔ بعد ازاں کئی حکومتوں نے امریکہ اور چین دونوں کو خوش رکھنے کی پالیسی جاری رکھی۔ موجودہ (ن) لیگی حکومت بھی اسی پالیسی پہ گامزن ہے۔ ان سرمایہ داروں نے پاکستان کو بین الاقوامی مانگت بنا دیا ہے۔ کشکول توڑنے کے دعوے اور وعدے کر کے جھولی کو مزید وسعت دے دی ہے۔ مختلف ترقیاتی منصوبے اسی صورت میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں جب پاکستان عملی طور پر بھی ان میں حصہ دار ہو۔ ہماری ٹریکیں بنانے کے لئے، انہیں چلانے کے لئے، توانائی کے منصوبے مکمل کرنے کے لئے، جنگی سامان تیار کرنے کے لئے اور روزمرہ استعمال کی اشیاء بنانے کے لئے غیر ملکی فرمیں کام کر رہی ہیں حتیٰ کہ کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگانے کے لئے وسادر سے ماہرین درکار ہیں۔ ہمارے حکمران صرف قرضے لینے اور ان کو ٹھکانے لگانے کے ماہر ہیں۔

ہمارے سیاسی راہنما انتخابات میں دھونس، دھاندلی اور جھرلو کے ماہر ہیں۔ ان کے پاس وافر دولت اور جاں نثار جیالے اور متوالے کل وقتی موجود رہتے ہیں۔ بیرونی وسائل کے سہارے گزارا کرنے والے لیڈر ایسے منصوبوں سے اجتناب کرتے ہیں جن میں مقامی افرادی قوت کام کرے۔ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد بیرون ملک چاکری کریں اور جو بے روزگار یہاں رہ جائیں وہ الیکشن میں کام آئیں۔

بعض سیاستدانوں اور ان کے حواری تجزیہ نگاروں کا یہ خیال ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اگرچہ پاکستان میں دس عام انتخابات ہو چکے ہیں اور ہر انتخاب میں گزشتہ سے زیادہ دھاندلی کا شور مچا ہے اور پہلے سے بدتر لوگ برسراقتدار آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے ایک ایسے مرد حر کو بھی بطور صدر برداشت کیا جو کرپشن کا بے تاج بادشاہ تھا اور

جس کے سوئس اکاؤنٹس کا ابھی تک بہت شور وغوغا ہے اور اب بفضل الٰہی ایک ایسے صدر مملکت کے ہم ممنون احسان ہیں جن کو اپنے محلے والے لوگ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ جمہوریت کا اگر یہی مطلب ہے کہ کھربوں روپے خرچ کر کے ایسے مٹی کے مادھو ملک وملت پر مسلط کر دیئے جائیں جن کے روزانہ اخراجات کی کوئی حد نہ ہو اور کام کے سلسلہ میں کوئی مد نہ ہو تو یہ بہت کامیاب نظام حکومت ہے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کئی عام سے لوگوں کی اولادیں محض سیاہ دھن، فارن کرنسی، اکاؤنٹ کو ضبط کر کے اور قرض اتارو، ملک سنوارو سکیم کے تحت اربوں پاؤنڈز، ڈالرز، یورو، ریال وغیرہ ہتھیا کر ارب پتی بن چکے ہیں۔ ان محب وطن لیڈروں کے اپنے کاروبار بیرون ملک ہیں اور یہ دوسروں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ باہر سے دولت کما کر یہاں کاروبار کریں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!

اس ملک میں امن وامان کی حالت اتنی گئی گزری ہے کہ تقریباً روزانہ دھماکے، قتل وغارت اور خودکش حملے معمول بن چکا ہے۔ پولیس کسی کے ایماء پہ کبھی ماڈل ٹاؤن میں تباہی مچاتی اور کبھی ڈسکہ میں قانون والوں کا تیا پانچا کرتی ہے۔ قانون دان جن میں کئی جعلی ڈگریوں کے حامل ہیں، بھی قانون اپنے ہاتھ میں لینے سے دریغ نہیں کرتے۔ کسی سیاسی لیڈر میں اتنی جرأت اور اہلیت نہیں کہ وہ وکلاء اور مخالف سیاسی راہنماؤں سے مذاکرات کر کے ان کو قائل کرے کہ بدامنی اور دھاندلی کا حل گھیراؤ، جلاؤ اور دھرنوں میں نہیں بلکہ باہمی گفت وشنید ہے اور ہر ایک کو ہر معاملے میں نظم وضبط کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ جب ایک بڑے صوبے کے وزیراعلیٰ ایک جمہوری منتخب صدر کو زر بابا چالیس چوروں کے سربراہ کے طور پر خطاب کریں اور انہیں سڑکوں پر گریبان سے پکڑ کر گھسیٹنے کا پبلک جلسوں میں اعلان کریں تو ان کے زیر سایہ پولیس سکھا شاہی کا مظاہرہ نہ کرے تو اور کیا کرے۔

ملک میں بدعنوانی کا یہ عالم ہے کہ رینجرز کے سربراہ کے مطابق صرف کراچی میں ہر سال اربوں روپے کی بھتہ خوری ہوتی ہے۔ اس مکروہ کاروبار میں زیادہ تر سیاستدان ملوث ہیں۔ اپنے کالے کرتوتوں کو تحفظ دینے کے لئے وہی زیادہ شور بھی مچاتے ہیں۔ چور مچائے شور کے مصداق بدعنوان اتنا شور مچاتے ہیں کہ نشاندہی کرنے والے شرمندہ ہو جاتے ہیں۔

ملک کے اندر کئی منصوبوں کا شور وغوغا ہے لیکن عوام کو سہولتوں کا روز بروز فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ بڑے شہروں میں میٹرو بسوں کی دہائی بہت بلند ہے۔ پنڈی، اسلام آباد میٹرو منصوبے پر تقریباً چالیس ارب روپے خرچ کئے گئے جس پر ایک لاکھ لوگ روزانہ یورپین سٹائل میں سفر کریں گے اور حکومت کو ایک ارب روپے سالانہ سے زیادہ سبسڈی ادا کرنا پڑے گی۔ اس چالیس ارب روپے سے آٹھ لاکھ موٹر سائیکلیں خریدی جا سکتی ہیں جو لوگوں میں مفت تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ بغیر سود پہ قسطوں پر دے دی جائیں تو حکومت اور عوام ہر دو کو فائدہ ہوگا اور ایک اچھا کاروبار بھی فروغ پذیر ہوگا۔ اسی طرح لاہور، ملتان، کراچی، پشاور، فیصل آباد وغیرہ میں بھی وفاقی، مفید اور قابل عمل منصوبے بنائے جا سکتے ہیں۔

لاہور میں فیروز پور روڈ پر سفر کرنے والوں کو تو کافی آسانی مہیا کی گئی ہے لیکن باقی بیسیوں علاقوں میں آنے جانے والوں کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ کئی اہم سڑکوں پر جو بسیں چل رہی ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ فیروز پوریوں کو جنگلا بس مہیا کر کے باقی کئی لاکھ افراد کو جنگل کے قانون کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ کئی ایسے روٹ ہیں جہاں ویگن سروس بڑی عمدگی سے چل رہی تھی۔ اس اچھی سروس کو ختم کر کے ڈیوہیکل بسیں چلائی گئیں جن

سے کئی مسائل پیدا ہوئے۔ زیادہ رش کے اوقات میں تو یہ بسیں اوور لوڈ ہوتی ہیں لیکن دوسرے اوقات میں یہ اکثر خالی دوڑتی رہتی ہیں جس سے مالکان کو نقصان ہوتا ہے جس کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑتا ہے یا حکومت عوام کا خون نچوڑ کر سبسڈی ادا کرنا پڑتی ہے۔

دو گونہ عذاب است جان مجنوں را

اب اگر مناسب منصوبہ بندی کی جائے، مختلف روٹس کا جائزہ لے کر ان پر ضرورت کے مطابق بسیں، ویگنیں اور موٹر سائیکل رکشہ وغیرہ چلائے جائیں۔ ان کی فٹنس اور اوور لوڈنگ، اوور چارجنگ وغیرہ کا ٹھیک ٹھیک محاسبہ کیا جائے۔ ٹریفک وارڈنز جیسے موئس (؟) الیٰ فورس کا نام دیا گیا ہے ان کو مناسب مقامات پر ٹھیک طور پر تعینات کیا جائے اور ان کو باقاعدگی سے چیک کیا جائے تو ٹریک پہ معقول حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ کافی وارڈنز جعلی ڈگریوں کے حامل ہیں ان سے نجات بھی ضروری ہیں آج کل بعض مقامات پر مثلاً گورنر ہاؤس، کلب چوک وغیرہ پر ان کا ہجوم ہوتا ہے اور بعض اہم پوائنٹس کو خالی رکھا جاتا ہے۔ یہ نامناسب طریقہ فوری ختم ہونا چاہئے۔

سیاسی راہنماؤں کو بھی اپنی اداؤں اور زبانوں پر کنٹرول کرنا چاہئے۔ اسلام آباد میں میٹرو کی افتتاحی تقریب کے دوران جناب وزیراعظم کا فوجی حکومتوں پر طنز کرنا انتہائی نامناسب اور احمقانہ حرکت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ فوج نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے۔ فوجی حکومتوں نے تو منگلا اور تربیلا جیسے عظیم الشان منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچائے جس سے ابھی تک ملک و قوم استفادہ کر رہے ہیں۔ سول حکومتوں نے تو زیادہ تر اسپ فروشی، اور باہمی گالی گلوچ کے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ اب مرد حر جناب سابق صدر صاحب نے بھی جرنیلوں کے سیاہ کارنامے طشت از بام کرنے کا چیلنج دیا ہے تو

انتہائی بے موقع اور فضول بات ہے۔ ان کے سسر صاحب جناب قائد عوام نے بھی جرنیلوں کو لٹکانے کا دعویٰ کیا تھا جس کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا ثابت نہیں ہوا۔ اب شاید پی پی شہدا کی ارواح مردِ حر کو پکار رہی ہیں۔

تمام سیاسی بزرجمہروں کو یاد رکھنا چاہیے کہ فوج ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے نہایت کٹھن کام میں مصروف ہے اور بے شمار قربانیاں دے کر دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کی تگ و دو کر رہی ہے۔ اس نازک موقع پر فوج کو چیلنج کرنا اور طنزیہ فقرے استعمال کرنا ملکی اور سیاسی مفاد میں ہرگز نہیں تحسین معلوم ہوتا ہے کہ سیاستدانوں کے لئے اقتدار میں دس سال گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔ 1968ء میں چاند رات کے جھگڑے نے ملک میں افراتفری شروع کی گئی جس کا آج تک ہم خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اس دفعہ بھی عیدالفطر جمعۃ المبارک میں آنے کا امکان ہے جو ہمیشہ حکومت پر بھاری ہوتا ہے۔ صوبہ خیبر بھی اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بلدیاتی انتخابات کے سلسلہ میں وہاں احتجاج شروع ہو چکا ہے۔ اگر دوبارہ انتخابات کرائے گئے یا صوبائی حکومت کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا تو پھر مرکز اور دوسرے صوبوں کی بھی خیر نہیں۔

یاد رکھئے کہ انتخابات اور دھاندلی لازم و ملزوم ہیں۔ جمہوری حکومتیں اور عوام ظالم و مظلوم ہیں۔ بے شمار بے روزگار لوگ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کسی علاقے میں گڑبڑ ہو اور وہ اپنے گھیراؤ جلاؤ والے جوہر دکھائیں۔ ان حالات میں سیاستدانوں کی فوج سے محاذ آرائی تاریخ کو دہرانے کے مترادف ہے اور مرحوم پیر پگاڑہ کی یہ پیشگوئی حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے کہ اب کے مارشل لاء لگے گا تو پندرہ سال تک رہے گا۔ تمام سیاستدانوں کا سخت محاسبہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی بنیاد ہی بدعنوانی پر ہوتی ہے۔ بدعنوانی سے یہ پروان چڑھتے ہیں اور بدعنوانی کو ہی اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کرتے ہیں۔ یہ نسل در نسل بدعنوانی کے غلام ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سے کسی بھلائی اور ملک و ملت کی بہتری کی توقع عبث ہے۔

قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق حکمرانی کا حق اسے حاصل ہوتا ہے جو بسطۃً فی العلم والجسم (القرآن) یعنی ایسے لوگ علمی اور جسمانی میدان کے شہسوار ہوں۔ اکثر سیاستدان علمی لحاظ سے زیرو اور جسمانی طور پر معذور ہوتے ہیں جو ان کے کالے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ شراب و شباب و کباب کے رسیا اور ذہنی طور پر مفلوج ہوتے ہیں اسی لئے ان کی بڑھک بازی دیوانے کی بڑ کہلاتی ہے۔

قرآن مجید کے معیار کے مطابق صرف سول و ملٹری افسران ہی حکومت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور درحقیقت حکومتیں چلا بھی وہ رہے ہیں سیاستدان تو محض مفادات حاصل کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ گذشتہ قومی اسمبلی کے 288 ممبران ایسے تھے جو ایوان میں پانچ سال تک ایک دفعہ بھی بولنے نہیں پائے۔ ایسے گونگے پہلوانوں پر سالانہ اربوں روپے خرچ کرنا بہت بڑا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اسی رقم سے بے شمار عوامی فلاحی منصوبے بن سکتے ہیں اور پاکستان شاہراہ ترقی پر گامزن ہو سکتا ہے۔ پاک چین راہداری منصوبہ یقیناً ایک شاندار کارنامہ ہوگا لیکن اس کی تکمیل کے لئے ربع صدی درکار ہے۔ اگر چین کی اس پیشکش پر فوری عمل کیا جائے کہ وہ منگلا اور تربیلا ڈیمز کی صفائی کر کے چھ ماہ کے اندر پاکستان کی ضروریات سے زیادہ بجلی پیدا کر سکتا ہے تو ایک انتہائی خوش آئندہ اقدام ہوگا۔ افواج پاکستان بھی یہ کام سرانجام دے کر پاکستان کو خوشحالی اور ترقی یافتہ ملک بنا سکتی ہیں بشرطیکہ سیاستدانوں کی بولتی بند کی جائے۔

◆◆◆

جنگل کا قانون

یہ جو ہم نے انسان بن کے لوٹنا، چھیننا، توڑنا اور سازشیں کرنا سیکھ لیا ہے جنگل کے تمام باسی اس سے نابلد ہیں۔ انہی نوکیلے جذبوں کی تربیت کے لئے خدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔

☆ ابدال بیلا

انسان نے بستیوں میں بسنے والے ہم انسان نما مخلوق نے جنگل اور جنگل باسیوں سے کبھی انصاف نہیں کیا۔ دنیا کی تاریخ میں جب پہلے پہل کہیں انسان بستی کہیں انسان بستی بسائی گئی تو کسی نہ کسی جنگل کو تاراج کر کے ہی بنائی گئی ہوگی۔ جنگل سے ہم نے کیا کچھ نہیں چھینا۔

پہلے علاقہ لیا۔

پھر اس علاقے کے پیڑ پودوں کو کاٹا۔

پھلوں کو نوچا۔

پھولوں بھری جھاڑیوں کو کوڑا سمجھ کے اٹھایا، اٹھوایا۔

وہاں کے جانوروں کو ہم نے پکڑا۔

کچھ حلیم طبع جانوروں کو اپنی آسانی اور تواضع کے لئے گھروں میں رکھ لیا۔

گائے، بھینس، بکری، مرغی۔

ان سے کبھی ہم گوشت لیتے، کبھی دودھ اور انڈے۔

جنگل کے گھوڑوں کو نکیل ڈال کے ہم نے سدھا لیا۔

کسی کو سواری کے لئے رکھ چھوڑا۔

کسی کو تانگے کے آگے باندھ لیا۔

خون خوار جبڑے والے کتوں کو دو بوٹی اور ایک روٹی کا ایسا چسکا لگایا کہ وہ ہماری تجوریوں کی حفاظت کے لئے ہمارے دروازوں پہ پہریدار بن کے فرمانبرداری سے کھڑے ہو گئے۔ بلیاں یونہی تماشا دیکھنے، جنگل سے بستیوں میں چلی آئیں۔ انہیں توقع تھی کہ یہاں انسانی بستیوں میں بغیر اچھل کود کئے انہیں وافر چھچھڑے مل جائیں گے۔ مل گئے۔ وہ ادھر رک گئیں۔ ہمارا تماشا پھر بھی ختم نہ ہوا۔

ہم جنگل سے ریچھ پکڑ لائے۔

اس کی ناک سے سوا گز ار کے ایک رسی باندھی کہ وہ ہمارے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے ہمارے سامنے ناچنے لگا۔ اس کے ناچ کے ہر قدم پہ ہم اس کے کھلے جبڑے اور نکلی ہوئی بھوکی پیاسی زبان پہ تھوڑے سے سوا دی پیوندکاری کر دیتے۔ وہ خالی پیٹ بھی ناچتا رہتا۔ جنگل نے نامی گرامی جانور ہم انسانوں نے اپنی چالاکی سے پکڑ لئے۔

ہاتھی مار دیئے۔
ان کی کھال کے تمبو تانے اور ان کے دکھاوے کے
سو ہے دانتوں کو سونے کے مول بیچ دیا۔
شیر پکڑ کے چڑیا گھر میں بند کر دیئے۔
چڑیوں کی اڑان پنجروں میں بند کر دی۔
باہر دروازے پہ ٹکٹ لگا دیا۔
جنگل کا سارا حسن اختیار، وقار اور امن ہم نے چھین لیا۔
سب کچھ جنگل سے لے لیا مگر جنگل سے جنگل کا قانون نہ لیا۔
الٹا اپنی بستیوں کی بدنظمی، انتشار، فساد اور لاقانونیت کو جنگل کے قانون سے تشبیہ دینا شروع کر دی۔ جو کوئی بھی جنگل کو جانتا ہے اسے پتہ ہوگا کہ جنگل سے زیادہ پرامن جگہ کوئی دوسرا جنگل ہی ہو سکتا ہے۔ کوئی انسانی بستی ہرگز نہیں۔
جنگل کے قانون کی پہلی شق یہ ہے کہ وہاں کا کوئی باسی اپنی بھوک سے زیادہ شکار نہیں کرتا۔
وہاں کون سے جانوروں نے فریج رکھے ہوئے ہیں کہ اپنے سے کمزور جانوروں کو مار مار کے رکھتے رہیں۔ نہ، وہاں ایسا کوئی رواج نہیں۔ بس جس کو جب بھوک لگی، وہ پیٹ بھرنے کے لئے نکل پڑا۔ چیونٹی سے لے کر شیر تک سبھی اس قانون سے بندھے رہتے ہیں اور کبھی یہ قانون نہیں توڑتے۔
کہنے کو جنگل میں ہزار ہا طرح کی مخلوقات ہوتی ہیں۔
جنگلی پودے، پیڑ، درخت، جھاڑیاں اور گھاس بھی سانس لینے والی مخلوق ہے مگر اپنے قدموں پر کھڑی رہتی ہے۔ رزق چل کے ان کے پاس آتا ہے، یہ وہاں سے ایک قدم آگے پیچھے نہیں ہوتے۔ جس پودے کو جو حسن و جمال مل گیا، وہی اس کی پہچان بن گیا۔ کسی پہ اودے پھول لگے ہیں، کوئی لال نارنگیوں سے لدا ہے۔ کسی پہ سنہرے غلاف میں میٹھے رس بھرے آم پکے ہوئے ہیں۔ کوئی مہاداموں بھرا درخت ہے۔ کسی پہ کچھ بھی نہیں۔ نہ پھول نہ پھل۔ وہ پھر بھی سر اٹھائے کھڑا ہے۔ شرمندہ نہیں ہے۔ ہوا کی ہلکی سی لہر سے اس کے پتے مسکراتے ہیں۔ اپنی بے نیازی دکھاتے ہیں۔ ایسے پودے بھی ہیں وہاں جنھوں نے اپنے حصے کا سارا پانی پیا ہی نہیں۔ دوسروں کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے پتوں کو سکھا کے کانٹا بنا لیا ہے۔ وہ کانٹوں بھری جھاڑیاں بھی ہر صبح مشرق سے نکلتے سورج کی پہلی کرن چھو کے خوشی سے سنہری ہو جاتی ہیں۔ کسی کے پاس کوئی گلہ شکوہ ہے ہی نہیں۔ پھر ان پیڑ پودوں کے تن پہ جو بھی پھل پھول لگے ہیں وہ ان کے اپنے لئے نہیں ہیں۔
کوئی آئے، کوئی جائے۔
ان سے پوچھنا ضروری ہی نہیں۔
پرندے ان کی ٹہنیوں میں گھسے پھل کھا رہے ہیں یا نیچے کھڑا کوئی انسان پتھر مار کے ان کے پھل گرا رہا ہے، یہ کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ بس صرف اتنا چاہتے ہیں کہ قدرت نے جو بھی انہیں نعمت دی ہے وہ کوئی لے لے، کوئی بھوکا اپنا پیٹ بھر لے۔ انہی درختوں کو کاٹ کے ہم جنگل میں اپنے گھر بناتے ہیں، بستیاں بساتے ہیں۔
پیڑ کٹ جائیں تو پرندے اڑ جاتے ہیں۔ گھونسلے گر جاتے ہیں۔
مگر ہمیں کیا پروا، ہم تو انسان ہیں۔
جنگلی تھوڑی ہیں۔
حقیقت میں ہم جنگلی جانوروں سے کہیں زیادہ مکار اور چالاک ہیں۔
بجائے ان کی معصومیت سے کچھ سیکھنے کے، ہم نے اپنی مخلوق میں انہیں بدنام کیا ہوا ہے۔ ان جانوروں کے لئے ہم نے الٹی سیدھی کہانیاں بنائی ہوئی ہیں۔

شیر بادشاہ ہوتا ہے، سب کو کھا جاتا ہے۔

کتنا کھائے گا؟

جب ایک بار اس کا پیٹ بھر گیا تو لاکھ اس کے پاس بکریاں اور ہرنیاں اچھلتی کودتی پھریں، اسے کیا؟

جنگل تو اس پورے خطہ ارض پہ وہ چند سکون بھرے خطے ہیں جہاں کوئی جانور کبھی سازش نہیں کرتا۔

کوئی کسی سے بیر نہیں رکھتا۔

کوئی کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

کوئی اپنے حصے سے بڑھ کر ہاتھ نہیں مارتا۔

جنگل میں ابدی امن ہے۔

سکون ہے۔

قناعت ہے۔

وہاں ایک چھوٹی سی چونچ والی چڑیا کو بھی یہ علم دیا گیا ہے کہ رات جتنی مرضی کالی ہو، اس کی صبح ضرور روشن ہوگی اور وہ چڑیا یہ بھی جانتی ہے کہ جب روشنی اندھیرے کو پھاڑ کے نکلے گی تو اس کے نصیب کا دانہ اسے ضرور ملے گا۔

کاش ہم شہروں والوں کے نصیب میں جنگل میں رہنے والی چڑیا کے توکل کی ایک بوند ہی آجائے۔

کتنا امن آجائے۔

یہ جو ہم نے انسان بن کے لوٹنا، چھیننا، توڑنا اور سازشیں کرنا سیکھ لیا ہے جنگل کے تمام باسی اس سے نابلد ہیں۔ انہی نوکیلے جذبوں کی تربیت کے لئے خدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ آخری سبق آئے بھی پندرہ سو سال گزر گئے۔ مگر ہم انسان آنے والے دن کے علم بارے ایک چڑیا جیسا یقین بھی پیدا نہ کر سکے۔ الٹا شرمندگی میں اپنی بستیوں کو اپنے ہاتھوں سے لوٹ کے اپنے پھیلائے فساد کو "جنگل کا قانون" کہہ کے جنگل کی توہین کرتے ہیں۔

ماہنامہ
حکایت
لاہور
ستمبر 2015ء
کا شمارہ
قیمت: 100 روپے
سالگرہ نمبر
اپنی سابقہ روایات کے ساتھ شائع ہوگا
اپنی پسند کا کوئی مضمون، آپ بیتی، یادگار واقعہ، ناقابلِ فراموش
پاک بھارت جنگ، جرم و سزا، شکاریات، دین اسلام وغیرہ
کشمیر کی جنگِ آزادی، جگ بیتی، سچی کہانی، افسانہ، مہم جوئی
اپنی تحریریں 20 جولائی تک ارسال کردیں۔ صرف وہی تحریریں ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں واپس بھیجی جائیں گی جن کے ساتھ واپسی ڈاک ٹکٹ ہوں گے۔
ماہنامہ حکایت 26- پٹیالہ گراؤنڈ لاہور

معاشرت

آگے صرف تاریکی نظر آتی ہے، گورستان کی تاریکی جس میں کھو کر میں بھی دھرتی میں بکھر جاؤں گا۔

حسرت

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر)

مجھے یاد ہے نصیب میرا کوئی گہرا دوست نہیں تھا مگر وہ اپنے شرارتی جثے میں خوب بھلا کرتا تھا اور اپنی نوع کے لڑکوں میں خاصا مقبول تھا، میرا ہم جماعت تھا۔ عام لڑکوں کی طرح پڑھائی میں متوسط درجے کا تھا مگر سکول بلاناغہ آیا کرتا تھا۔ اسے ڈرائنگ آرٹ سے بڑا پیار تھا، اسی ناطے سکیل ڈرائنگ میں مہارت رکھتا تھا۔ ہم اس وقت میٹرک کے مراحل طے کر رہے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ہم دنیاوی گورکھ دھندوں میں ہوش پا رہے تھے۔

نصیب اپنے والدین کی اکلوتی امید تھا۔ بسا اوقات اکلوتا پن بھی کندھوں پر بھاری لگنے لگتا ہے مگر نصیب کے معاملے میں اس کا بوجھ ملنے والے اتھاہ پیار میں تحلیل ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے انوکھا فیصلہ کر لیا۔ ایسے غیر منطقی فیصلوں کی بعض اوقات کوئی بھی وجہ نہیں ہوتی۔

نصیب نے اچانک تعلیم چھوڑ دی، یہ اسی نوع کی کارستانی تھی جو عموماً ہمیں ازدواجی طلاق میں نظر آتی ہے۔ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی جو خاندان بھر کو بعید از قیاس دکھا کرتی تھی۔ اس نے والدین کو خاصے کٹھن مراحل سے دوچار کر دیا۔ اعزاء نے اسے پیار سے سمجھایا، چند ایک نے سختی بھی کی مگر نصیب اپنے ارادوں میں پختہ نظر آیا۔ پھر ناقابل یقین احباب کو قابل یقین بھائی دینے لگا۔

"والد ان پڑھ ہونے کے باوجود ذوق حیات یہاں تک کھینچ لایا ہے تو میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟" وہ یہ جواب دے کر ہر کسی کو لاجواب کرنے کی کوشش کرتا اور باور کرا دیتا کہ وہ شعور کا محیط اسی قدر رکھتا تھا۔

مایوسی کے عالم میں والد نے ہر حربہ آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ہر قیمت پر بیٹے کو سدھارنا چاہتا تھا۔ پہلے تو جان پہچان والے ہر شخص کو کوستا رہا جس کے بارے میں اسے شک ہوا کہ اس نے نصیب پر کالا جادو کر دیا تھا، پھر بیٹے کو ہمراہ لے کر جگہ جگہ گھومتا پھرا۔ کئی پیر فقیروں سے ملا، خانقاہوں پر حاضری دی، عاملوں کی مدد لی، ٹوٹکے کیے، جنوں سے نبرد آزما ہوا مگر سعی لاحاصل نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی بلکہ نصیب کا حوصلہ کچھ مزید بڑھ گیا۔ وہ پڑھائی سے مکمل طور پر بدظن لگنے لگا۔

نصیب کا دماغ پتھریلا ضرور ہوا تھا مگر وہ پتھر دل لڑکا نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر والوں سے پیار کرتا تھا، خصوصاً اسے والد پر ترس آتا تھا کیونکہ دونوں کے بیچ انس کی گہرائی موجود تھی۔ والد نصیب کا آئیڈیل بھی تھا، شاید اسی لئے اسے والد کا پیشہ بھی دلکش لگتا تھا۔ وہ اپنے طور پر والد کا ہاتھ بٹانا چاہتا تھا۔

ہم عمر طنز کرتے تب بھی نصیب کو گوالا کہلانا معیوب نہیں لگتا تھا۔ وہ صبح و شام والد کے ہمراہ کئی دوستوں کے ہاں دودھ بیچ آیا کرتا تھا۔ کبھی یہ ذمہ داری تنہا بھی سرانجام دے دیا کرتا تھا۔ اس کاروبار کا ایک ہی پہلو اسے رنجیدہ کیا کرتا تھا، جب والد اسے سمجھاتا کہ "میں عمر بھر تنگ دست رہا ہوں اور آنے والے وقتوں میں تازہ دودھ کا کاروبار مندا پڑ جائے گا۔ بلکہ گزرتے وقتوں کے پچھتاوے اس پر مسلط ہو جائیں گے اور ماضی اسے خون کے آنسو رلائے گا"۔

ان باتوں کا اثر نصیب پر معمولی ہوا کرتا تھا، کبھی ہوتا اور کبھی بالکل نہ ہوتا جس کے باعث اس میں سنجیدگی کا فقدان موجود رہا اور وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔

دوراں کے گرداب نے آخر نیا رنگ دکھایا۔ ایک روز نصیب میرے میڈیکل سٹور آن دھمکا۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ مجھے برسوں کا بیمار نظر آیا۔ بیتے ہوئے وقت نے داستانیں اس کے چہرے پر رقم کر دی تھیں۔ مفلسی کی کہانی وہاں واضح پڑھی جاتی تھی۔ مجھے گوگو میں دیکھ کر اس نے اپنا تعارف کروا دیا۔ اب وہ گوالا نہیں تھا۔ محنت کشوں کے اپنے المیے ہوتے ہیں۔ کبھی روزگار مل جاتا ہے تو کبھی روزی کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اب وہ معمولی پڑھا لکھا محنت کش تھا۔

نصیب کے دل میں والد کے لئے پیار زندہ تھا جس کا اظہار اس کی گفتگو میں نظر آتا تھا۔ اس کا والد عارضۂ قلب میں مبتلا تھا اور اپنے خاندان پر بوجھ بن چکا تھا۔ نصیب اس کا علاج کرانا چاہتا تھا مگر تذبذب کا شکار لگتا تھا۔ اس نے کسی ڈاکٹر سے نسخہ حاصل کر رکھا تھا مگر علاج کا مرحلہ گراں پاتا تھا۔

نصیب میرے سٹور پر ادویہ خریدنے آیا تھا۔ اس نے جیب سے مڑا تڑا نسخہ نکالا اور پھر ورق میری طرف بڑھا دیا۔ لمحہ بھر کا غذ میرے ہاتھوں میں بوجھ بن گیا۔ نصیب بضد تھا کہ اسے دواؤں کے نرخ بتائے جائیں اور اچھی ادویہ دی جائیں۔ بالآخر میں نے تقاضا پورا کر دیا۔

نسخے کی کل مالیت اس کی کئی روز کی مزدوری سے بڑھتی نظر آئی اس کے چہرے پر یاس بھرے رنگ ابھرنے لگے۔ اس نے ہر دوا کی افادیت پر بات کی، پھر نسخے کا آخری جزو لے کر چلا گیا۔ غالباً وہ صرف اسپرین خرید سکتا تھا۔ مجھے نصیب پر ترس آیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دل میں والد کا ملال رکھتا تھا مگر بے بسی اس کے آڑے آ گئی تھی۔ اب اس کے دل میں دو الم پل رہے تھے، ایک باپ کے دکھتے قلب کا اور دوسرا اپنی کسمپرسی کا۔ ان دکھوں میں اس نے پچھتاوے بھی سمو لئے تھے۔

اس کے بعد نصیب میرے پاس اکثر آیا کرتا تھا۔ نسخے میں موجود ہر دوا کی اہمیت کھوجتا اور کئی بار قیمت پوچھتا، پھر اسپرین خرید کر چلا جایا کرتا۔ اکثر مکمل نسخہ خریدنے کا وعدہ بھی کرتا۔ مگر کھسیانا ہو کر خود ہی ہنس پڑتا۔ اس کی ہنسی میں بھی مایوسی جھلک اٹھتی۔ یہی اس کا معمول بن گیا تھا۔ مدد کی پیشکش وہ سختی سے ٹھکرا دیتا تھا۔ غریب تھا مگر انا کا بھرم ہر حال میں جلائے رکھنا چاہتا تھا۔

ایک روز نصیب نے پرائز بانڈ خرید لیا، پھر شوق سے مجھے لا کر دکھایا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی دعائیں ثمر لائیں گی اور پرائز بانڈ اس کی کایا پلٹ ڈالے گا۔ اس طرح وہ اپنے والد کا علاج کروا سکے گا اور اپنی کوتاہیوں کا مداوا کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے گا۔ وہ انعامی قرعہ اندازی کے روز بانڈ میرے پاس لے آتا مگر پھر مایوس گھر لوٹ جایا کرتا تھا۔ ایک بار تو اس کے آنسو اسپرین کی گولیوں پر چھلک پڑے تھے، جو بانڈ کے نمبروں پر بکھری اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ اس شام میں پہلی بار نصیب کے گھر گیا تھا۔ اس کے والد کی جسمانی کیفیت ابتر لگتی تھی۔ میں کچھ دوائی اس کے والد کو دینے آیا تھا۔ اس روز نصیب نوٹ کر رویا تھا۔ اس کے اہلِ خانہ پریشان ہو گئے تھے۔ وہ غالباً نصیب کے دل کی خلش سے لاعلم تھے۔

اس واقعے کے بعد نصیب سے باہمی رابطہ ٹوٹ گیا۔ میں نے وقتاً فوقتاً دوائیں اس کے گھر بھجوائیں مگر تعلق بحال نہ ہو سکا۔ کبھی یادوں کے بیچ اس کا خیال ذہن میں کلبلانے لگتا مگر غمِ دوراں اسے لمحوں میں محو کر دیتا۔ اسی طور روز و شب کے انبار لگتے رہے۔

پھر ایک شام وہ میرے سٹور پہنچ گیا۔ موسم اس دم سرد تھا اور ماحول پر کہر کا غلبہ تھا۔ میں اپنا سٹور بند کر رہا تھا۔ نصیب افسردہ دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کی طرف توجہ دی اور اپنے خلوص کا اظہار کیا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس شام نہ تو اس نے دواؤں کی قیمت جانی اور

مداری

جن کے اخلاق عمدہ ہیں ان کی صحبت اختیار کرو۔ لازم نہیں جس کے ارد گرد لوگ جمع ہوں، وہ اللہ کا دوست بھی ہو۔ مجمع تو مداری بھی اکٹھا کر لیتے ہیں۔

نہ ہی کمر توڑ مہنگائی کا رونا رویا۔ بار بار خیالوں میں کھو جاتا تھا۔ رخصت ہوا چاہتا تھا کہ میں نے اسے روک لیا، پھر چند ادویہ اس کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ میں حیران ہوا جب اس نے دوائیں فوراً واپس کر دیں، پھر بے قابو ہو کر رو پڑا۔

”محترم والد کو اب دواؤں کی حاجت نہیں رہی“۔ اس نے بھیگی آواز میں کہا۔ ”وہ دعاؤں کے جزیرے میں بسیرا کر چکے ہیں۔ بھرپور علاج کے انتظار میں اب وہ ابدی نیند سو چکے ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں معاشی بدحالی دیکھ کر وہ قلبی الم کا تذکرہ بھی چھوڑ چکے تھے۔ انہوں نے صبر کا کفن موت سے کئی روز قبل اوڑھ لیا تھا“۔ الفاظ نصیب کی زبان پر ٹوٹنے لگے اور وہ رواں اشکوں میں سسکیاں بھرنے لگا۔ مجھے ہمیشہ کی طرح اس پر ترس آیا اور دلی افسوس بھی ہوا۔ لگا، میں بھی ماضی میں اس کی مدد کر سکتا تھا اور اس کے لئے بہتر سہارا بن سکتا تھا مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ نصیب بولتا رہا۔

”اب صبح و شام میں مرحوم کے لئے قرآن پڑھتا ہوں کہ ایسا کرنا میرے اپنے بس میں ہے“۔ اس نے کہا اور اشک آنکھوں میں سمیٹنے کی سعی کرنے لگا۔ اسی دوران اس نے اپنی جیب سے مڑا تڑا پرائز بانڈ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ انعام اس کے نام نکلا ہوا تھا مگر وہ رقم حاصل کرنے نہیں گیا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے خالی دامن پھیلا دیا، کہا کہ جس کے لئے میں نے یہ بانڈ خریدا تھا وہی چلا گیا، اب میں رقم پا کر کیا کروں گا؟ میں نے بے اختیار

اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حسرتوں کے بادل اُمڈ آئے تھے۔

"اس رقم سے تم اپنے بچوں کو تعلیم دلواؤ اور والد کی آرزو پوری کرو"۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے رائے دی مگر وہ بدستور روتا رہا۔

"دکھ بھری بات تو یہ ہے کہ میرا اکلوتا بچہ بھی تعلیم سے متنفر ہو چکا ہے"۔ اس نے بتایا۔ "میں اس کی آوارگی نہیں روک سکا۔ اب تو وہ نشہ بھی کرنے لگا ہے۔ قدرت مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ میں پچھتاوؤں کے قلق سے تباہ ہو چکا ہوں"۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر وہ جذبوں میں بے قابو ہونے لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اب وہ پژمردہ نظر آتا تھا۔ لفظوں کی ادائیگی میں اسے دقت کا سامنا تھا۔

"اب تو یہ عالم ہے کہ اپنی موت کی آرزو کرتا ہوں"۔ وہ لحظہ بھر کے لئے رکا، پھر بولنے لگا۔ "مجھے بھی عارضۂ قلب کی شکایت ہو چکی ہے۔ علاج کی بساط نہیں رکھتا۔ والد کی طرح گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔ یہی مکافاتِ عمل ہے۔ ان مراحل سے گزر کر شاید والد کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گا"۔ وہ بُری طرح رونے لگا۔

"مجھے ترس بیوی پر آتا ہے، میری موت کے بعد اس غریب کو کون سنبھالے گا؟ انعامی رقم بھی کتنے ماہ چل جائے گی؟" وہ بدستور بلک رہا تھا۔ "آپ جیسے دوست عظیم ہیں جو تعلیم پا گئے تھے، آج بچوں کا عروج دیکھ رہے ہیں۔ مگر اپنی نسلیں مجھے فقط روبہ زوال دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے آگے صرف تاریکی نظر آتی ہے، گورستان کی تاریکی جس میں کھو کر میں بھی دھرتی میں بکھر جاؤں گا۔ پھر کچھ ایسا ہی انجام مجھ سے وابستہ نسلوں کا بھی ہوگا"۔

نصیب نے بات مکمل کی اور آنسو بہاتا ہوا راہوں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

▼○▼

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

رفیق ڈوگر

قسط 11

مغلانی بیگم

پنجاب سکھوں کی بڑھتی ہوئی شورش کی اطلاع پا کر احمد شاہ ابدالی نے حاکم ملتان مراد خاں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس شورش کو دبانے میں جہان خاں کی مدد کرے۔ بادشاہ کے حکم پر مراد خاں دس ہزار فوج کے ساتھ لاہور پہنچ گیا۔ حکام دوآبہ آدینہ بیگ نے تیمور شاہ کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا تھا اور ایک بار پھر شوالک کی پہاڑیوں میں جا چھپا تھا۔ تیمور شاہ نے ایک افغان سردار سرفراز خاں کو دوآبہ جالندھر کا ناظم مقرر کر دیا۔ جہان خان نے حاکم ملتان سے کہا کہ وہ سرفراز خان کی مدد کے لئے اس کے ساتھ جائے اور نظم کی بحالی میں مدد دے۔ افغان لشکر دریائے بیاس عبور کر کے جنوب مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا کہ آدینہ بیگ پہاڑیوں سے نکل کر سامنے آ گیا اس کے پاس پچیس ہزار فوج تھی اور سردار جسا سنگھ آہلووالیہ اور سوڈھی وڈبھاگ سنگھ کے علاوہ بہت سے دوسرے سکھ جتھے دار بھی اس کے ساتھ تھے۔ سرہند کے نائب ناظم راجہ بھوپ سنگھ بھی آدینہ بیگ کے ساتھ مل گئے۔

مغلانی بیگم کی دعائیں آدینہ بیگ کے ساتھ تھیں اور وہ اس معرکہ کے بارے میں خبروں کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔

مالی پور کے قریب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں تو آدینہ بیگ کے سرداروں اور سپاہیوں نے اپنی ٹوپیوں اور پگڑیوں میں گھاس کے گچھے باندھ رکھے تھے تا کہ سکھ اپنے حامی اور مخالف مسلمان فوج میں امتیاز کر سکیں۔ اس لڑائی میں مراد خاں کی فوج کو شکست ہوئی۔

سرفراز خاں بیگم کو افغانوں کی شکست کی اطلاع دے کر کمرے سے باہر آ رہا تھا تا کہ میاں خوش فہم کو اطلاع دے کہ بیگم عالیہ کی دعائیں قبول ہو گئی ہیں مگر وہ یہ خبر پھیلانا نہیں چاہتا تھا تا کہ جہان خان کو بیگم پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ میاں خوش فہم نے سنا تو مسکرا دیا۔

"آغا! ہمارے حق میں دعا کی بھی سفارش کر دو"۔

سید رحیم خاں اور مغلانی بیگم ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر دونوں آدینہ بیگ کی فتح پر خوش تھے۔ بیگم کے ملازمین میں شامل رحیم خاں کے مخبروں نے اسے بیگم کی خوشی سے مطلع کیا تو اسے مزید خوشی ہوئی اور اس نے اپنے مخبروں کو بیگم کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے اور ہوشیار رہنے کی ہدایت کی۔

مراد خاں کی پسپائی کے بعد سکھوں نے جالندھر شہر پر یلغار کر کے اسے برباد کر دیا۔ کرتار پور کے گوردوارہ میں جمع سکھوں کے خلاف کارروائی کرنے والے افغان سردار ناصر علی خاں کی قبر کھود کر اس کی لاش بازاروں میں گھسیٹتے پھرے، وہ تین دن تک شہر لوٹتے رہے اور پھر پورے دوآبہ میں پھیل کر لوگوں سے کڑھا پرشاد کے لئے خراج وصول کرنے لگے۔

جہان خان نے یہ خبر سنی تو خود فوج لے کر لاہور سے نکلا اور پسپا ہوتی افغان فوج کو بٹالہ میں جا لیا۔ اس نے مراد خاں کو لکڑی کے شکنجے پر کس کر کوڑے لگوائے، وہ اسے افغان فوج کی شکست کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔

جہان خان کی آمد کی خبر سن کر سکھ جنگلوں کی طرف بھاگ گئے اور آدینہ بیگ ایک بار پھر پہاڑوں میں جا چھپا۔ جہان خان سرفراز خان کو دوآبہ میں بحال کر کے واپس لاہور آ گیا۔ سکھوں اور آدینہ بیگ کے خلاف لڑائی میں مراد خاں کی شکست اور فرار کا اہم سبب افغان وزیر اعظم شاہ ولی خان اور جہان خان کے درمیان ذاتی رقابت تھی۔ مراد خاں شاہ ولی خان کا حامی تھا اور جہان خان کی برتری اور کامیابی سے خائف تھا اس لئے اس نے جنگ جیتنے کی بجائے فرار کی راہ اختیار کرنا مناسب جانا۔ جہان خان کے لئے یہ صورت حال تشویشناک تھی، وہ آدینہ بیگ کے خلاف فیصلہ کن اقدام سے پہلے تیمور شاہ کو اندرونی سازشوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

****

کوہ شوالک کے دامن میں میلوں تک افغان فوجیں خیمہ زن تھیں اور لشکرگاہ کے باہر سے پہریداروں کے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں رات کی خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔ افغان فوج کے کماندار خواجہ مرزا خان کے خیمہ کے سامنے اونچے بانس سے لٹکی شمع کے سایہ میں اس کے مشیروں اور سرداروں کے خیمے قطار در قطار دور تک چلے گئے تھے۔ خیموں کی قطاروں کے درمیان چاک و چوبند سنتری پہرہ دے رہے تھے۔ ملک قاسم، ملک سجاول کے خیمے کے سامنے پہنچا تو سنتری نے اسے رکنے کا اشارہ دیا اور شناخت اور مقصد معلوم کر کے اپنے ساتھی کو اطلاع کرنے بھیج دیا۔ ملک قاسم کو اپنے دستہ کے سپاہی کی ہوشیاری اور فرض شناسی پر بہت خوشی ہوئی۔ ملک سجاول خیمے سے برآمد ہوا تو قاسم گھوڑے سے اتر آیا، ہاتھ ملا کر وہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور خیمہ کے اندر چلے گئے۔

"حضور کو بے وقت زحمت دینے کے لئے معذرت خواہ ہوں مگر اطلاع دینا لازم تھا"۔ ملک قاسم نے تکیہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"سرفراز خان نے آج افغان کماندار خواجہ مرزا خان سے طویل ملاقات کی"۔ ملک قاسم نے اس کے قریب ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"کون سرفراز خاں، ناظم دوآبہ؟" ملک سجاول نے پوچھا۔

"نہیں ناظم دوآبہ سرفراز خان نہیں، مغلانی بیگم کے معتمد خاص سرفراز خاں نے"۔ اس نے جواب دیا۔

"وہ تو لشکر کے ساتھ نہیں تھا؟" ملک سجاول نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"وہ آج ہی لاہور سے بیگم عالیہ کا کوئی پیغام لے کر پہنچا تھا"۔ قاسم نے بتایا۔

"واپس لاہور چلا گیا ہے؟" ملک سجاول کے چہرے پر بھی تشویش نمودار ہوئی۔

"اس کی آمد کی خبر سننے پر میں نے خبر رسانوں کو ہوشیار کر دیا تھا، انہوں نے بتایا ہے کہ سرفراز خان افغان لشکر سے نکل کر آدینہ بیگ کے لشکر کی طرف گیا تھا"۔

"ہم مخبروں کی اطلاع کی صداقت پر یہاں تک یقین کر سکتے ہیں؟" ملک سجاول کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

"جتنا آپ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین کر سکتے ہیں، اس اطلاع پر بھی اتنا ہی یقین کیا جانا چاہئے"۔

"ہم ہر بات پر یقین کرنے کے خلاف ہیں لیکن آپ کی اطلاع پر یقین کرنا ہماری مجبوری ہے"۔ ملک سجاول نے قاسم کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"سردار! مجھے افسوس ہے کہ میری اطلاع سے آپ کو دکھ ہوا مگر آپ کو آگاہ کرنا میری مجبوری تھی"۔

"دکھوں اور مجبوریوں کی ساتھ میں افسوس کیسا؟" ملک سجاول نے جواب دیا اور ماضی کے ان واقعات اور حادثات کا جائزہ لینے لگا جن کے وہ دونوں حصہ دار رہے تھے۔ میر منو کی اچانک وفات، بھکاری خاں کی بغاوت میں خواجہ مرزا خان کا ان کا ساتھ دینا اور پھر بیگم سے عہدہ قبول کر کے بھکاری خان کو قید میں ڈالنا، بھکاری خاں کی ترغیب پر بیگم کو اقتدار سے الگ کر کے پنجاب کی حکمرانی پر قبضہ کرنا جہان خان کا اسے گرفتار کر کے قندھار ساتھ لے جانا اور پھر اسی خواجہ مرزا خان کو افغان فوجوں کا کماندار مقرر کر کے آدینہ بیگ کے خلاف مہم پر بھیجنا انہوں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کسی بھی بات پر یقین کرنے کے لئے تیار تھے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد میں ہر ناممکن کو ممکن ماننے اور دیکھنے پر آمادہ

ہوں"۔

"سردار کی فراست اور صداقت پر یقین رکھنے والے اس کے ہر فیصلے پر خوشی محسوس کرتے ہیں، ہر استفسار کو اظہار اعتماد سمجھتے ہیں"۔ قاسم نے سر جھکا دیا۔

"ملک قاسم! میں ہندوستان میں مسلم سلطنت کا سورج غروب ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ مسلم حکمران اور امراء میں انتشار اور ان کے ذاتی مفادات کی جنگ دیکھ کر ان سے کسی ایثار اور قربانی کی امید نہیں کی جا سکتی اور اتحاد اور ایثار و قربانی کے بغیر یہ سلطنت باقی نہیں رہ سکتی"۔ اس نے لمبی آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

"سردار! آپ تو ہمیں ہر قسم کے حالات میں امید کا دامن تھامے رکھنے کا درس دیا کرتے ہیں؟" ملک قاسم نے انہیں مایوس دیکھ کر کہا۔

"ملک قاسم! انسان کی زندگی دنیا کی ہر چیز سے ناپائیدار ہے۔ ممکن ہے میں کل آپ میں نہ ہوں لیکن جو کچھ مجھے دکھائی دے رہا ہے آپ کو اس سے آگاہ کرنا مجھ پر لازم ہے۔ وزیراعظم ہندوستان نے ایک بار پھر مرہٹوں کو مدد کے لئے بلا لیا ہے اور نجیب الدولہ کو شاہجہان آباد کے بعد سہارنپور سے بھی نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دربار مغلیہ کے امراء ذاتی مفادات اور مصلحتوں کا شکار ہیں۔ علماء کفر کے بڑھتے ہوئے طوفان کے آگے وعظ و نصیحت سے بند نہیں باندھ سکتے۔ آپ جانتے ہیں مرہٹے شاہجہان آباد کی جامع مسجد کے منبر پر بت رکھنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان حاکم ذاتی اقتدار کی سازشوں میں مصروف ہیں اور عام مسلمان کسی نجات دہندہ کے منتظر ہیں۔ میں علمائے شاہجہان آباد کی درخواست لے کر بادشاہ قندھار کی خدمت میں پیش ہوا تھا مگر شاہ ولی خاں کی جہان خان سے رقابت کی وجہ سے ابدالی کوئی فیصلہ نہ کر پائے اور تیمور شاہ کے نام مراسلہ سے آگے کچھ نہ کر سکے۔ جہان خان تو سکھوں کی شورش نہیں دبا سکا، وہ مرہٹوں کے سیلاب کو کیسے روک سکے گا۔ پنجاب میں آدینہ بیگ اگر سکھوں کو مسلم حکومت کے خلاف مسلح کر سکتا ہے تو ذاتی اقتدار کی خاطر مرہٹوں سے بھی تعاون کرے گا۔ مجھے اس میں کچھ شبہ نہیں"۔ ملک سجاول نے اسے اپنی مایوسی کے اسباب سمجھانے کی کوشش کی۔

"سردار! اگر افغانوں نے آدینہ بیگ کو شکست دے دی تو حالات بہتر نہ ہوں گے؟" ملک قاسم نے پوچھا۔

"ملک قاسم! ایک بات یاد رکھیں۔ سکھ اور مرہٹے اپنے دین کے لئے لڑ رہے ہیں اور مسلمان حاکم اپنے ذاتی اقتدار کے لئے۔ مادی مفادات کے لئے لڑنے والے دینی جذبہ کو کبھی بھی شکست نہیں دے سکتے۔ تاریخ نے انسانوں اور حکمرانوں کو یہی سبق دیا ہے۔ سکھ آدینہ بیگ کے دوست نہیں اس کے بھی دشمن ہیں، وہ اسے اقتدار میں لانے کے لئے نہیں اپنی حکومت کے لئے قربانیاں دے رہے ہیں۔ آدینہ بیگ جو کھیل کھیل رہا ہے اس میں آخر اسی کی ہار ہوگی"۔

"سردار! ہم نے ہمیشہ مغلانی بیگم کا ساتھ دیا، اب جب وہ....."

ملک سجاول نے قاسم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مغلانی بیگم کا ساتھ دینا ہمارا اخلاقی فرض تھا، ہماری روایات کی مجبوری تھی لیکن جب لڑائی میں دین اور دنیا میں انتخاب کرنا پڑے تو میں کبھی تمہیں دنیا کا ساتھ دینے کو نہیں کہوں گا"۔

ملک قاسم اپنے سردار کے خیمے سے نکلا تو پہریدار نے اسے جھک کر سلام کیا لیکن اس کے دل و دماغ ایک طوفان کی زد میں تھے، وہ اس کے سلام کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ نیلے آسمان پر ستاروں کے لشکر رواں تھے، وہ رک کر ان میں کچھ تلاش کرنے کی بجائے اپنے

دل اور دماغ کے طوفان میں راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

***

خواجہ مرزا خان نے لشکر پھیلا کر آدینہ بیگ کے فرار کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ آدینہ بیگ کے لئے اب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا مگر افغان فوج کا مقابلہ کرنے کی اس میں طاقت نہیں تھی۔ کوئی سکھ جتھے دار بھی اس کی مدد کو نہیں آ سکتا تھا۔ اس کا خاندان، خزانہ سب کچھ اس کے ساتھ ان پہاڑی وادیوں میں مقید ہو چکے تھے اور خواجہ مرزا خان کے ساتھ آئے سید رحیم خاں نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ اس بار افغان اس کی مصالحت کی کوئی درخواست قبول نہیں کریں گے۔ جہان خان نے اس کا فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ افغانوں کے محاصرہ میں مغلانی بیگم کا پیغام ملنے کے بعد اس نے نئی لائنوں پر سوچنا شروع کر دیا اور صدیق خاں کی قیادت میں اپنے جہاندیدہ مشیروں کا ایک وفد خواجہ مرزا خان کے پاس بھیجا اور خواجہ مرزا خاں کے لئے عمدہ نسل کا ایک گھوڑا، ہیرے جواہر سے مزین پیش قبض اور موتیوں کا ست لڑی کا ہار تحفہ میں بھیجے۔

نوآموز ازبک نوجوان خواجہ مرزا خان ان بیش قیمت تحائف سے بہت مرعوب ہوا اور آدینہ بیگ کی دولت کے بارے میں سوچنے لگا۔

صدیق خاں نے خواجہ مرزا خان کی ذہنی حالت کا اندازہ کر کے سید رحیم خاں کی طرف دیکھا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آدینہ بیگ کے وفد کی واپسی کے بعد سید رحیم خاں بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔

اگلے روز خواجہ مرزا خان سید رحیم خان اور اپنے فوجی سرداروں کے ہمراہ آدینہ بیگ سے ملاقات کے لئے روانہ ہوئے۔ کسی ہنگامی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کی فوج کے دستے کچھ فاصلہ پر پیچھے چلے آ رہے تھے۔ لشکر گاہ سے پانچ کوس دور پہنچے تو سامنے آدینہ بیگ اپنے امراء اور ذاتی محافظ دستے کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ سامان سے لدے چھکڑوں کا ایک قافلہ تھا اور سنہری وردیوں میں ملبوس کہار ایک مخملیں پردوں والی پالکی اٹھائے چلے آتے تھے جس کے آگے پیچھے گھوڑسوار دستے تھے۔ خواجہ مرزا خان وہیں رک گیا، آدینہ بیگ کی سواری قریب پہنچی تو اس نے گھوڑے سے اتر کر ان کا استقبال کیا۔ سید رحیم خان ان کے پہلو میں چل رہے تھے، آدینہ بیگ نہایت شفقت اور گرم جوشی سے خواجہ مرزا خاں سے بغلگیر ہوا۔

"ہم اپنے فرزند عزیز کے استقبال پر دلی مسرت محسوس کرتے ہیں"۔ آدینہ بیگ نے خواجہ مرزا خان کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"حضور کا غلام اس شفقت اور سرپرستی کے لئے مشکور ہے اور تاحیات شکرگزار رہے گا"۔ خواجہ مرزا خان نے جھک کر آدینہ بیگ کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

اس کے ساتھیوں اور سواروں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

آدینہ بیگ کے خدام نے چھکڑوں سے قالین اتار کر جلدی سے فرش بچھا کر اس پر ریشمی گاؤ تکیے چن دیئے۔ آدینہ بیگ کے بائیں طرف خواجہ مرزا خان اور دائیں طرف سید رحیم خاں بیٹھے تھے۔

بائیں طرف ایک وسیع خیمہ کھڑا کر دیا گیا، کہار پالکی اٹھا کر اس خیمے کے اندر لے گئے۔ قہوہ کا دور ختم ہوا تو آدینہ بیگ خیمے کے اندر گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بیش قیمت ہیروں کی مالا تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا خواجہ مرزا خان کی نشست کے سامنے پہنچا اور جھک کر ہیروں کی مالا خواجہ مرزا خان کے گلے میں ڈال دی۔ "ہم تشکر اور مسرت کے ساتھ اپنی دختر نیک اختر کا خواجہ مرزا خان کے ساتھ نکاح پڑھانے کی

اجازت دیتے ہیں"۔

خواجہ مرزا خان نے کھڑے ہو کر اس عزت فرمائی کے لئے آدینہ بیگ کا شکریہ ادا کیا۔

سید رحیم خان میدان جنگ میں ایک کماندار کی صاحبزادی کا دوسرے کماندار سے نکاح پڑھانے کی رسم مکمل کر چکے تو حیران فوجی سردار دونوں کمانداروں کو مبارک باد دینے لگے۔ آدینہ بیگ خواجہ مرزا خان کو خیمے کے اندر لے گیا، واپس آ کر اس نے خواجہ مرزا خان کے ساتھیوں میں بیش قیمت تحائف تقسیم کروائے۔

خواجہ مرزا خان اپنی دلہن کی ڈولی اور جہیز سے لدے چھکڑوں اور گھوڑوں کے قافلے کے ساتھ اپنے لشکر میں واپس پہنچے تو پیچھے رہ جانے والے سردار اور سوار مبارکباد دینے والوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

اگلے روز افغان لشکر کو کماندار کے ولیمہ کی شاندار دعوت دی گئی اور آدینہ بیگ کے خزانہ سے اس کے ہر لشکری کو ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر زر نقد ادا کیا گیا۔ افغان لشکر جو آدینہ بیگ کے فتنہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے آیا تھا، اس کے ہر خیمہ میں آدینہ بیگ کی دولت اور سخاوت کے چرچے ہونے لگے تھے۔

آدینہ بیگ نے بیٹی اور زر و جواہر کے عوض افغان لشکر اور اس کا کماندار خرید لئے اور میدان جنگ میں اترے بغیر جہان خان کی مہم اور ارادوں کو ناکام بنا دیا۔ مغلانی بیگم نے خواجہ مرزا خان کے بارے میں اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں اسے لکھا تھا کہ وہ اس کی دولت اور اقتدار کی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر کے اس سے کوئی بھی کام لے سکتا ہے۔ آدینہ بیگ نے اپنی بیٹی کا رشتہ پیش کر کے اسے افغان فوجوں سمیت جیت لیا۔ آدینہ بیگ کی دولت اور اقتدار کا اس کے سوا اور کون مالک ہوگا؟ خواجہ مرزا خان نے سید رحیم خان کی دلیل پر دل و جان سے یقین کر لیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی سے وفاداری اور جہان خان کی نوکری میں اسے کبھی اتنی دولت نہیں مل سکتی تھی اور نہ اقتدار ملنے کی امید تھی۔ افغان کماندار اور لشکر آدینہ بیگ کے ساتھ مل گئے تو سسر اور داماد دونوں نے کوہ شوالک کی پہاڑیوں میں مقیم رہ کر جہان خان اور احمد شاہ ابدالی کے ردعمل کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

خواجہ مرزا خان نے کوہ شوالک کی وادیوں میں مقیم اپنی لشکر گاہ سے فرار کے تمام راستوں پر محافظ دستے متعین کر دیے اور اپنے مخبروں کو افغان لشکر کے ایسے سرداروں اور سواروں پر نگاہ رکھنے پر لگا دیا جو آدینہ بیگ کی اس فتح پر ناخوش تھے اور جن کے فرار کا خدشہ ہو سکتا تھا۔ سید رحیم خان اور خواجہ مرزا خان دونوں کو احساس تھا کہ ملک سجاول اس ایجاب و قبول پر رنجیدہ ہیں۔ ملک خود یا اس کے دستہ کا کوئی رکن خواجہ مرزا خان کو شادی پر مبارکباد دینے نہیں گیا تھا۔ خواجہ مرزا خان نے ان کے ڈیرے کے گرد آدینہ بیگ کے سکھ دستے متعین کر دیئے۔ ملک سجاول کے نوجوان ساتھیوں نے سکھوں کے خیموں کی طنابیں کاٹ دیں تو دونوں طرف سے تلواریں ٹکرائیں۔ قریبی ڈیرے سے بہت سے افغان بھی سکھوں پر ٹوٹ پڑے، سکھ اپنے خیمے اور سامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ملک سجاول اپنے دستہ کے ساتھ کیمپ سے روانہ ہوئے تو کسی نے ان کا راستہ نہیں روکا۔

افغان لشکر کے بعض سردار اور امراء بھی ملک سجاول کے ہمراہ ہی روانہ ہو گئے۔

****

مغلانی بیگم اپنی حویلی کے دیوان خاص میں گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ کوئلہ تڑخنے کی آواز آئی تو اس نے گردن گھما کر آتشدان کی طرف دیکھا کوئلوں کے جلنے سے اٹھنے والے شعلے جیسے جیسے بلند ہوتے ان کا رنگ

بدل جاتا تھا۔ سرخ، سنہری، سفیدی مائل اور پھر سفید" اس کے بعد تو کچھ بھی نہیں" اس نے سفید شعلے کو خلاء میں معدوم ہوتے دیکھ کر اپنے آپ کو بتایا اور کہیں گم ہو گئی۔ سرخ رنگت، سنہری زلفیں اور اب ان میں چاندی کے تاروں کی ملاوٹ کچھ سوچ کر اس نے پیش پردہ سے کنیز کو طلب کر کے آئینہ لانے کا حکم دیا اور قلم صاف کر کے واپس قلمدان میں رکھ دیا۔

باہر شدید بارش ہو رہی تھی، ابھی ابھی ملہاس خان سے بتا کر گیا تھا کہ شب رفتہ سکھ موضع مزنگ میں گھس آئے تھے اور لوگوں کو لوٹ لے گئے ہیں۔ خواجہ مرزا خان کے آدینہ بیگ کے ساتھ مل جانے کے بعد سکھوں نے پنجاب اور نواح لاہور میں پھر سے سرگرمیاں تیز کر دیں اور نظم حکومت درہم برہم ہو گیا ہے۔ مغلانی بیگم کو اس اطلاع پر بہت خوشی ہوئی۔ آدینہ بیگ کے نام مراسلہ مکمل کر کے وہ اس پر مہر لگا رہی تھی کہ آتشدان میں کوئلوں نے کڑک کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

کنیز نے جھک کر آئینہ بیگم کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے جا چکنے کے بعد وہ آئینہ اٹھا کر شمع دان کے سامنے سر جھکا کر اپنے بالوں میں چاندی شمار کرنے لگی تو اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ مرجھا گئی۔ اس نے آئینہ رکھ دیا اور پھر سے مراسلہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ مراسلہ لفافے میں بند کر کے اس پر مہریں ثبت کیں اور پھر سے شعلوں کو سرخ سے سفید اور پھر معدوم ہوتا دیکھنے لگی۔

شدید سردی، بارش اور سرخ شعلوں کا سفید ہو کر فضا میں تحلیل ہو جانا اس کی تھکاوٹ بڑھا گئی۔ میاں خوش فہم نے سرفراز خاں کی آمد کی اطلاع دی تو اس نے جلدی سے آئینہ اٹھا کر گاؤ تکیہ کے پیچھے چھپا دیا۔ "اسے خبر دیں کہ ہم منتظر ہیں۔"

"غلام معافی کا خواستگار ہے۔ بارش اور سردی کی شدت سے انتظام میں تاخیر ہو گئی"۔ سرفراز خاں نے آداب عرض کر کے تاخیر سے آنے کی وجہ بتائی۔

"سردی اور بارش سے خوفزدہ افراد کبھی سفارت اور تجارت میں کامیاب نہیں ہوتے"۔ بیگم کے طرز جواب میں ناراضگی تھی۔

سرفراز خاں نے بیگم کی ناراضی کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس موسم میں کوئی تجارتی قافلہ بٹالہ اور ہوشیار پور کی طرف جانے پر آمادہ نہیں"۔

"تمہارے اپنے گھوڑے تمہارے ساتھ جانے پر آمادہ ہیں یا نہیں؟" بیگم نے پوچھا۔

"یہ غلام تو حضور کے حکم کا منتظر ہے"۔ سرفراز خاں نے عرض کیا۔

"یہ مراسلہ جلد از جلد آدینہ بیگ کے حضور پہنچنا چاہئے"۔ بیگم نے مہر شدہ لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "ہم قافلے کا انتظار نہیں کر سکتے، گھوڑے تیار کریں اور کل صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے اپنے دستہ کے ساتھ روانہ ہو جائیں"۔

سرفراز خاں نے سر جھکا کر مراسلہ وصول کر لیا۔

"ہم نے راستہ کے سکھ جتھے داروں کے نام الگ مراسلے لکھ دیئے"۔ بیگم نے دوسرا لفافہ اس کو تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ زاد سفر اور تمہارے ساتھیوں کا انعام ہے"۔ اس نے اشرفیوں کی تھیلی بھی اس کی طرف بڑھا دی۔

سرفراز خاں نے تھیلی پکڑ کر فرشی سلام کیا۔ "آدینہ بیگ کے مخبروں نے بتایا ہے کہ وہ سرہند کے سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ ہمارے شوالک کی پہاڑیوں تک پہنچنے سے پہلے وہ روانہ ہو چکے تو ہمیں سرہند جانا ہوگا"۔

بیگم نے تھوڑی دیر کے لئے کچھ سوچا۔ "ہم پٹیالہ کے حاکم سردار آلا سنگھ اور ان کے فوجدار سردار لکھنا کے نام بھی مراسلے تیار کئے دیتے ہیں، ضرورت پڑی تو وہ تمہاری مدد کریں گے۔ آج شام میاں خوش فہم سے

مراسلے وصول کرلیں"۔

"تیمور شاہ کے دربار میں خبریں پہنچی ہے کہ آدینہ بیگ کی افواج کے علاوہ شاہجہان آباد میں مقیم مرہٹہ افواج بھی سرہند کی طرف روانہ ہونے والی ہیں اور پنجاب کے سکھ جتھے دار بھی ان کے ساتھ مل کر سرہند کے افغان حاکم کے خلاف لڑنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں"۔ سرفراز خاں نے بتایا۔

مغلانی بیگم نے اس اطلاع پر داد دینے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔"اس اطلاع پر جہان خان خاموش نہیں ہوگا؟"

"جہان خان نے فوج کو تیاری کا حکم دے دیا ہے اور ملک سجاول کو سردار لکھنا کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ آلا سنگھ کو سرہند کے محاصرہ میں شامل ہونے سے باز رکھ سکے۔ تیمور شاہ نے اس کے نام مراسلہ بھی بھیجا ہے"۔

"جہان خان جلد روانہ نہیں ہو سکے گا، ہم چاہتے ہیں اس کے روانہ ہونے سے پہلے ہمارا یہ مراسلہ آدینہ بیگ تک پہنچ جائے۔ باقی حالات تم انہیں زبانی بتا سکتے ہو"۔ بیگم نے سرفراز خاں کو حکم دیا۔

***

نجیب الدولہ کو شاہجہان آباد اور سہارنپور سے نکالنے کے بعد مرہٹہ سالار رگھوناتھ راؤ سرہند پر فوج کشی کا ارادہ رکھتا تھا لیکن لاہور سے خواجہ مرزا خان کی روانگی اور ناظم سرہند کی تیاریوں کی خبر سن کر اس نے ارادہ بدل لیا تھا۔ خواجہ مرزا خاں کو دامادی میں لینے کے بعد آدینہ بیگ نے ہرلال کو سفیر بنا کر مرہٹوں کے پاس بھیجا اور پیشکش کی کہ اگر مرہٹے افغانوں کو پنجاب سے نکالنے میں اس کی مدد کریں تو وہ مرہٹہ فوج کے سفر کے دنوں میں انہیں ایک لاکھ روپیہ روزانہ اور قیام کے دنوں میں پچاس ہزار روپے روزانہ ادا کرے گا۔ مرہٹوں کے خوابوں کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ افغان تھے، وہ فوراً تیار ہو گئے۔ آدینہ بیگ نے سکھوں کو بھی ساتھ ملالیا اور ان کا یہ مطالبہ منظور کرلیا کہ فتح کے بعد سب سے پہلے سکھ سرہند میں داخل ہو کر لوٹ مار قتل و غارت اور جو چاہیں کریں گے، آدینہ بیگ اور مرہٹے ان کے بعد شہر میں داخل ہوں گے۔ اس معاہدہ کے بعد تینوں کی فوجیں سرہند کی طرف روانہ ہو گئیں۔ سرہند کے افغان ناظم کو خبر ملی تو اس نے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور لاہور ایلچی دوڑا دیا۔

ماگھ کی وہ ساری رات بارش ہوتی رہی، مسجدوں میں صبح کی اذان کی آواز بلند ہوئی تو سرفراز خاں اپنے آٹھ سواروں کے ساتھ حویلی سے نکلا اور شالا مار باغ کا راستہ چھوڑ کر راوی کی طرف گھوڑے موڑ دیئے۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے راوی کے بیلے کے ساتھ ساتھ ہو کر شہر سے دور نکل جانا چاہتے تھے تاکہ اگر کوئی افغان دستہ شہر سے باہر گشت پر ہو تو اس سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ بیگم پورہ کی حدود پار کر کے وہ محمود بوٹی کی راہ پر مڑے ہی تھے کہ ایک افغان دستہ نے انہیں للکارا اور رک جانے کا حکم دیا۔ سرفراز خاں نے دریا کے بیلے کی طرف گھوڑا دوڑا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ بیلے میں پہنچ جانے کے بعد افغان انہیں ڈھونڈ نہیں سکیں گے لیکن افغانوں کے گھوڑے ان کے گھوڑوں سے زیادہ تیز نکلے، بیلے میں داخل ہونے سے پہلے ہی انہوں نے آٹھوں سواروں کو جالیا۔ سرفراز خاں اور اس کے ساتھیوں نے افغان سواروں کے مقابلہ کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ لڑائی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

افغان دستہ کے کماندار نے ان سب کی تلاشی لی اور ان کے بازو ان کی پشتوں پر باندھ کر قلعہ ساتھ لے آیا۔

ایک پہر دن گئے جہان خان قلعہ پہنچا تو اسے آٹھ سواروں کی گرفتاری کی اطلاع دی گئی۔ اس نے فوری طور

پر انہیں پیش کرنے کا حکم دیا۔ گشتی دستہ کے کمانڈار نے سرفراز خان سے برآمد ہونے والے لفافہ پر مہریں دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کسی اہم مشن پر جا رہے تھے مگر لفافہ نہیں کھولا تھا۔ اس نے مہر شبت لفافے جہان خاں کو پیش کر دیئے۔ جہان خاں نے لفافے وصول کر کے انہیں کھولنے کو کہا اور خود قیدیوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

''ہم نے تمہیں کہیں دیکھا ہے''۔ اس نے سرفراز خاں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

''حضور! یہ مغلانی بیگم کا پیامبر خاص اور ان سواروں کا سردار ہے''۔ گشتی دستہ کے کمانڈار نے بتایا۔

''تب تو ہم ایک بہت اہم شخصیت سے مخاطب ہیں''۔ اس نے کمانڈار کو شاباش دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ ان کے شایان شان سلوک کیا جائے''۔

ناظم قلعہ نے تمام مراسلے ایک طشتری میں رکھ کر جہان خاں کو پیش کر دیئے۔

مغلانی بیگم نے آدینہ بیگ کو لاہور پر جلد حملہ کی ترغیب دی تھی۔ اس نے احمد شاہ ابدالی کی مجبوریوں کا ذکر کر کے لکھا تھا کہ ابدالی تیمور شاہ کی مدد کے لئے نہیں آ سکے گا۔ لاہور میں جہان خاں کے پاس صرف دو ہزار کے قریب افغان فوج رہ گئی ہے۔ شہر کے امراء سے اس کا اپنا رابطہ ہے، وہ جہان خاں کا ساتھ نہیں دیں گے۔ شہر کی ہندو اور سکھ آبادی افغانوں کے خلاف ہے اس لئے آدینہ بیگ کو حملہ میں تاخیر نہیں کرنا چاہئے۔

مراسلہ پڑھ کر جہان خاں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

سرفراز خاں کو لکڑی کے شکنجہ میں کس کر بید لگائے گئے تو اس نے بیگم اور آدینہ بیگ کے روابط کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

جہان خان نے حکم دیا کہ سرفراز خاں اور اس کے ساتھیوں کو شاہ برج کے تہہ خانہ میں قید کر دیا جائے اور آدینہ بیگ اور سکھوں کے نام بیگم کے مراسلے شہر کی مساجد میں نمازیوں کو پڑھ کر سنائے جائیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اہل لاہور بیگم کی سازشوں اور سکھوں سے روابط سے آگاہ ہو جائیں۔

شام تک سکھوں اور آدینہ بیگ کے ساتھ بیگم کی سازش کی خبر سارے شہر میں پھیل چکی تھی اور بیگم کی حویلی سے اس کے بہت سے ملازم بھاگ گئے تھے۔ چند کنیزیں اور میاں خوش فہم ہی اس کے ساتھ رہ گئے تھے۔

جہان خاں نے بیگم کو قید میں ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا تو تیمور شاہ نے منع کر دیا۔ ''سانپ کو پکڑنے کی بجائے اس کے بل کا بند کر دینا زیادہ مناسب ہوگا''۔ اسے خوف تھا کہ اس کا والد بیگم سے اس سلوک پر ناراض ہوگا۔

شہر کے علماء اور مسلمانوں کو بیگم کے اس خط سے افسوس ہوا، وہ سکھوں کے مظالم کے تصور سے ہی کانپ اٹھتے تھے۔ اس کے بعد مغلانی بیگم کے ہمدرد بھی غیر جانبدار ہو گئے۔

جہان خاں نے فوجی تیاریاں تیز کر دیں۔ وہ جلد از جلد سرہند پہنچنا چاہتا تھا مگر اس کے پاس باقاعدہ افغان اور ازبک فوج بہت کم رہ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر عام لشکر بندی کا اعلان کر دیا اور طہماس خاں کو حکم دیا کہ وہ بیگم کے ان پچیس گھوڑ سواروں کے ساتھ لشکر گاہ میں حاضر ہو جائے جو سکھوں کے خلاف مہموں میں شامل ہوتے رہے ہیں۔

طہماس خاں نے بہانہ بنایا کہ بیگم کے سب ملازمین گھوڑوں سمیت فرار ہو گئے ہیں اور وہ پچیس سوار اور گھوڑے فراہم نہیں کر سکتا۔

''کل شام تک پچیس سوار لشکر گاہ میں نہ پہنچے تو تمہیں شکنجے میں کس دیا جائے گا''۔ جہان خاں نے غصہ سے کہا۔

اسے شبہ تھا کہ بیگم نے اپنے گھوڑے اور سوار خود کہیں چھپا دیئے ہیں۔ اگلی شام جب بیگم کے پچیس گھوڑ سوار لشکر گاہ پہنچ گئے تو اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ سرہند روانہ ہونے سے پہلے اس نے بیگم کو شاہ برج میں قید کر دیا تا کہ افغان فوج کی عدم موجودگی میں وہ کوئی نیا فتنہ بپا نہ کر دے۔ اس بار تیمور شاہ خاموش رہا۔

***

گنا بیگم کو لاہور میں آئے تیرہ ماہ ہو رہے تھے اور وہ شاہجہان آباد کی یادیں دل سے نکالنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ لاہور میں شاندار حویلی ٹھاٹھ کی پُرآسائش زندگی خدام اور کنیزیں سب کچھ میسر تھا لیکن وزیراعظم ہندوستان کے گھر میں گزارے دن اور علم و ادب کی مجلسوں کے نقوش دل کے آئینے سے بالکل دھو ڈالنا اس کے لئے بہت مشکل تھا وہ لاہور کی بجائے زیادہ دن ملک پور میں گزارتی تھی اور دیہاتی زندگی کے آداب اور گھوڑ سواری سیکھ رہی تھی۔ وہ سواروں کا دستہ لے کر جنگل میں نکل جاتی اور سیر میں مصروف رہتی تھی۔ ملک قاسم جہان خان کے لشکر کے ساتھ سرہند روانہ ہو گئے تو وہ گاؤں چلی گئی۔

ایک صبح وہ سواروں کے دستے کے ہمراہ بیلے کی طرف بہت دور نکل گئی، بیلے میں ہتھیار بند سواروں کا دستہ دیکھ کر اس کے خدام گھبرا گئے۔ بیلے میں کبھی کبھی دن کے وقت بھی سکھ سوار گھومتے مل جاتے تھے۔ گنا بیگم نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اور خطرے کا جائزہ لینے لگی۔ سوار بہت قریب آ گئے تھے، اس نے اپنے ساتھیوں کو کسی خطرہ کا مقابلہ کرنے اور بگل بجا کر گاؤں میں خطرے کا پیغام دینے کے لئے تیار رہنے کا اشارہ دیا اور اپنے گھوڑے کا رخ موڑ لیا۔ سواروں نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اور ان کی طرف چلے آ رہے تھے۔ بگل بردار نے بگل میں پھونک ماری تو اس کے ساتھیوں نے گولیاں داغ کر سواروں کو رک جانے کا اشارہ دیا۔ وہ جہاں تھے وہیں رک گئے مگر وہ ایک دوسرے سے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ بیلے میں موجود مسلح سواروں نے اندازہ کیا کہ جن سواروں کو وہ سکھوں کا پیش دستہ سمجھ رہے تھے ان کی کماندار ایک نقاب پوش خاتون ہے۔ گنا بیگم بھی پہچان گئی کہ گھوڑ سوار افغان فوجی ہیں وہ اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ "سردار جہان خان کے پیش دستے کے کماندار جاننا چاہتے ہیں کہ محترم خاتون کون ہیں اور کیا انہیں ہماری کسی مدد کی ضرورت ہے؟" ایک افغان سوار نے بلند آواز میں پوچھا۔

گنا بیگم کے خدام افغان سوار کی فارسی سمجھ نہ سکے۔

گنا بیگم نے اپنا گھوڑا افغان سواروں کی سمت موڑ دیا اس کے خدام بھی اس کے آگے پیچھے ان کی سمت چلنے لگے۔ افغان سوار وہیں کھڑے رہے۔ گنا بیگم نے آواز کے فاصلہ پر گھوڑا روک کر کہا۔ "ہم آپ کے تعاون کے مشکور ہیں۔ اپنے کماندار کو آگاہ کر دیں کہ ہمیں ان کی مدد کی ضرورت نہیں"۔

افغان سوار جنگل میں ایک فارسی بولنے والی خاتون کو گھومتا دیکھ کر حیران ہوئے۔ "ہم محترم خاتون سے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور کہاں جانا چاہتی ہیں؟" دستے کے کماندار نے آگے آ کر پوچھا۔ "تاکہ ہم انہیں وہاں پہنچا سکیں"۔

"اگر کماندار ملک قاسم کو جانتا ہے تو ہمیں اسے مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں اور اگر نہیں جانتا تو ہم اسے اتنا بتا سکتے ہیں کہ ملک قاسم سرہند جانے سے پہلے ہمیں اپنے گاؤں چھوڑ گئے تھے"۔ گنا بیگم نے جواب دیا۔

افغان دستے کے کماندار نے انہیں سلام کیا اور بتایا کہ سردار جہان خان اپنے محافظ دستے کے ساتھ پیچھے آ رہے ہیں اور انہیں راستہ کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے

آگے بھیجا ہے۔

وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ گاؤں کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ نقارہ کی آواز پر جوان اور بوڑھے گاؤں میں جو کوئی بھی تھا، دوڑا آ رہا تھا اور اپنی آمد کی اطلاع کے لئے فائرنگ کر رہے تھے۔ افغان دستہ کا کماندار پریشان ہو گیا، اسے معلوم تھا کہ لوگ گنا بیگم کی مدد کے لئے آ رہے ہیں۔ وہ ان پر فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ گنا بیگم نے اپنے خدام کو بانس پر سفید کپڑا لہرانے اور سب خیریت ہے کے پیغام کا بگل بجانے کا حکم دیا اور افغان کماندار کو اپنے سواروں سمیت جنگل میں اوجھل ہو جانے کا اشارہ کیا۔

پیش دستہ پر فائرنگ کی آواز پر جہان خان کے محافظ دستہ کے بندوقچی بھی اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے فائرنگ کرتے دوڑ پڑے۔ گنا بیگم نے اپنے خدام کو درختوں کی اوٹ میں چھپ جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں کھڑی رہی۔

سب خیریت کا بگل سن کر دیہاتیوں نے فائرنگ بند کر دی تھی مگر افغان سوار مسلسل بندوقیں داغتے رہے تھے اور جنگل میں ہر طرف پھیل گئے تھے۔ گنا بیگم نے گاؤں سے آنے والے سوار پیادہ ایک جگہ جمع کئے اور انہیں غلط فہمی کے بارے میں بتایا۔

پیش دستہ کے کماندار نے اپنے ساتھیوں کو فارسی زبان میں بلند آواز میں امن امن پکارنے اور چاروں سمت پھیل جانے کا حکم دیا۔

جنگل میں امن بحال ہو چکا تو جہان خاں کو آگاہ کرنے کے لئے سوار دوڑا دیئے گئے۔

تھوڑی دیر میں جہان خان اور ان کے سردار وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے گھوڑوں سے اتر کر گنا بیگم کو سلام کیا اور اپنے محافظ دستہ کے سواروں کو حکم دیا کہ وہ تعظیماً گنا بیگم کے ساتھ گاؤں تک جائیں۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے اپنے دروازوں میں سرسوں کا تیل گرا کر اتنی شدید لڑائی سے اپنے بیٹوں اور گاؤں کی بہو کی سلامت واپسی کی نذر گزاری۔

جہان خان کا لشکر ایک روز کی مسافت پر آگے جا رہا تھا اور وہ اپنے خاص دستہ کے ساتھ پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔

اس واقعہ کا گاؤں اور علاقہ میں بہت چرچا ہوا۔ گنا بیگم کے اعتماد سے افغان جرنیل سے باتیں کرنے اور جرنیل کے اپنے سرداروں سمیت گھوڑوں سے اتر کر انہیں سلام کرنے اور معافی مانگنے پر لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا۔ بگل کی آواز پر گاؤں کے بوڑھے بچوں کا ان کی مدد کو پہنچ جانا اور ان کی بخیریت واپسی پر گاؤں کی ساری بوڑھیوں کا تیل چوچو کر نذر گزارنا گنا بیگم کے لئے بھی نیا تجربہ تھا۔ عمادالملک کے محل اور لشکر میں ان کی حفاظت پر جو سپاہی اور سوار متعین ہوتے تھے، وہ اس حفاظت کی بھاری تنخواہیں وصول کرتے تھے۔ ملک قاسم کے گاؤں کے لوگ بلا تنخواہ اس کی حفاظت کے لئے اپنے سے بڑے اور زیادہ مسلح دستہ سے لڑنے کے لئے دوڑ آئے تھے اور گاؤں کی خواتین اس کی بلائیں لینے آ گئی تھیں، وہ حیران بھی تھی اور خوش بھی۔

جب مغلانی بیگم کے پیامبر نے ان کی قید اور ملازمین کے فرار کی اطلاع پہنچائی تو گنا بیگم افسردہ ہو گئی۔ اس کے لئے بیگم کو اسی شاہ برج میں قید کرنے کا تصور بہت تکلیف دہ تھا جہاں سے اس کے خاندان نے اور خود اس نے پنجاب پر حکومت کی تھی۔ سکھوں اور آدینہ بیگ کے ساتھ سازش کرنے کے سنگین جرم میں گرفتاری میں وہ بیگم کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ جلد لاہور پہنچنا چاہتی تھی تاکہ اس کی صاحبزادی کی دیکھ بھال کر سکے اور جائزہ لے سکے کہ وہ مغلانی بیگم کے لئے کیا کر سکتی ہے۔ وہ لاہور کے سفر کی تیاری کرنے

گی۔

***

بوڑھے ملاح نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "موسم کی نیت کچھ بھلی نہیں دکھتی تم کشتیاں اچھی طرح تو باندھ آئے ہو؟" اس نے اپنے اردگرد بیٹھے نوجوانوں سے پوچھا۔

"بابا! دعا کرو موسم ٹھیک رہے، گندم کی فصل خراب ہوگئی تو بھوکوں مر جائیں گے"۔ پاس بیٹھے نوجوان نے کہا۔ "شہر میں پہلے ہی اناج کا کال ہو رہا ہے، دکانوں پر اناج ہے نہ غریبوں کے پاس پیسے ہیں"۔

"ملک میں فساد ہوگا تو کال نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟" بوڑھا افسردہ تھا۔

"گاؤں والے کہتے ہیں گندم کی فصل تو پہلے ہی اچھی نہیں اس دفعہ"۔ دوسرے نوجوان نے خبر دی۔

"تجارت والے قافلے آنا پہلے ہی بند ہو گئے ہیں۔ فصل بھی اچھی نہ ہوئی تو ملاحوں کا دھندا تو ختم ہی سمجھیں"۔ ایک اور نوجوان نے کہا۔

"دھندا تو پہلے ہی ختم ہے، بس یہ جانو کہ کشتیاں بکنا باقی ہیں"۔ ایک اور آواز آئی۔

بوڑھا خلاف عادت خاموش تھا، نوجوان باتیں کرتے رہے اور وہ کچھ سوچتا رہا جیسے ملاحوں کی ساری بستی کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہو۔

"مغلانی بیگم کے ہیرے بک گئے، ہماری کشتیاں کیا چیز ہیں سب پر زوال ہے"۔

"ایسا مت کہو، ہماری کشتیاں ہیروں سے زیادہ قیمتی ہیں"۔ بوڑھے نے نوجوان کو ٹوکا۔ "دنیا کا سارا دھندا کسان کے بیل اور ملاح کی کشتی کی وجہ سے چل رہا ہے، ان کی سلامتی کی دعا مانگو"۔

"مغلانی بیگم کے ہیرے بک گئے" سے کالو کے دل کو ٹھیس پہنچی مگر وہ خاموش رہا۔ سارا شہر اس سے واقف تھا وہ کیا کہتا۔

"کسی نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ بیگم دین کے دشمنوں کے ساتھ سازش کرے گی۔ اس کے آباؤ اجداد دین کے لئے لڑتے رہے ہیں، وہ دین کے دشمنوں کے ساتھ سازشیں کرنے لگی، سب کچھ برباد کر دیا اس نے۔ افغانوں کو پتہ نہ چل جاتا تو کافر غالب آ جاتے"۔ بوڑھے نے دکھ سے کہا۔

"عورت انتقام پر آ جائے تو اس کا کوئی دین نہیں ہوتا، وہ نہ دین کا سوچتی ہے نہ دنیا کا"۔

کالو کے لئے مغلانی بیگم کے خلاف باتیں سننا ناگوار ہو گیا تو وہ چپکے سے اٹھ کر اپنی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔

"کالو کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کرو، اسے دکھ ہوتا ہے"۔ بوڑھے نے نوجوانوں کو ہدایت کی۔

"بابا! آپ نے وہ بری خبر نہیں سنی؟" ایک ملاح نے دور سے بلند آواز میں کہا۔ "میں ابھی شہر سے آیا ہوں سارے لاہور میں لوگ فکرمند ہو رہے ہیں"۔

سارے ملاح اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہم تو بری خبریں سن سن کر تھک چکے ہیں کوئی اور بری خبر رہ گئی تھی تو وہ بھی سنا دو"۔ بوڑھے کی آواز میں دکھ بڑھ گیا۔

"سرہند شریف پر کفار کا قبضہ ہو گیا ہے اور افغان فوج واپس آ رہی ہے"۔ ملاح نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کفار نے افغانوں کو شکست دے دی؟" ایک نوجوان نے حیرانی سے پوچھا۔

"افغان تو راستہ میں ہی تھے کفار پہلے ہی قابض ہو گئے تھے اور حاکم کو گرفتار کر چکے تھے"۔ اس نے بتایا۔

"افغان ان کے پیچھے نہیں گئے؟"

"سرہند شریف کے بعد کفار لاہور کی طرف آ رہے ہیں، افغان فوج ان کا راستہ روکنا چاہتی تھی مگر وہ

دوسرے راستے سے آگے نکل آئے ہیں۔ شہر میں تو سب لوگ ڈرے ہوئے ہیں"۔ اس نے شہر میں سنی بات کا باقی حصہ بیان کیا۔

محفل میں خاموشی چھا گئی، سب بوڑھے ملاح کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "اپنی اپنی کشتیوں کی حفاظت کرو"۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کشتیوں پر کسی کا قبضہ تمہارے لئے سرہند پر کفار کے قبضہ سے بھی زیادہ تباہ کن ہوگا"۔

جہان خان ابھی ہوشیار پور کے نواح میں تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ مرہٹہ سکھ اور آدینہ کی فوجوں نے سرہند پر قبضہ کرلیا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ سکھوں نے شہر کے بازاروں، گھروں کو لوٹنے کے بعد ان کی چھتیں اور دروازے سب اکھاڑ دیئے، فرش کھود ڈالے، بنیادیں اکھاڑ کر شہر برباد کرچکے تو دوسرے روز مرہٹے بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔

سکھ اس شہر سے اپنے گورو گوبند سنگھ کے بیٹوں کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے قبریں کھود کر مرحوم امراء اور حاکموں کی ہڈیاں جلا دیں، ان کے مزاروں کی اینٹیں اکھاڑ کر دریا میں پھینک دیں اور اس طرح اپنے گورو کی وہ پیشین گوئی پوری کردی کہ "سکھ سرہند کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر دریا میں پھینک دیں گے"۔

آدینہ بیگ اپنی فوج کے ساتھ شہر سے باہر خیمہ زن رہا اور مسلمانوں اور شہر کو تباہ ہوتا دیکھتا رہا لیکن جب مرہٹوں نے سکھوں سے لوٹے ہوئے خزانوں سے حصہ مانگا اور دونوں میں خونریزی ہونے لگی تو اس نے بیچ میں پڑ کر دونوں میں لڑائی رکوادی اور انتظام کیا کہ سکھ اپنی فوجوں کے ساتھ لاہور کی طرف سفر میں مرہٹوں سے پانچ کوس آگے چلیں گے تاکہ پھر ٹکراؤ نہ ہوجائے۔

جہان خان نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا اور حملہ آوروں کا انتظار کرنے لگا لیکن جب مراسلہ نگاروں نے خبر دی کہ مرہٹہ سکھ اور آدینہ بیگ راستہ بدل کر لاہور کی طرف بڑھ رہے ہیں تو وہ تیزی سے واپس مڑا تاکہ ان کے پہنچنے سے پہلے لاہور کے دفاع کی تیاریاں مکمل کرسکے۔

٭٭٭

شاہ برج کا تہہ خانہ بہت وسیع تھا، موٹی دیواروں کے اندر سے ہوا کے آنے جانے کے لئے بنے پائپ جیسے سوراخوں کے علاوہ جن کے باہر کی طرف جالی لگی تھی۔ تہہ خانہ میں روشنی اور ہوا کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس کے آخری کونے میں گھوم کر اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں جو شاہی رہائش گاہ کے برج میں کھلتی تھیں۔ ان سیڑھیوں کا آہنی دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا جہاں رات دن محافظ چوکس رہتے تھے۔ مغلانی بیگم کو اس تہہ خانہ میں قید ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا مگر وہ محسوس کرتی تھی جیسے وہ صدیوں سے اس میں بند ہے۔ آرام دہ بستر، کتابیں اور ضرورت کی سب چیزیں اسے فراہم کی گئی تھیں۔ کنیزیں وقت مقررہ پر کھانا لے کر آتیں، ادب و احترام سے پیش کرتیں، کسی ضرورت کا پوچھتیں۔ جس چیز کی اسے خواہش ہوتی فراہم کی جاتی لیکن قید اور تنہائی کا احساس اور تہہ خانہ کے اوپر شاہ برج میں گزری زندگی کی یادیں وہ سوچ سوچ کر تھک جاتی تو شمع دان پکڑ کر تہہ خانے میں ٹہلنا شروع کردیتی۔ چاروں طرف کی موٹی دیواروں سے آگے اندھیرے کی دیواریں کھڑی تھیں جب وہ شمع دان اٹھا کر کسی طرف چلتی تو اندھیرے کی دیوار پیچھے ہٹتے ہٹتے تہہ خانہ کی دیوار سے جا لگتی۔ اس نے کئی بار اس دیوار کو چھونے کی کوشش کی مگر شمع دان اٹھائے وہ جس تیزی سے آگے بڑھتی اسی تیزی سے اندھیرے کی دیوار پیچھے کی طرف ہٹتی جاتی۔ وہ چلتی چلتی رک گئی تو دیوار سیاہ بھی رک گئی وہ روشنی اور اندھیرے کے ملاپ پر غور کرنے لگی۔ کیا یہ بھی ایک دوسرے میں ضم ہوسکتے ہیں؟ اس نے اپنے آپ سے

پوچھا۔

"نہیں روشن دن سیاہ رات نہیں ہو سکتے۔ سیاہ رات میں سورج کی روشنی میسر نہیں آ سکتی"۔ اس کے دماغ نے جواب دیا۔

وہ مسکرائی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی سب سے اوپر کی سیڑھی پر پہنچ کر اس نے کان دروازے سے لگا دیئے مگر کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ "کب تک؟" وہ بڑبڑائی۔ "کب تک یہ دروازہ بند رہے گا؟ آخر اسے کھلنا ہے یہ کھل کر رہے گا مگر کب؟" وہ سوچ میں گم سیڑھیاں اترنے لگی، اندھیرا آگے آگے چلتا ہوا نشست گاہ تک گیا اور اس کے بیٹھ جانے کے بعد کچھ فاصلہ پر کھڑا ہوگیا۔ "تمہیں علم ہے میں کون ہوں؟" اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ "تم مجھے پہچانتے ہو؟ تم تب بھی یہیں تو ہوتے تھے جب اس زنداں خانہ کے در و دیوار مجھ سے کانپتے تھے، شاہ برج کی روشنیاں میرے پاؤں چومتی تھیں۔ قلعہ کے در و دیوار مجھے سلام کیا کرتے تھے، تم تب بھی یہیں تھے۔ تم مجھے جانتے ہو، پہچانتے ہو میں وہ نہیں جس سے تم واقف نہ ہو"۔ وہ کہتی رہی اندھیرا خاموش کھڑا استادہ رہا۔

اس نے شمع دان کی روشنی تیز کر دی، روشنی کا دائرہ وسیع ہوگیا، اندھیرا پیچھے ہٹ گیا، وہ آہستہ آہستہ روشنی کم کرنے لگی، اندھیرا آگے بڑھنے لگا۔ "اچھا تو تم روشنی کا احترام کرتے ہو؟" وہ غصہ میں جھلائی اور شمع دان بجھا دیا۔ اندھیرے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ "اب چومو میرے پاؤں"۔ اس نے قہقہہ لگایا۔

تہہ خانہ کے آخری سرے کی طرف روشنی پھیلنے لگی مگر وہ اسی طرح بیٹھی رہی روشنی بڑھتی گئی پھر قدموں کی آواز نے تہہ خانہ کی خاموشی کو توڑا اس نے پھر بھی کروٹ نہیں بدلی، روشنی اس کی طرف آ رہی تھی۔ "اچھا تو یہ اندھیرے کو بھی مجھ سے جدا کرنا چاہتے ہیں"۔ اس کی آواز زنداں کے در و دیوار سے ٹکرا گئی۔

چلتے قدم وہیں رک گئے۔

"آئیں، ہم حاضری کی اجازت دیتے ہیں"۔ "اس نے حاکمانہ انداز میں کہا۔

روشنی قدم قدم چلنے لگی۔

پھر روشنی رک گئی، قدم اس کی طرف بڑھتے رہے۔

"ہم حاضری کی اجازت کے لئے شکر گزار ہیں"۔ کسی نے اس کو آداب عرض کیا۔

"تم؟" اس نے آنے والی کو پہچانتے ہوئے پوچھا۔ "گنا بیگم! تم...... ہم نے تمہیں آزاد کر دیا، انہوں نے تمہیں بھی قید کر دیا؟"

"ہمیں دکھ ہے کہ ہم جلد حضور کے پاس نہ آ سکے"۔ گنا بیگم نے افسوس سے کہا، وہ بیگم کی اندھیرے سے گفتگو سن چکی تھی۔

"ہم تمہیں اپنے پاس دیکھ کر خوش ہیں مگر تمہیں یہاں دیکھ کر دکھ محسوس کر رہے ہیں"۔ بیگم سنبھل کر بیٹھ گئی۔

گنا بیگم نے کنیز کی طرف دیکھا۔ "شمع دان جلا دیں، ہم تکلیف چاہتے ہیں"۔ اس نے بیگم شمع دان کی طرف اشارہ کیا۔

کنیز نے شمع دان جلایا اور آداب کہہ کر سیڑھیوں میں غائب ہوگئی۔

"بیگم حضور نے آپ کو یاد فرمایا ہے اور ہم حضور کو لینے آئے ہیں"۔ بیگم نے کہا۔

"کون بیگم حضور؟" مغلانی بیگم نے پوچھا۔

"حضور تیمور شاہ کی ملکہ عالیہ اور شہنشاہ ہندوستان کی دختر گوہر افروز بانو حضور سے ملنے کے لئے بیتاب ہیں"۔ گنا بیگم نے بتایا۔

"تیمور شاہ ابھی یہیں ہے، اس کو تو اب تک قندھار میں ہونا چاہئے تھا"۔ مغلانی بیگم مسکرائی۔

گنا بیگم نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا کہ کنیز سن تو نہیں رہی۔
"حضور تیمور شاہ آپ کے ساتھ اس سلوک پر بہت شرمندہ ہیں"۔
"شاہ اور شہنشاہ کبھی شرمندہ نہیں ہوا کرتے گنا بیگم! ہم انہیں تم سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں"۔
مغلانی بیگم کے حواس بحال ہونا شروع ہو گئے تھے۔
"شاہ برج میں حضور کے لئے ایوان آراستہ کیا جا چکا ہے"۔ گنا بیگم نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے بتایا۔
"شاہ برج ہمارے لئے نیا نہیں اس کی اینٹوں نے سالوں ہمارے قدم چومے ہیں اس کی ہر دیوار ہمارے خاندان کی عظمت کی گواہ ہے۔ یہ زنداں خانہ البتہ ہماری قدم بوسی سے محروم تھا، تیمور شاہ کے کرم سے اس کے مقدر بھی جاگ گئے"۔
گنا بیگم ان کی باتوں سے، ان کے دکھ اور احساسات کا اندازہ کر چکی تھی اور کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے انہیں رنج پہنچے۔ "حضور کی اجازت ہو تو کنیزیں بلا لیں؟"
بیگم کے جواب دینے سے پہلے اس نے کنیز کو آواز دی اور بیگم کے پاس کھڑی ہو گئی۔
شمع دان اٹھائے کنیز کے پیچھے کنیزوں کا جلوس نمودار ہوا وہ آداب عرض کر کے مؤدب کھڑی ہو گئیں۔
بیگم نے اپنے سامان اور زنداں کی دیوار کا جائزہ لیا اور چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔
آگے شمع دان اٹھائے کنیز پیچھے مغلانی بیگم ان کے پیچھے گنا بیگم اور پیچھے کنیزوں کا قافلہ۔
گوہر افروز بانو نے سیڑھیوں کے دروازہ کے سامنے مغلانی بیگم کا استقبال کیا۔

کنیزوں کی قطاروں کے درمیان سے چلتی ہوئی مغلانی بیگم ایک آراستہ دیوان تک پہنچی جس کے دروازوں اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ ریشمی قالینوں کے فرش پر گاؤ تکیے لگا کر نشست گاہ آراستہ کی گئی تھی اور پہلو کا کمرہ خواب گاہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔
مغلانی بیگم نے ایک نگاہ فرش سے چھت تک دوڑائی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نشست گاہ تک پہنچی۔
گنا بیگم اور گوہر افروز بانو ان کے دائیں بائیں چل رہی تھیں۔ ایک کنیز نے "بسم اللہ" کہہ کر انہیں تشریف رکھنے کا اشارہ کیا۔ بیگم نے گنا بیگم اور گوہر افروز بانو کی طرف دیکھا اور نشست پر بیٹھ گئی۔
گنا بیگم اور گوہر افروز بانو آداب ادا کر کے باہر نکل گئیں۔
پس پردہ کی کنیز نے جھک کر سلام کیا اور خشک میوؤں کی طشتری ان کے پاس رکھ کر واپس چلی گئی۔
بیگم نے ایک بار پھر فرش سے چھت تک کمرے کا جائزہ لیا اور اپنے سامنے پھیلے دسترخوان اور اس پر چنے میوؤں کو دیکھنے لگی۔

***

شالامار باغ کی آراستہ کیاریوں اور روشوں میں موسم بہار کے رنگ رنگ کے پھول مستی میں جھوم رہے تھے۔ سب پھول مل کر ایک ہی سمت میں سر جھکاتے اور پھر آہستہ آہستہ سیدھے تن کر کھڑے ہو جاتے اور اس کے ساتھ ہی پھر سے سر جھکانے کو جھکنا شروع کر دیتے۔ بور سے لدے آم کے درختوں کے قدموں میں بیٹھے مالی گردن گھما کر نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے دو آدمیوں کو دیکھتے اور پھر سے مٹی کھودنا شروع کر دیتے۔ اس موسم میں اگر آم کے درختوں کے پاؤں کی مٹی سے پیار نہ کیا جائے تو شاخوں کے سروں پر سے بور کا بوجھ ہلکا

ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ نہر میں بہتے شفاف پانی پر سورج کی کرنیں قدم رکھتیں اور ساتھ ہی کہیں غائب ہو جاتیں۔ کنارے کنارے چلنے والے دونوں آدمی لگتا تھا اس حسن و مستی سے بے خبر ہیں یا بے نیاز ہو گئے ہیں۔ وہ سر جھکائے کنارے کے فرش میں کچھ تلاش کرتے چلے جا رہے تھے۔ نہر کے آخری سرے پر سے انہوں نے خشک آبشار کو دیکھا اور سیڑھیاں اتر کر تالاب کے کنارے بیٹھ گئے۔ تالاب کی سطح پرسکون تھا، ہلکی ہوا کوشش کے باوجود اس طرح پر کوئی قابل توجہ لہر پیدا نہیں کر رہی تھی۔ پانی کی سطح سے اوپر سر نکالے قطار در قطار کھڑے فوارے کسی بے غیرت کی آنکھ کی مانند نمی سے محروم تھے۔

"ملک سجاول! مجھ میں طوفانی لہروں کے مخالف رخ میں تیرنے کی ہمت نہیں۔ آپ کا حکم تھا میں سرہند کی لڑائی سے الگ رہا۔ اب جو طوفان آ رہا ہے اس سے افغان نہیں بچ سکتے"۔ دراز قامت سانولے رنگ کے تومند آدمی نے تالاب کی سطح پر کچھ تلاش کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

"سردار لکھنا! میں شکر گزار ہوں آپ نے میرا مان رکھ لیا"۔ ملک سجاول نے پانی کے آخری کنارے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "افغان طوفان سے بچتے ہیں یا نہیں میرے لئے طوفان میں تنکا بن کر بہہ جانا ممکن نہیں۔ لڑائی افغانوں کی نہیں مسلمانوں کی ہے اور مسلمان کفر کے خلاف میدان جنگ میں اترتے وقت یہ نہیں دیکھا کرتا کہ دشمن کتنا قوی ہے"۔

"ملک سجاول! یہ کفار اور مسلمانوں کی جنگ نہیں، آدینہ بیگ نے مرہٹوں اور سکھوں کو اکٹھا کیا ہے۔ اس کا داماد اور جرنیل خواجہ مرزا خان بھی مسلمان ہے"۔ سردار لکھنا نے جواب دیا۔

"سردار صاحب! اگر یہ کفر اور اسلام کی لڑائی نہ تھی تو سرہند میں مزار اور قبریں مسلمانوں کی ہی کیوں کھودی گئیں، گھر اور حویلیاں مسلمانوں کے ہی کیوں خاک میں ملائے گئے تھے؟ آدینہ بیگ کو اس جرم کی سزا بھگتنا ہو گی۔ آپ کا کیا خیال ہے مرہٹے اور سکھ اس کے لئے قربانیاں دے رہے ہیں؟"

"سردار سجاول! سکھ ہمارے ہم زبان ہیں، ہم زمین ہیں، ہم ان سے بات کر سکتے ہیں لڑ سکتے ہیں، ان ترکوں اور افغانوں نے ہم میں سے کبھی کسی کو اس قابل سمجھا تھا کہ اپنی فوج کی کمان اس کے سپرد کر دیں اور اسے دربار میں برابر کا مقام اور احترام دیں"۔ سردار لکھنا نے آلا سنگھ سے اپنے تعلق کی طرف اشارہ کیا۔

"سردار لکھنا، بات زبان اور زمین سے بلند تر عقیدہ کی ہے۔ اگر ہم مسلمانان ہندوؤں، سکھوں اور مرہٹوں سے لڑنے کی قوت رکھتے تو شاہجہان آباد کے علماء اور امراء کو افغانوں کو بلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ رہی بات ترکوں اور افغانوں کے رویہ کی تو اس کی سزا آج سے زیادہ وہ خود بھگت رہے ہیں"۔

"آپ ہمارے سردار ہیں، آپ کا فیصلہ برادری کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں اور یہ خیال رکھیں کہ افغان تو قندھار واپس چلے جائیں گے مگر ہمیں یہیں رہنا ہے جہاں سکھوں نے رہنا ہے"۔

"سردار لکھنا! ملت برادری سے بلند تر ہے اور ہمیں ملت کے مستقبل کو سامنے رکھ کر سوچنا اور فیصلہ کرنا چاہئے۔ سکھ آج ہمیں افغانوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں، جب یہ نہیں ہوں گے تو ہمارا حشر بھی سرہند کے مسلمانوں جیسا کریں گے"۔

"میری خواہش تھی کہ ہم برادری کے مستقبل کا مل کر فیصلہ کرتے، اپنا وزن مل کر کسی کے پلڑے میں ڈالتے۔ آپ ہمارے سردار ہیں، میں آپ کو جہاد سے روک نہیں سکتا۔ صرف اتنی التجا ہے کہ مجھے اپنے حکم کی پابندی سے رہا کر دیں، میں جس کے ساتھ ہوں اس کا

ساتھ چھوڑنا ہماری روایت کے منافی ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرا اختیار ہمیشہ برادری کے تحفظ میں کام آئے گا"۔

"سردار لکھنا! میرا حکم سرہند کے محاصرہ تک تھا۔ آپ نے اس پر عمل کیا، میں مشکور ہوں۔ اس سے پہلے بھی آپ آزاد تھے، اب بھی میں آپ کو پابند کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ میں نے آپ سے جو کچھ کہا اپنی ذاتی حیثیت میں کہا ہے"۔

"سکھ جتھے داروں میں ملک قاسم کی جرأت اور بہادری کی بہت چرچا ہے اس کے مخالفوں سے اس کی تعریف سن کر میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی میں اس کی سلامتی اور زندگی کی دعا مانگنا شروع کر دیتا ہوں۔ میری درخواست ہے اس کی حفاظت کریں"۔

سردار لکھنا نے موضوع بدل دیا، وہ جان گیا تھا کہ ملک سجاول کو آدینہ بیگ کی حمایت پر آمادہ کرنا اس کے بس میں نہیں۔

"جس نے اسے جرأت اور بہادری عنایت فرمائی ہے، وہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے"۔ ملک سجاول نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو دور جانا ہے، میں نہیں چاہتا تاخیر ہو"۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ "کیا یہ مناسب نہ ہوگا آپ آج کی رات ملک پور رہ جائیں"۔

سردار لکھنا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "بزرگوں کو سلام کہنے اور ان کی دعائیں لینے کی خواہش تو تھی مگر اب نہیں، آپ سب کو میرا سلام پہنچا دیں"۔ اس نے تالاب میں تیرتے مرغابیوں کے جوڑے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہوا اب بھی ہلکی ہلکی چل رہی تھی، کیاریوں اور روشوں پر پھول اسی طرح سرمستی میں جھوم رہے تھے، مالی ابھی تک آم کے درختوں کے قدموں میں مٹی کھود رہے تھے مگر نہر کے کنارے چلنے والوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

بیرونی ڈیوڑھی کے قریب پہنچ کر سردار لکھنا رک

گیا۔ "سردار! میں آپ کو یہ اطلاع دے کر کوئی راز فاش نہیں کر رہا کہ سکھ جتھے دار دو روز بعد اپنے لشکروں کے ساتھ لاہور کے دروازوں سے قریب ہوں گے۔ مرہٹے اور آدینہ بیگ کی فوج ان سے ایک روز بعد پہنچے گی، اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے افغانوں نے کیا تیاریاں کی ہیں؟ اور شاید میں یہ بھی کوئی راز نہیں پوچھ رہا"۔

ملک سجاول اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ اس بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ "جہان خان ایک آزمودہ جرنیل ہے، احمد شاہ ابدالی نے اس کے تجربہ اور شجاعت کے پیش نظر ہی اسے اپنے ہندی مقبوضات کی حفاظت کا فرض سونپا تھا"۔

"سردار! میں یہ بھی آپ کو کوئی راز نہیں بتا رہا، اس بار افغان لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے"۔ سردار لکھنا نے کہا۔

ملک سجاول نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔

"شہر اور قلعہ میں خوراک کا ذخیرہ بہت کم ہے، شہر اور قلعہ کی فصیلوں کی مرمت کے لئے افغانوں کے پاس وقت نہیں وہ محاصرہ میں رہ کر بھی حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے"۔ سردار لکھنا نے اسے اندرونی حالت سے آگاہ کیا۔

"احمد شاہ ابدالی کی فوجیں لاہور سے کچھ زیادہ دور نہیں ہوں گی"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

"احمد شاہ ابدالی کی فوجیں واقعی لاہور سے کچھ زیادہ دور نہیں لیکن آدینہ بیگ نے اپنے اتحادیوں کو یقین دلایا ہے کہ وہ فوجیں سفر کے لئے فارغ نہیں"۔

ملک سجاول اس انداز میں مسکرایا جیسے اسے یقین دلانا چاہتا ہو کہ جہان خان کی مقابلہ کی تیاریوں اور احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کی افغانستان میں مصروفیات کے بارے میں اس کی معلومات احمقانہ ہیں۔

ڈیوڑھی کے دروازے پر دونوں کے دستے منتظر تھے۔ خدام نے گھوڑے پیش کئے تو سردار لکھنا نے آگے بڑھ کر ملک سجاول کا گھوڑا پکڑ لیا اور انہیں سوار کرا کے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ ملک سجاول کھڑا رہا، سردار لکھنا سوار ہو چکا تو دونوں دستے ایک ہی سمت میں چلنے لگے۔ ایک کوس چلنے کے بعد وہ رک گئے اور سردار لکھنا نے جھک کر ملک سجاول کو سلام کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ ملک سجاول اپنے دستہ کے ساتھ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا، جب وہ کافی دور جا چکے تو اس نے گھوڑوں کا رخ لاہور کی طرف موڑ دیا۔

****

کنیز کافی دیر تک آداب کے لئے رکوع میں رہی اور پھر کوئی حکم نہ سن کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ وہ خاموش کھڑی دیکھتی رہی مگر مغلانی بیگم کو اس کی آمد کا احساس نہ ہوا۔ وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی قلعہ کی دیوار سے آگے حد نظر تک پھیلی افغان لشکر گاہ کو دیکھ رہی تھی اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ افغان فوج اس جگہ کیوں خیمہ زن ہے۔ راوی کی طرف سے اسے کس سے خطرہ ہو سکتا ہے اگر آدینہ بیگ اور سکھ آئیں گے تو وہ مشرق کی طرف سے آئیں گے۔ افغانوں کو اس طرف لشکر جمع کرنا ہوتا ابھی تک اسے سرہند پر قبضہ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔

اسے اس دیوان اور خواب گاہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کی قید کا کمرہ تبدیل ہوا تھا رہائی اور آزادی نہیں ملی تھی۔ اب مؤدب کنیزیں اور خادمائیں ہمہ وقت اس کی خدمت میں حاضر رہتی تھیں۔ اس کے آرام و سکون کا خیال رکھتی تھیں لیکن پس پردہ پہرہ بدستور موجود تھا۔ جب سے وہ اندھیرے زنداں سے روشن زندان خانہ میں لائی گئی تھی تو اس کے بعد سے گنا بیگم کو ہرافروز بانو تو کیا کوئی اور بھی اس سے ملنے یا اس کی خیریت معلوم کرنے نہیں آیا تھا۔ صرف خدام اور کنیزیں ہی آتی جاتی رہی تھیں۔

کنیز نے ذرا بلند آواز میں اجازت چاہی اور پھر رکوع میں چلی گئی۔

سلطانی بیگم نے گھوم کر دیکھا اور نشست کی طرف مڑی۔

کنیز نے اس کے بیٹھ چکنے کا انتظار نہیں کیا۔

"حضور! قلعہ دار اذنِ حاضری کا طلبگار ہے"۔

شاہ برج میں قلعہ دار حاضری کا طلب گار ہے اس کے پاس اپنے سوال کا جواب نہ تھا۔ "اجازت ہے"۔ اس نے بے چینی سے نشست پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"حضور عالی مرتبت تیمور شاہ کا حکم ہے کہ حضور کو بیگم پورہ پہنچا دیا جائے، سواری اور محافظ منتظر ہیں"۔ قلعہ دار نے آداب کے بعد حکم رہائی پہنچایا اور جواب سننے کے لئے کھڑا رہا۔

"حضور کو ہمارا سلام پہنچا دیں اور خدام کو بھیج دیں"۔ بیگم نے جواب دیا۔

قلعہ دار باہر نکل گیا۔ رہائی پر خوشی سے زیادہ اسے یہ تشویش تھی کہ رہائی کا حکم قلعہ دار کیوں لایا اور تیمور شاہ کے حرم میں اسے یہ اطلاع پہنچانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔

خدام راہداری سے ہوتے ہوئے اسے شاہ برج کے بیرونی دروازہ تک لے گئے۔ حرم میں کنیزیں اور خواجہ سرا گھوم پھر رہے تھے۔ وہ جدھر سے گزرتی سب آداب کے لئے جھک جاتے تھے مگر حرم کی کوئی خاتون اسے رخصت کرنے نہیں آئی۔

پالکی کے پاس قلعہ دار موجود تھا، وہ سوار ہو چکی تو کہاروں نے پالکی اٹھالی۔ قلعہ کے مستی دروازہ پر افغان سواروں کا دستہ ساتھ ہو گیا۔ قلعہ سے نکل کر وہ بیگم پورہ کو جانے والی سڑک پر چلنے لگے جس کے ساتھ ساتھ ہر طرف لشکر کے خیمے نصب تھے۔ اس نے پردے سے جھانک کر باہر کے حالات کا اندازہ کرنا چاہا مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔

حویلی کی ڈیوڑھی پر ملک قاسم کے آدمی موجود تھے۔ انہوں نے بیگم کو سلام کیا، ان کی گرفتاری کے بعد سے ملک نے حویلی کی حفاظت کے لئے اپنے آدمی مقرر کر دیئے تھے۔ سوار دروازے پر رک گئے، کہار پالکی لے کر اندر داخل ہوئے تو کنیزوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میاں خوش فہم مبارک سلامت کا شور مچاتا ان کی صاحبزادی کو اطلاع دینے دوڑ پڑا۔

"ٹھہرو!" بیگم نے میاں خوش فہم کو آواز دی۔ "پالکی برداروں کو رخصت کرو اور ہمارے حضور حاضر ہو جاؤ"۔ وہ اپنے دیوان خانہ کی طرف چل دی۔

پالکی برداروں کو رخصت کر کے میاں خوش فہم حاضر ہوا تو بیگم اپنی بیٹی کا منہ سر چوم رہی تھی۔ وہ جلدی سے واپس مڑا۔ "ٹھہرو!" بیگم نے اسے واپس جاتے دیکھ کر حکم دیا اور نشست پر بیٹھ گئی۔ "دربار اور شہر کی کیا خبر ہے"۔ وہ ابھی تک کچھ سمجھ نہ پائی تھی۔

"حضور! افغان بھاگ رہے ہیں، شہر سے افغان امراء اور سردار راوی کے کنارے لشکرگاہ میں جمع ہو رہے ہیں۔ انہوں نے ملاحوں کی سب کشتیاں پکڑ لی ہیں اور رات دن اپنے حرم اور سامان دریا کے دوسری طرف ڈھونے لگے ہیں"۔ میاں خوش فہم نے خوشی سے اطلاع دی۔

"تم نے یہ سب کچھ کس سے سنا؟" بیگم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہ بات شہر سے نکل کر دیہات تک پہنچ چکی ہے"۔ میاں خوش فہم نے جواب دیا۔

"ملہاس خاں اور دیگر ملازمین کو حاضری کا حکم دیں ہم انہیں ہدایات دینا چاہتے ہیں"۔ بیگم نے کہا۔

"حضور! ملازمین نمک حرام تو اس دن سے غائب

ہیں، ملک قاسم کے لوگ نہ آتے تو نہ معلوم ہمارا کیا حال ہوتا"۔ میاں خوش فہم نے جواب دیا۔

"طہماس خان کہاں ہے؟"

"وہ بھی آ جاتا ہے، حضور کی آمد کا جان کر ضرور آئے گا"۔

"منا بیگم اپنی حویلی میں ہے یا گاؤں میں؟"

"حضور! حویلی میں نہیں گاؤں کا علم نہیں"۔

"معلوم کر کے ہمیں اطلاع دو"۔ بیگم نے کچھ سوچ کر کہا۔

میاں خوش فہم سلام کر کے باہر نکل گیا۔

بیگم سوچنے لگی۔

اس کی بیٹی نے ماں کو غیر حاضر دیکھا تو جانے کی اجازت چاہی۔

بیگم نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔ "جان مادر! کانٹوں پر چلنا سیکھو"۔

وہ خاموش کھڑی رہی اور پھر سلام کر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

پس پردہ کنیز نے حاضری کی اجازت چاہی اور اطلاع دی کہ میاں خوش فہم حاضر ہونا چاہتے ہیں۔

"حاضر کرو"۔ بیگم نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اتنی جلدی اذن حاضری کسی اہم وجہ سے ہے۔

"حضور! طہماس خاں پہنچ گیا ہے، خادم باہر گیا تو وہ ڈیوڑھی میں موجود تھا۔ اسے حضور کی آمد کی خبر مل گئی تھی"۔ میاں خوش فہم نے اطلاع دی۔

"اسے حاضر کریں"۔ بیگم سنبھل کر بیٹھ گئی۔

طہماس خاں کمرے میں داخل ہوتے ہی رکوع کے بعد سجدے میں گر گیا۔ "حضور کے غلام کے دن روشن ہو گئے، غم کی اندھیری رات خالق نے ختم کر دی"۔ وہ رونے لگا۔ "غلام یہ دن دیکھنے کو زندہ ہوتا"۔

"غلاموں کا مقدر ان کے آقا کے نامہ عمل میں لکھا ہوتا ہے، تمہارا غم بجا ہے اور ہم اس کی قدر کرتے ہیں"۔ بیگم نے اسے کھڑا ہونے کا حکم دیا۔

طہماس خاں دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

"شہر اور دربار کی تازہ خبر کیا ہے؟" بیگم نے پوچھا۔

"حضور! تیمور شاہ کا حرم شاہدرہ منتقل ہو چکا ہے، کشتیاں دن رات پھیرے لگا رہی ہیں، افغان واپس جا رہے ہیں"۔ اس نے میاں خوش فہم کی اطلاع میں اضافہ کیا۔

"اپنے گھوڑے اور ملازم تیار رکھو اور ڈیوڑھی میں حاضر رہو"۔ بیگم نے حکم دیا۔

"حضور کے اس خادم کے سوا سب نمک حرام غائب ہو چکے ہیں"۔ طہماس خاں نے بتایا۔

"سب کو اکٹھا اور تیار کرنا لازم ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں تم یہ کام جانفشانی سے انجام دو گے۔ میاں خوش فہم سے رابطہ رکھو"۔ بیگم نے حکم دیا۔

طہماس خان نے سر تسلیم خم کر دیا۔ "حضور کا غلام حکم کی تعمیل کرے گا"۔

وہ جانے لگا تو بیگم نے پوچھا۔ "منا بیگم اور ملک قاسم کی کیا خبر ہے؟"

"حضور گوہر افروز بانو منا بیگم کو ساتھ لے گئی ہیں، وہ شاہدرہ میں شاہی ڈیرہ میں ہیں، ملک قاسم کا کچھ پتہ نہیں"۔

"گھوڑے اور ملازم چھپا کر رکھو، افغانوں کے ہاتھ نہ آئیں"۔ بیگم نے موضوع بدل دیا۔ انہیں منا بیگم کی شاہی ڈیرہ میں موجودگی کی اطلاع پر حیرانی ہوئی، اسی لئے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"حویلی کے حفاظتی دستہ سے ملک قاسم کے بارے میں معلوم ہو سکتا ہے"۔ طہماس خاں نے بات موڑ دی۔

"اس کی ضرورت نہیں، تم اپنا کام کرو"۔ بیگم نے حکم دیا۔

طہماس خاں آداب کہہ کر باہر نکل گیا۔

***

قلعہ کے دیوان خاص میں افغان فوج کے سردار اور امراء جمع تھے اور جہان خاں انہیں خلعت عطا کر کے ان کی بہادری اور وفاداری کا اعتراف کر رہا تھا۔ افغان فوج کے سرداروں اور امراء میں خلعت بٹ چکے تو ندیم خاص نے ملک قاسم کا نام پکارا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جہان خاں کی کرسی کے سامنے پیش ہو گیا۔ جہان خاں نے ملک قاسم کو خلعت عطا کر کے ندیم خاص کی طرف دیکھا جس نے تیمور شاہ کا فرمان خاص پڑھنا شروع کیا جس میں ملک قاسم کی جرأت اور بہادری کی تعریف کی گئی تھی اور خان کا خطاب دینے کی سند جاری کی گئی۔

افغان امراء اور سرداروں نے ملک قاسم خاں کو مبارکباد دی۔

وہ آداب کے بعد واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ ملک سجاول نے اسے مبارکباد دے کر سینے سے لگا لیا۔ ملک قاسم خان نے جھک کر اپنے سردار کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

جہان خاں اور اہل مجلس سب ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ملک قاسم اور ملک سجاول بیٹھ چکے تو جہان خان نے ملک سجاول کو مبارکباد دی۔ "ملک قاسم خان کی عزت، آپ کی اور آپ کی برادری کی عزت ہے۔ اس سے ہماری اپنی عزت اور برادری میں اضافہ ہوا ہے"۔ وہ تھوڑی دیر رکا اور کہا۔ "ہم حضرت تیمور شاہ کی طرف سے ملک سجاول سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ "خان" کو ہمارے ساتھ قندھار جانے کی اجازت دیں۔ آج سے وہ بادشاہ معظم کی فوج کے سردار ہیں اور ہم اپنے کسی سردار کو یہاں چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ملک سجاول حضرت تیمور شاہ کی اس درخواست اور خواہش پر خوش ہوں گے"۔

ملک سجاول نے قاسم کی طرف دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ "حضرت تیمور شاہ کی اس عنایت اور بادشاہ معظم کے فیصلہ پر اظہار مسرت میرا فرض ہے مگر قاسم میرا بازو ہے اور بازو کے بغیر میں آدھا رہ جاؤں گا"۔

"ہمیں آپ کے دکھ اور محرومی کا احساس ہے مگر ہم اپنے کسی مجاہد کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے"۔ جہان خاں نے کہا۔ "آپ اور آپ کے لوگ بھی ہمارے ساتھ جانا پسند کریں تو ہم خوش ہوں گے"۔

"میں بادشاہ معظم کے جرنیل کی اس پیشکش کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ہماری مجبوری ہے کہ ہمارے قدم اس مٹی نے اتنے مضبوطی سے پکڑ رکھے ہیں کہ ہم حضور کی مانند اسے چھوڑ نہیں سکتے"۔

جہان خاں ملک سجاول کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ "ملک سجاول! ہم اس مٹی کو چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ ہماری مجبوریوں سے واقف ہیں مگر آپ سے یہ وعدہ کر کے جاتے ہیں کہ ہم واپس آئیں گے اور اسی دیوان میں آپ سے ملاقات ہو گی۔ آپ ہمیشہ ہمارے دل میں رہیں گے۔ افغان کبھی کسی دوست کو دل سے نہیں نکالتا اکیلا نہیں چھوڑتا"۔ یہ کہتے ہوئے جہان خان کی آنکھیں جھک گئیں۔

"ہم نے جو کچھ کیا وہ ہمارا فرض تھا، آئندہ جو کریں گے فرض جان کر کریں گے"۔ ملک سجاول کی آواز میں دکھ نمایاں تھا۔

جہان خان اپنی نشست سے اٹھ کر اس تک چل کر آیا، اسے سینے سے لگایا اور خلعت عطا کر کے اس کا شکریہ ادا کیا۔

جہان خان امراء اور سردار جلوس کی صورت میں دیوان سے نکلے، وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ جیسے

سب کے دل اور قدم بوجھل ہوں۔ تھوڑی دور خدام گھوڑے لئے کھڑے تھے۔ سب گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعہ سے باہر آ گئے۔ وہ اب بھی خاموش تھے۔

"ملک سجاول بادشاہوں کی زندگی میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں"۔ جہان خان نے گھوڑا روک کر ملک سجاول کو مخاطب کیا۔ "ہندوستان کے مسلمانوں نے بادشاہ معظم کو دعوت دی اور ان کے امراء نے ان کے دشمنوں سے ہمارے خلاف سازشیں کیں۔ یہ سازشیں ہمارے خلاف بھی تھیں مگر اس سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ ہم تو اپنے وطن جا رہے ہیں، سازشیوں نے یہ نہ سوچا ہندوستان کے مسلمان کہاں جائیں گے"۔

ملک سجاول خاموش رہا۔

بادشاہی مسجد کے سامنے سے ہو کر جہان خان کا جلوس راوی کے کنارے افغان لشکر گاہ کی طرف مڑ گیا۔

***

طہماس خاں شاہ محمد غوث کی مسجد کے ایک کونے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ بیگم کے حکم کے مطابق اس نے بیگم کے سب ملازمین کو بلا کر ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے اپنے گھوڑے چھپا دیں اور خود بھی کہیں چھپ جائیں۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں افغان سوار گھوم رہے تھے اور جہاں کہیں کوئی گھوڑ سوار یا گھوڑا نظر آتا تھا اسے پکڑ کر لشکر گاہ لے جاتے تھے۔ لاہور کے امراء نے اپنے اپنے گھوڑے اور سوار چھپا رکھے تھے اور حویلیوں کے دروازے بند کر لئے تھے۔

کچھ افغان سواروں نے لشکر گاہ سے نکل کر شہر لوٹنے کی کوشش کی تھی اور جہان خان کے حکم سے قلعہ کے سامنے چوک میں ان کی گردنیں اڑا دی گئی تھیں۔ اس کے بعد سے شہر میں ہر طرف خوف و ہراس پھیل رہا تھا۔

کسی نے قریب سے طہماس خاں کو آواز دی تو اس نے منہ سے کپڑا ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور پہچان کر قریب بلا لیا۔ پھر وہ تیزی سے مسجد سے نکل گئے اور باہر کھڑے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے سرپٹ دوڑا دیا۔

بیگم کی حویلی پہنچے تو ڈیوڑھی میں افغان سپاہی قابض تھے۔ بیگم کے خوفزدہ ملازمین بھاگ گئے تھے، دو کنیزیں بیگم اور ان کی صاحبزادی سراسیمہ ایک کمرے میں بند تھیں جس کے دروازے پر میاں خوش فہم کھڑا کانپ رہا تھا۔

"افغان...... بیگم حضور اور صاحبزادی کو گرفتار کرنے آئے ہیں"۔ میاں خوش فہم نے طہماس خاں کو دیکھ کر بتایا۔

بیگم کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ "جہان خان کا حکم ہے کہ ہم وقار بیگم اور ملازمین کے ہمراہ اس کے ڈیرہ پر پہنچ جائیں"۔ بیگم طہماس خان کو دیکھتے ہی چلائی۔

"اس وقت اس حکم کی تعمیل بن چارہ نہیں"۔ طہماس خاں بھی گھبرا گیا۔

اس نے زندگی میں پہلی بار بیگم کو خوفزدہ اور آنسوؤں میں دیکھا تھا۔

"جہان خاں مجھے قتل کر دے گا"۔ بیگم چلائی اس کا نامہ اعمال اس کے سامنے تھا۔ "تم وقار بیگم کو لے جاؤ اور اس کے ڈیرہ پر پہنچا دو"۔

"یہ حضور کے خاندانی مرتبہ اور عزت کے منافی ہو گا"۔ طہماس خاں نے جواب دیا۔ "شہزادی کو اکیلے بھیجنا مناسب نہیں۔ مجھے امید ہے کہ افغان جرنیل حضور کی شان کے منافی کوئی حرکت کرے گا"۔

افغان دستہ کے سربراہ نے دروازے میں کھڑے میاں خوش فہم کو ڈانٹا۔ "بیگم حضور کو کہیں جلدی چلیں ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے"۔

کمرے کے اندر بیگم نے افغان کی ڈانٹ سن لی تھی مگر وہ جہان خان کے ڈیرے پر جانے کو تیار نہ تھی۔

طہماس خاں نے منت سماجت سے انہیں آمادہ کیا ایک رتھ منگوائی بیگم اور شہزادی کو اس پر بٹھا کر جہان خان کے ڈیرے کی طرف چل پڑے۔ افغان سوار رتھ کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔

میاں خوش فہم ڈیوڑھی میں چیخیں مار کر رو رہا تھا۔

بیگم اور شہزادی کو جہان خاں کے ڈیرے پر پہنچا کر طہماس خاں خیموں کی قطاروں سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔

افغان سرداروں، ان کے اہل خانہ اور فوجیوں کو دریا کے اس پار پہنچانے کے لئے راوی پر عارضی پل بنا دیا گیا تھا۔ سارا دن اور رات دستے روانہ ہوتے رہے۔ مغلانی بیگم اور وقار بیگم ایک خیمے میں خوفزدہ بیٹھی رہیں اور طہماس خاں ان کے مقدر کے لکھے کا انتظار کرتا رہا۔

سورج طلوع ہو چکا تھا، جب جہان خان اپنے حفاظتی دستہ کے ساتھ روانہ ہونے کو خیمے سے باہر آیا۔ اس نے دس سواروں کو حکم دیا کہ وہ بیگم صاحبہ اور وقار بیگم کو شہر پہنچا دیں۔

ایک سردار نے اپنے جرنیل کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا۔ "بیگم عالیہ ہماری واپسی کی راہ ہموار کریں گی۔ ان کی لاہور میں موجودگی لازم ہے"۔

بیگم اور وقار بیگم کو اسی رتھ میں بٹھا کر سوار شہر کی طرف لے چلے تو طہماس خاں بھی خفیہ ٹھکانے سے نکل کر ان کے ساتھ ہو گیا۔

بیگم کو قلعہ کے دروازے کے سامنے چھوڑ کر افغان سوار واپس پہنچے تو لشکر گاہ میں چند دستوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

بیگم کا رتھ قلعہ کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ قلعہ کا دروازہ بند تھا، وہاں نہ کوئی پہریدار تھا نہ ملازم اور نہ محافظ۔

بیگم نے رتھ کو اندرون شہر اپنی حویلی کی طرف لے جانے کا حکم دیا۔

لاہور کی گلیاں اور بازار سونے پڑے تھے، لوگ اپنے دروازے بند کر کے گھروں میں بند تھے اور جہان خاں کے امن کے نگران دستے شہر میں گھوم رہے تھے۔

رتھ والے کو فارغ کر کے بیگم نے حویلی کا دروازہ اندر سے بند کرا دیا اور طہماس خاں کو ڈیوڑھی کی ڈیوٹی سونپ دی۔

بیگم محسوس کر رہی تھی جیسے رات نیند میں اس نے کوئی خوفناک خواب دیکھا ہو جہان خاں کے ڈیرے پر گزاری رات اس کے لئے شاہ برج کے تہہ خانہ میں گزرے ہفتوں سے بھی زیادہ ڈراؤنی تھی۔

غروب آفتاب کے بعد شہر پر دھوئیں کے بادل چھا گئے۔ قلعہ سے اس پار آگ کے شعلے آسمان تک پہنچ رہے تھے۔ خوفزدہ لوگ مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر آگ کا طوفان دیکھنے لگے۔

افغان لشکر اور سرداروں کا جو سامان دریا سے پار نہیں جا سکا تھا جہان خاں کے حکم سے آخری دستہ روانہ ہونے سے پہلے اسے آگ لگا دی گیا تھا۔ ساری رات شعلے بلند ہوتے رہے اور شہر پر دھوئیں کے بادل چھائے رہے۔

***

صبح کی نماز کے بعد جب لوگ مسجدوں سے باہر آ رہے تھے تو آسمان اور زمین کے درمیان اب بھی دھوئیں کی چادر تنی تھی اور بازاروں میں ڈھنڈورچی اعلان کرتے پھر رہے تھے۔

"حضور عالیہ مغلانی بیگم نے لاہور کا انتظام اپنے مستحکم ہاتھوں لے لیا ہے اور حکم دیا ہے کہ شہر میں امن و امان قائم رکھا جائے۔ فریادی حضور عالیہ کے حضور ان کی حویلی میں فریادیں پیش کریں گے اور مفسد حضور کے غیض و غضب سے ڈر کر اپنے گھروں میں بند رہیں گے"۔

طہماس خاں سر پر کلغی سجائے خوبصورت گھوڑے پر سوار شہر کا چکر لگا رہا تھا۔ بیگم کے ملازموں کا دستہ اس کے ہمراہ تھا۔ بیگم نے اسے ناظم شہر مقرر کر دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ فوری طور پر شہر کے سب دروازے بند کر دیئے جائیں۔ پہریدار بھرتی کر کے فصیل کے برجوں میں بٹھا دیئے جائیں اور کسی کو اندر سے باہر جانے اور باہر سے شہر کے اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے۔

دوپہر تک امرائے شہر بیگم کے حضور حاضری کے لئے پیش ہونا شروع ہو گئے اور طہماس خاں شہر اور دروازوں کی حفاظت اور نگرانی کے لئے محافظ بھرتی کر کے انہیں ڈیوٹیاں سونپ چکا تھا۔

افغانوں نے دریا عبور کرنے کے بعد پل توڑ دیا اور سب کشتیاں اور ملاح شاہدرہ کی طرف روک کر ان پر محافظ مقرر کر دیئے۔ پنجاب پر ایک سال اور دو ماہ کی حکومت کے بعد تیمور شاہ شاہدرہ میں قندھار روانگی کے لئے سامان باندھ رہا تھا۔

امن عامہ کے افغان نگران قلعہ کے دروازے بند کر کے چابیاں اپنے ساتھ لے گئے تھے اور شہر کی فصیل کے اندر مغلانی بیگم کے راج کی واپسی کی خوشخبریاں سنائی جا رہی تھیں۔

ملاحوں کی بستی کی چوپال میں بوڑھا ملاح بچوں کے درمیان بیٹھا تھا جو اپنی اپنی کشتیوں اور والدین کی واپسی کے بارے میں مختلف سوال پوچھ رہے تھے۔ افغانوں کے اہل و عیال سامان اور فوج کو دریا کے پار پہنچانے سے ملاحوں نے اتنے پیسے کما لئے تھے کہ گندم کی کٹائی کے بعد کوئی بھی گندم نہ لائے تو ان کے چولہے گرم رہ سکتے تھے۔ بوڑھے کے لئے کشتیاں اور ملاح پار روک لینا کوئی نیا تجربہ نہ تھا مگر بچوں کی زندگی میں ایسا پہلا حادثہ گزرا تھا۔ انہوں نے رات بھر جاگ کر جھونپڑیوں سے تھوڑی دور اٹھتے شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ سب چوپال میں جمع تھے جہاں اکیلا بزرگ ان کے ڈھیروں سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

اہل شہر افسردہ اور پریشان تھے مگر مغلانی بیگم اس خیال سے بہت خوش تھی کہ اس نے افغانوں سے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا ہے۔

مغلانی بیگم شہر پر قبضہ مستحکم کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی اور شہر کے علماء کوچہ ڈوگراں سے متصل نیویں مسجد میں مشاورت کے لئے جمع تھے۔ شہر کی کرسی سے نیچے کھدی اس چھوٹی سی مسجد کے دروازے پر مسلح پہریدار متعین کر دیئے گئے تھے تاکہ کوئی ان کی مشاورت میں مداخلت نہ کر سکے۔ شاہی مسجد کے خطیب کی رائے تھی کہ شہر کے انتظام کے لئے شہریوں کی ایک کونسل قائم کر دی جائے اور مغلانی بیگم کو انتظامی امور سے بے دخل کر کے اس کی حویلی پر حفاظتی دستے متعین کر دیئے جائیں۔ بعض علماء نے اعلان جہاد کا مشورہ دیا مگر ملک سجاول نے ان سے اختلاف کیا اور بتایا کہ ایک دو روز میں آدینہ بیگ اپنے سکھ اور مرہٹہ اتحادیوں کے ہمراہ لاہور پہنچ جائے گا۔ اہل لاہور جہاد کے عادی نہیں وہ ان کی منظم اور اتنی بڑی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ [illegible] لاہور کی کونسل اس لئے غیر ضروری ہے کہ اس سے شہر میں تصادم کا خدشہ ہے ایک دو دن کے لئے کونسل قائم کرنا فساد اور تصادم مناسب نہیں۔

بعض علماء مغلانی بیگم کو کفار سے سازش کے جرم میں سزا دینے پر زور دے رہے تھے۔ ملک سجاول نے اس سے بھی اختلاف کیا۔ اس کا خیال تھا کہ کفار فوجوں کے حملہ کے وقت لاہور کے مسلمانوں کو اپنے اختلافات کو شدید نہیں کرنا چاہئے بلکہ اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ کرنا چاہئے تاکہ کفار ان کے ساتھ سرہند کے مسلمانوں جیسا سلوک نہ کریں۔

ملک سجاول شاہ ولی اللہ اور علمائے لاہور کے درمیان رابطے کا کام کرتے رہے تھے اس لئے علماء ان کی رائے کو وزن دیتے تھے مگر وہ سکھوں کے لاہور پر قبضہ سے خوفزدہ تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ سکھ جتھے دار سب سے پہلے لاہور پہنچ رہے ہیں۔ مرہٹے اور آدینہ بیگ ان سے کئی کوس پیچھے آ رہے ہیں۔

"ہم سکھوں کو کسی صورت شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے"۔ ملک سجاول نے فیصلہ سنایا۔

"ہمارے پاس انہیں روکنے کا کیا طریقہ ہے؟" شاہی مسجد کے خطیب نے پوچھا۔

"شہر کے دروازے اس وقت تک نہیں کھولے جائیں گے جب تک آدینہ بیگ یا اس کا وکیل بذات خود شہر اور راہالیان شہر کی سلامتی کی ضمانت نہ دے گا"۔ ملک سجاول نے کہا۔

"شہر کے دروازوں اور فصیل پر تو مغلانی بیگم کا قبضہ ہے"۔ ایک عالم نے کہا۔

"اگر ہم ان کا قبضہ ختم کرنے کی بجائے اس شرط پر مغلانی بیگم سے معاہدہ کر لیں تو وہ ہمارے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہوں گی۔ بیگم کو اپنی کمزوری کا احساس ہے وہ یہ سودے بازی پسند کرے گی"۔ ملک سجاول نے تجویز پیش کی۔

اتفاق ہو گیا کہ مغلانی بیگم سے تصادم کی ضرورت نہیں شہر کے انتظام کے لئے انہیں جو چاہیں کرنے دیں مگر انہیں تحریری طور پر آگاہ کر دیا جائے کہ شہر کے دروازوں کی چابیاں خود ان کے یا ملک سجاول کے پاس رہیں گی اور وہ اپنی مرضی سے کسی حملہ آور کے لئے دروازے نہیں کھول سکیں گی۔

مغلانی بیگم نے علماء کی یہ تجویز بخوشی مان لی، یہ اس کے اپنے منصوبہ کے مطابق تھی۔ اس طرح آدینہ بیگ کو وہ شہر کی غیر متنازعہ حکمران ہونے کا تاثر دے سکے

گی اور یہ بھی کہ اس نے دارالحکومت کو اس کے لئے سکھوں کے قبضہ میں جانے سے بچائے رکھا تھا۔

اسی شام شہر کے مشرقی افق پر سکھ دستے نمودار ہوئے سب سے پہلے جسا سنگھ کلال کے ایک دستہ نے دہلی دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ پہریداروں کے انکار پر سکھوں نے دروازے پر حملہ کر دیا۔ فصیل کے اوپر سے ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ رات شہر کو اپنی سیاہ آغوش میں لے رہی تھی۔ فصیل کے تمام برجوں میں مشعلیں روشن کر دی گئی تھیں اور مغلانی بیگم کے بھرتی کردہ آدمیوں کے علاوہ مسلمان نوجوانوں کو بھی فصیل پر چڑھا دیا گیا تھا کہ حملہ آوروں کو اندازہ ہو کہ اہل شہر لڑنے کے لئے تیار ہیں۔

جسا سنگھ لڑ کر شہر پر قبضہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس سے کشت خون کا خطرہ تھا اسے مرہٹوں کی ناراضگی کا بھی خوف تھا۔ سرہند میں مسلمانوں کا لوٹا ہوا سارا مال سکھوں کے اپنے پاس رکھ لینے سے مرہٹے اور سکھ فوجوں میں کشت وخون ہوا تو آدینہ بیگ نے بڑی مشکل سے انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا تھا اور سکھوں نے آئندہ مرہٹوں کے مفادات کا احترام کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔

جسا سنگھ نے دہلی دروازہ کے باہر ڈیرے ڈال دیئے رات بھر سکھ شہید گنج کے گرد ونواح میں لوٹ مار کرتے رہے اور شراب پی کر فصیل کے نیچے جمع ہو کر ناچتے اور اہل لاہور کو للکارتے رہے۔

شہر کے اندر کوئی مسلمان اس رات سویا نہیں، شہر کے دروازوں پر رضاکار دستے جمع کر دیئے گئے تھے اور علماء اور امرائے شہر دفاعی انتظامات کا جائزہ لیتے شہر کا چکر لگا رہے تھے۔

صبح کی نماز کے بعد ملک سجاول نو ین مسجد سے برآمد ہوئے اور ایک مسلح گروہ کے ساتھ دفاعی انتظامات کا جائزہ لینے چل پڑے۔ موچی دروازہ اور

شاہ عالمی دروازہ سے ہوتے ہوئے جب وہ دہلی دروازہ پہنچے تو انہیں مزید دستوں کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ فصیل پر چڑھ کر انہوں نے باہر کی صورت حال کا جائزہ لیا اور دروازہ کے پہریداروں کے کمانداروں کو تیار رہنے کا حکم دے کر نیچے اتر آئے۔ وہ ابھی وہیں کھڑے تھے کہ مغلانی بیگم کا نامزد ناظم لاہور طہماس خاں گھوڑے پر سوار سر پر کلغی سجائے اور ہتھیار لگائے وہاں پہنچ گیا اور بتایا کہ مغلانی بیگم نے دروازے کھولنے کے احکامات جاری کر دیے ہیں۔ نئے پہنچنے والے دستوں کے کماندار عاشور علی خاں نے بیگم کو خواجہ مرزا خاں کا جو مراسلہ بھجوایا تھا۔ بیگم نے اسے پڑھ کر دروازہ کھولنے کا حکم دیا ہے۔ خواجہ مرزا خاں جلد لاہور پہنچ رہے ہیں۔ دروازے کھلنے کے بعد عاشور علی خاں شہر میں داخل ہوں گے اور خواجہ مرزا خاں لاہور پہنچتے ہی مغلانی بیگم کے حضور پیش ہوں گے۔

ملک سجاول نے اسے دروازہ کھلوانے سے روک دیا۔ ''ہم خود بیگم صاحبہ بات کرنا چاہتے ہیں''۔

بیگم نے خواجہ مرزا خاں کا مراسلہ انہیں دکھایا اور بتایا کہ عاشور علی خاں کی قیادت میں مرہٹہ اور آدینہ بیگ کے سواروں کا دستہ شہر کا انتظام سنبھالنے آیا ہے۔

امرائے شہر مطمئن ہو گئے۔

شہر پر قبضہ کرنے والے دستہ میں پانچ صد مرہٹہ اور ایک صد آدینہ بیگ کے سوار شامل تھے اس طرح شاہجہان آباد کے بعد لاہور پر بھی عملاً مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ مہاراشٹر کے حکمران بالاجی راؤ پیشوا نے پورے ہندوستان پر ہندو راج کا جو خواب دیکھا تھا آدینہ بیگ اور مغلانی بیگم نے اس کی راہ ہموار کر دی تھی۔ مرہٹہ دستہ اپنے لشکر کے کماندار پیشوا کے بھائی رگھوناتھ راؤ کے لاہور میں داخلہ کے انتظامات مکمل کرنے کے لئے آیا تھا اور عاشور علی خاں کو شہر کے دروازے کھلوانے کے لئے ساتھ بھیجا گیا تھا۔

مرہٹوں نے جسا سنگھ کلال اور اس کے کسی سوار یا پیادہ کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیا۔ مرہٹہ سواروں اور سپاہیوں نے شہر کے کسی فرد سے کچھ نہیں کہا بیگم کو مرہٹوں کی بالادستی کا علم ہوا تو اس نے اپنے تمام ملازم واپس بلا لئے۔

***

ملک سجاول کے ساتھی اپنے گھوڑوں پر زینیں کس رہے تھے کہ طہماس خاں پہنچ گیا۔ ''بیگم حضور نے ملک صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے اور ان کے لئے مراسلہ ارسال فرمایا ہے''۔

''سردار موجود نہیں ہیں''۔ ان کے ساتھیوں نے جواب دیا۔

شہر کے دروازے کھلنے سے پہلے ہی ملک اپنے سواروں کے ساتھ شہر سے باہر نکل آئے تھے اور گاؤں واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے۔

''بیگم حضور نہایت اہم معاملہ میں سردار صاحب سے مشورہ کرنا چاہتی ہیں ان کی خواہش ہے کہ گاؤں جانے سے پہلے ملک صاحب ان سے لازماً ملیں''۔ طہماس خاں نے بتایا۔

''اپنی منحوس بیگم کا نام جپنے کی بجائے تمہارے لئے بہتر ہے کہ فوراً یہاں سے دفان ہو جاؤ ورنہ مجھے تمہیں حکم کی تعمیل کا طریقہ سکھانے کا حکم دینا پڑے گا''۔ سواروں میں سے ایک نے سختی سے کہا۔

طہماس خاں نے واپس جانے کے لئے گھوڑا موڑ لیا وہ اس جواب پر حیران تھا۔

ملک سجاول کو اطلاع دی گئی تو انہوں نے طہماس خاں کو واپس بلوا لیا بیگم کا مراسلہ کھول کر پڑھتے ہوئے وہ مسکراتے رہے۔ طہماس خاں ان کے انداز سے ان کے جواب کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''بیگم حضور کے

لئے مراسلہ لکھنے کی ضرورت ہے نہ وقت تم ہماری طرف سے اس نیک مشورہ کے لئے بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کر دینا"۔ ملک سجاول نے جواب دیا اور ساتھیوں کو گھوڑوں پر سوار ہونے کا حکم دے کر خود بھی سواری کی طرف چل پڑے۔ وہ بیگم کے تجربوں کی ہوشیاری پر حیران تھے۔

طہماس خاں اب بھی وہیں کھڑا تھا۔

بیگم نے پنجاب کے نئے حالات اور نئے حکمرانوں کے بارے میں مشورہ کرنے اور انہیں آدینہ بیگ کے دربار میں اہم جبدلانے کی پیشکش کی تھی ملک سجاول اس جال سے دور نکل گئے۔

وہ جاچکے تو طہماس خاں بھی واپس چل دیا۔

شہر کی گلیاں اور بازار ویران تھے، لوگ ایک بار پھر اپنے اپنے گھروں میں بند ہو گئے تھے۔ مرہندستوں کے شہر پر قبضہ سے ان کی وہ امیدیں ختم ہو گئی تھیں جو کچھ لوگ ولاتے رہے تھے کہ افغانوں کے بعد آدینہ بیگ آئے گا۔ آدینہ بیگ کے حامی اور ایجنٹ بھی کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ مرہٹہ سواروں کا کوئی دستہ بازار کے کسی سرے پر نمودار ہوتا تو اکا دکا آدمی بھی ذیلی گلیوں میں چھپ جاتے، شہر پر خوف کا سایہ تھا۔

***

لاہور کے کوچہ و بازار روشن تھے مگر ان میں چلنے والوں کے قدم ڈول رہے تھے جیسے گھپ اندھیرے میں چلے جا رہے ہوں اجنبی راستوں پر اجنبی منزل کے سفر پر رواں ہوں۔ روشن راستوں پر اندھی منزل کے یہ سب مسافر قلعہ کی طرف رواں دواں تھے۔ آج اہل لاہور مسلمان ہندو اور سکھ سب مرہٹہ جرنیل رگھوناتھ راؤ کے حضور اظہار اطاعت کرنے قلعہ جا رہے تھے۔ محمود غزنوی کے بعد سے صدیوں کے سفر میں مسلمانوں نے قلعہ میں حاضر ہو کر کسی غیر مسلم کی اطاعت کے لئے سر نہیں جھکائے تھے۔ ہندوؤں کے قدم تیز تھے ہلکے پھلکے تھے مسلمانوں کو قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا مگر اس جشن فتح پر اپنے گھروں کی چھتوں پر چراغ سب نے جلائے تھے۔ ہندوؤں نے بھی سکھوں نے بھی اور صدیوں تک حاکم رہنے والے مسلمانوں نے بھی یہ لاہور کے مرہٹہ ناظم اور پنجاب کے مرہٹہ فاتح کا حکم تھا جس کی خلاف ورزی کی کسی میں جرأت نہ تھی۔

مرہٹوں کو اس فتح کی ترغیب آدینہ بیگ نے دی تھی ان کی فوجی مہم کے اخراجات بھی اس نے ادا کئے تھے مگر حاکیت مرہٹوں کے حصہ میں آ گئی تھی۔ وہ سب سے طاقتور تھے اور حکمرانی طاقت کی ہوتی ہے۔ شاہجہان آباد کے تخت پر برائے نام مغل شہنشاہ کو برقرار رکھنا ان کی سیاسی مجبوری تھی مگر پنجاب اور لاہور میں ایسی کوئی مجبوری نہ تھی یہ خطہ اور شہر انہوں نے افغانوں سے چھینا تھا اس پر حکومت کرنا ان کا حق تھا۔

اس حق اور حاکیت کو تسلیم کرنے کے لئے شہر کے سب امراء اور شرفاء قلعہ کی طرف رواں دواں تھے۔

قلعہ کے ایوانوں دیوانوں برجوں اور فصیل پر چراغ جل رہے تھے۔ مغل شہنشاہوں کے دیوان عام میں مرہٹہ جرنیل کے لئے دربار عام کا اہتمام کیا گیا تھا۔ قلعہ کے دروازوں پر مرہٹہ حکام آنے والوں کا استقبال کر رہے تھے اور روشن راستوں پر چلتے ہوئے اہل لاہور دیوان عام میں بچھے فرشوں پر بیٹھتے جا رہے تھے۔ چوبدار نے سردار معظم رگھوناتھ راؤ کی آمد کا اعلان کیا تو سب حاضرین اپنے اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔ پچھلے دروازے سے رگھوناتھ راؤ درشنی جھروکہ میں نمودار ہوئے تو سب نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ اپنے سامنے دور تک نظریں جھکائے امراء شرفاء سرداروں اور جتھے داروں کو کھڑے دیکھ کر رگھوناتھ راؤ کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ہندوؤں کے مذہبی رہنماؤں نے جو جشن اس کے ذمہ لگایا تھا وہ تکمیل کو پہنچتا نظر آ رہا تھا، وہ تھوڑی دیر کھڑا دیکھتا رہا

اور پھر حاکمانہ شان سے بیٹھ گیا۔

چوبدار نے سردار معظم کے حضور احترام عقیدت سے اپنے اپنے مقام پر تشریف رکھنے کا حکم دیا تو سب بیٹھ گئے مگر بیشتر نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ مسلمان امراء میں بعض دیوان کی چھت اور محرابوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مرہٹہ فوج کے ساتھ آنے والے سب سے بڑے برہمن نے مرہٹہ روایت کے مطابق مذہبی رسومات ادا کر کے رگھوناتھ راؤ کے پیشوا کے نائب کی حیثیت سے حاکمیت سنبھالنے کا اعلان کیا تو سب نے ایک بار پھر کھڑے ہو کر اطاعت میں سر جھکا دیئے۔

اس کے بعد امراء شرفاء سرداروں اور جتھے داروں نے نئے حاکم کی فرمانبرداری کے ثبوت کے طور پر نذرانے پیش کرنا شروع کئے سب سے پہلے آدینہ بیگ خاں کی طرف سے نذرانہ پیش کیا گیا۔ مغلانی بیگم کی طرف سے طہماس خاں نے رگھوناتھ راؤ کے حضور نذرانہ پیش کیا۔

اس خوشی میں قلعہ کے اندر اور مرہٹہ لشکرگاہ میں رات بھر راگ رنگ کی محفلیں جاری رہیں۔

چند روز بعد آدینہ بیگ خان نے شالامار باغ میں نئے حاکم پنجاب کے اعزاز میں شاندار دعوت کا اہتمام کیا اس دعوت کے لئے شالامار باغ کی نہروں تالابوں اور روشوں کی صفائی اور باغ کی آرائش پر اس نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کیا تھا لاہور کی تاریخ میں مغلوں کے دور عروج کے بعد یہ سب سے شاندار دعوت تھی۔

حکومت پر قابض ہونے کے بعد مرہٹہ دستے سارے پنجاب میں پھیل گئے اور ایک ماہ کی مدت میں شمال مغرب میں اٹک تک انہوں نے اپنی حکومت اور ارادوں کو پھیلا دیا تھا۔ آدینہ بیگ سے ایک لاکھ روپیہ روزانہ ... کے حساب سے جمع کرنے کے بعد انہوں نے افغانوں کے ترکہ اور مسلمانوں کی املاک سے بھی بہت سا روپیہ اکٹھا کر لیا تھا۔

✽✽✽

سورج نے آنکھ کھولی تو مغلانی بیگم کی حویلی کے سامنے میدان میں گڈوں ریڑھوں اور رتھوں کی طویل قطاریں نظر آئیں جن پر مسلح دستے پہرہ دے رہے تھے۔ بیگم کے ملازم اور مزدور ان کی حویلی میں پون صدی سے جمع ساز و سامان نکال نکال ریڑھوں پر لاد رہے تھے۔ اسے ہمیشہ کے لئے لاہور چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا گیا تھا اور اس سفر کے لئے دو صد گڈے ریڑھے اور سوار فراہم کر کے ان کے قافلہ کی حفاظت کے لئے فوجی دستے بھی بھجوا دیئے تھے۔

بیگم نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ اسے ہمیشہ کے لئے لاہور چھوڑنا پڑے گا یہ حکم ملنے پر وہ بہت سٹ پٹائی اپنی خدمات اور اپنے خاندان کی نوازشوں کا ذکر کر کے اس شہر میں جہاں اس کے بیٹے خاوند اور ننھیال اور ددھیال کی کئی نسلوں کی قبریں اور مزار تھے رہائش کی اجازت چاہی مگر کسی نے اس کی منت سماجت کو قبول نہ کیا۔

لاہور میں ڈیڑھ ماہ کے قیام اور حکومت پر اپنا استحقاق مستحکم کرنے کے بعد مرہٹہ واپس دکن چلے گئے تھے اور اپنی سلطنت کے ایک صوبہ کی حیثیت سے پنجاب پون کروڑ روپیہ سالانہ کے ٹھیکہ پر آدینہ بیگ کو دے گئے تھے۔ آدینہ بیگ کا پنجاب کی حاکمیت کا خواب پورا ہو گیا تھا مگر مغل شہنشاہ یا بادشاہ قندھار کے صوبہ دار کی حیثیت سے نہیں مرہٹہ پیشوا بالا جی راؤ کے صوبیدار اور ماتحت کی حیثیت میں۔ سکھوں نے بھی لاہور اور پنجاب پر حاکمیت کا اپنا مقدمہ رگھوناتھ راؤ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اپنی خدمات اور مذہبی قربت کی دلیل بھی دی تھی مگر بولی میں

وہ آدینہ بیگ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ان کے پاس مرہٹوں کو دینے کے لئے اتنا روپیہ نہ تھا۔

رگھوناتھ نے پنجاب آدینہ بیگ کو ٹھیکے پر دے دیا اور لڑائی میں پکڑے افغان سپاہی اور قزلباش سکھوں کے حوالے کر دیئے مرہٹوں کو الوداع کہنے کے بعد آدینہ بیگ نے اپنے داماد خواجہ مرزا خان کو اپنا نائب حاکم مقرر کر دیا۔ طویل عرصہ تک لاہور سے دور رہنے کی وجہ سے وہ خود لاہور کی گرمی کا عادی نہ رہا تھا۔ جیٹھ کا مہینہ نصف سے زیادہ گزر چکا تھا۔ گرمی بڑھ رہی تھی اور وہ ٹھنڈے علاقہ میں واپس جانا چاہتا تھا لاہور کا نظم و نسق خواجہ مرزا خان کے سپرد کیا گیا تو اس نے مغلانی بیگم کو لاہور سے بالکل ہی بے دخل کر کے کہیں اور بھیج دینے کی شرط رکھ دی۔ وہ بیگم کی فطرت اور صلاحیتوں سے سب سے زیادہ آگاہ تھا۔ اس نے خدشہ ظاہر کیا کہ بیگم لاہور میں رہی تو اسے آرام سے حکومت نہیں کرنے دے گی اور وہ پنجاب میں نظم ریاست بحال نہیں کر سکے گا۔ بیگم کی چالوں اور سازشوں سے آگاہ آدینہ بیگ نے اپنے داماد کی یہ شرط قبول کر لی اور بیگم کو ساز و سامان کے ساتھ لاہور چھوڑ جانے کی سب سہولتیں فراہم کر دیں۔

سامان لادا جا چکا تھا تو خواجہ مرزا خان کے ایک اہلکار نے بیگم کی قلعہ نما حویلی کو تالا لگا کر دروازے پر فوجی دستہ بٹھا دیا۔

قافلہ روانگی کے لئے تیار کھڑا تھا، سب خدام اور ملازمین سوار ہو چکے تھے لیکن بیگم ابھی موجود نہ تھی ہمیشہ کے لئے لاہور چھوڑنے سے پہلے وہ اپنے بیٹے خاوند اور عزیزوں کی قبروں اور مزاروں پر حاضری دینے گئی تھی اور ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ محافظ دستہ کے کمانداربڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے وہ کبھی سورج کی طرف دیکھتے اور کبھی اس راستہ کی طرف جدھر سے بیگم کی سواری آ رہی تھی۔ رات کی تاریکی گہری ہونے سے پہلے پہلے انہیں لاہور سے چھ کوس کے فاصلہ پر آدینہ بیگ کی لشکر گاہ میں پہنچنا تھا۔ آخر ایک دستہ بیگم کو واپس لانے کے لئے بھیجا گیا اور حکم دیا گیا کہ بیگم جہاں بھی ہو اسے فوراً واپس لایا جائے۔ دہلی دروازہ کے باہر مدرسہ معین الملک کے عقب میں انہیں بیگم کے ساتھ آنے والے دستہ کے گھوڑے نظر آئے۔ آگے گئے تو باغ کے مرکز میں ٹوٹی پھوٹی ایک عمارت میں اینٹوں کے ڈھیر پر مغلانی بیگم گم صم بیٹھی تھی۔ دستہ کے کماندار نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور قافلہ کی تیاری اور کماندار کے حکم سے آگاہ کیا تو بیگم نے خواب سے اچانک بیدار ہو جانے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

"یہ کس لئے دعا مانگ رہی ہے؟" حکم پہنچانے والے نے چاروں طرف بکھری اینٹوں کی طرف دیکھ کر جیسے اپنے آپ سے پوچھا ہو مگر کوئی جواب نہ ملا اس نے اپنے ساتھیوں کو سواری لانے کا حکم دے کر بیگم کو یاد دلایا کہ وہ اسے لینے آئے ہیں اور اسے دعا ختم کر دینا چاہئے۔

بیگم نے دعا ختم کر دی اور آہستہ آہستہ سر جھکائے اپنی سواری کی طرف چل دی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا، اینٹوں کے ڈھیر سے خاک اڑ کر اس کے سر منہ اور لباس پر گرنے لگی، اس نے خاک سے بچنے یا منہ ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی۔

بیگم کے خدام بھی افسردہ تھے، سر منہ اور آنکھوں میں خاک پڑنے سے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ زندہ نہیں، بے روح جسم ہو۔ سواری چلی تو تھوڑی دور جا کر وہ پھر رک گئی۔ ایک بار پھر اینٹوں کے ڈھیر کی طرف دیکھنے لگی حکم لانے والے کے ذہن میں تجسس بڑھ گیا۔ اس نے ملھماس خاں سے ان اینٹوں کے ڈھیر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بھی آنکھیں جھکا دیں۔

قلعہ نما حویلیوں، باغوں اور مزاروں کے درمیان سے ہو کر گزرتی سڑک پر بیگم کی سواری بیگم پورہ کی طرف جارہی تھی۔ اس سڑک پر جس پر سے جب اسے گزرنا ہوتا تو دونوں طرف مسلح سوار اور مؤدب خدام قطاریں باندھے کھڑے ہوتے تھے۔ مگر آج سڑک پر کوئی سوار آتا جاتا بھی جاتا تو خاموشی سے گزر جاتا کسی کو علم تک نہ تھا یہ مغلانی بیگم کی سواری ہے۔

بیگم پورہ پہنچ کر اس نے حسرت بھری نگاہوں سے حویلی کی طرف دیکھا جس کے بھاری کواڑ اس پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے اور دروازے میں بھاری تالا ڈال دیا گیا تھا۔

دستے کے کمانڈار نے روانگی کا حکم دیا اس نے بھی اپنی سواری کا رخ نئی منزل کی طرف موڑ دیا۔ گڈوں ریڑھوں اور رتھوں کا قافلہ پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا۔

آدینہ بیگ کی لشکرگاہ میں بیگم کے لئے الگ خیمہ بستی تیار تھی اس کے پہنچتے ہی آدینہ بیگ کے حکام اور خدام خدمت کے لئے حاضر ہو گئے۔

جیٹھ کی گرم رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مگر بیگم ابھی تک جاگ رہی تھی۔ خیمے کے ایک کونے میں شمع دان پر جنگلی پروانے خود سوزی کی رسم ادا کر رہے تھے گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے وہ کافی دیر تک پروانوں کو جل جل کر گرتے اور گر گر کر مرتے دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر خیمے سے باہر آ گئی۔ نیلے آسمان کی چادر کے نیچے جس پر سنہری ستارے جگمگا رہے تھے پہرہ دینے والوں اور ان کے گھوڑوں کے سموں کی آواز سے سکوت شب کا تقدس پامال ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دور آدینہ بیگ کے ڈیرے کے پاس اونچے بانس کے آخری سرے پر روشن شمع کو دیکھنے لگی۔ حاکمیت کی روشن شمع جو کبھی اس کے خیمے کے پاس روشن رہا کرتی تھی اور پھر ایک رات [illegible] بجھ گئی تھی [illegible] رات خواجہ

مرزا خاں اس کا ایک ادنیٰ خادم تھا جو دور دیس سے تین صد ازبک سواروں کے ہمراہ سکھوں کے خلاف جہاد کرنے نیا نیا پنجاب آیا تھا اور ہر خدمت کے لئے دست بستہ حاضر رہا کرتا تھا اور آج حاکم محکوم تھا اور خواجہ مرزا خان حاکم جس کے حکم پر کل کے حاکم کو اپنا آبائی شہر چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس کے مقدر میں ابھی کیا کچھ لکھا ہے وہ سوچنے لگی۔ اس کا داماد آج بھی شاہجہان آباد میں سلطنت مغلیہ کا وزیر اعظم ہے۔ مرہٹوں کا دوست اور ساتھی ہے اس کے داماد کے دوست اور ساتھی پنجاب آدینہ بیگ خان کو ٹھیکے پر دے گئے۔ گرفتار شدہ قزلباش سکھوں کے سپرد کر گئے اور اسے آدینہ بیگ اور خواجہ مرزا خاں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے اس نے آدینہ بیگ کو لاہور پر قبضہ کی دعوت دے کر غلطی تو نہ کی تھی۔ جہان خان اور تیمور شاہ بھی اس کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتے تھے؟ وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب ستاروں میں ڈھونڈ رہی تھی مگر ستارے مسکرا رہے تھے۔ اگر جہان خان اور تیمور شاہ لاہور خالی نہ کرتے تو جسا سنگھ کو میر منو کی قبر کھود کر مزار کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا کبھی موقعہ نہ ملتا۔ اس کے دل نے کہا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا گرد اڑنے لگی اس نے سر ڈھانپ لیا۔ میر منو کی قبر کی اینٹوں کے ڈھیر سے پڑی گرد ابھی تک باقی تھی۔ ڈیرے کے پہریداروں نے اسے خیمے سے باہر کھڑے دیکھا اور منہ پھیر کر آگے نکل گئے۔ انہیں آداب عرض کر کے معلوم کرنا چاہئے تھا کہ ڈیرے کی مالکہ رات کے اس حصہ میں خیمے سے باہر کیوں کھڑی ہے مگر انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی یا پھر انہیں بھی بیگم کی حالت کے بارے میں بتا دیا گیا ہوگا۔ ہوا تیز چلنے لگی تو آنکھوں اور سر میں مزید گرد پڑنے کے خوف سے وہ جلدی سے خیمے میں واپس آ گئی پروانے اب بھی خود سوزی کے لئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے

کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ مسکرائی۔ ''میرے بعد آدینہ بیگ کی باری ہوگی یا شاید خواجہ مرزا خان کی''۔

بستر پر لیٹ کر وہ سر اور منہ صاف کرنے لگی، اسے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ میر منو کے مزار کے کھنڈرات کی گرد اس کے ریشمی بالوں میں جم گئی ہے۔

آدینہ بیگ کا لشکر گرودے چک کے نواح میں خیمہ زن تھا۔ مرہٹہ سرداروں نے لاہور سے واپس جاتے ہوئے سکھوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے مقدس مقامات پر حاضری دی تھی۔ سکھ آدینہ بیگ کے پرانے ساتھی تھے مگر پنجاب پر اس کی حاکمیت سے ناراض تھے۔ اس کی خواہش کے باوجود ان کا کوئی جتھے دار اس کے حضور حاضری دینے نہیں آیا تھا وہ انہیں خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بھی ان کے گوردوارے میں حاضری کا فیصلہ کر لیا اور ایک صبح اپنے سرداروں اور محافظوں کے ہمراہ گوردوارہ پہنچ گیا۔ نئے حاکم پنجاب کی آمد پر گرنتھی کچھ پریشان سے ہو گئے۔ آدینہ بیگ مسلمان تھا آدینہ بیگ نے ان کی پریشانی کا اندازہ کر لیا تھا۔ نذرانہ پیش کر کے اس نے گوردوارہ کے مقدس تالابوں کی صفائی کے لئے رقم دینے کی پیشکش کی تاکہ سکھ یاتری پھر سے اشنان شروع کر سکیں۔ بڑے گرنتھی نے اسے افغانوں کے مظالم کے بارے میں بتایا اور تالابوں کی صفائی کا کام دکھانے لے گیا۔ پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس سینکڑوں قزلباش اور افغان سپاہی اور سردار مٹی کھودنے اور اٹھا اٹھا کر باہر لانے میں مصروف تھے اور ان کے چاروں طرف لٹھ بردار سکھ چیختے نگرانی کر رہے تھے۔ اگر کوئی مٹی کھودنے یا اٹھا کر لانے میں ذرا سی سستی دکھاتا تو نگران اسے پیٹ پیٹ کر لہولہان کر دیتے۔ آدینہ بیگ جدھر سے گزرتا مٹی کھودنے والے اسے سلام کرتے مگر اس نے کسی کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا ہوا آگے چلتا رہا۔ آدینہ بیگ جب کسی منصوبے پر غور کرتا تو وہ داڑھی میں انگلیوں سے حرکت پیدا کیا کرتا تھا۔ افغانوں اور قزلباشوں کو اس حالت میں دیکھ کر اسے کوئی دکھ یا افسوس نہیں ہوا۔ سرہند میں مسلمانوں اور افغانوں کا سکھوں کے ہاتھوں وہ اس سے برا انجام دیکھ چکا تھا اسے یہ تشویش تھی کہ سکھوں اور ان کے مذہبی رہنماؤں نے اس کا احترام نہیں کیا اس کی حاکمیت کا مذاق اڑا کر اس کی توہین کی ہے۔

آدینہ بیگ کے خوابوں کی ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی وہ پنجاب کا حاکم تو تھا مگر اتنا مضبوط اور مستحکم حاکم نہیں تھا۔ جتنا وہ مضبوط اور مستحکم دوآبہ جالندھر کا ناظم ہوا کرتا تھا۔ وہ پنجاب میں امن وامان قائم کر کے ایک طاقتور اور خوشحال حاکم بننا چاہتا تھا تاکہ شاہجہان آباد اور قندھار کبھی اسے بے دخل کرنے کا سوچ بھی نہ سکیں اس کے لئے سکھوں کی شورش کو دبانا لازم تھا جس فتنہ کو اس نے خود پھیلایا اور بڑھایا تھا اب خود ہی اسے ختم کر دینا چاہتا تھا بٹالہ پہنچ کر اس نے سکھوں کے خلاف منصوبہ بندی شروع کر دی۔

مغلانی بیگم کے لئے شہر میں ایک خوبصورت قلعہ نما حویلی فراہم کر دی گئی تھی نگران کی صاحبزادی اور ملازمین کو حویلی میں بھیج کر اس نے بیگم کو لشکر گاہ میں روک لیا تھا تاکہ اس کے میل ملاپ اور نقل وحرکت پر نگرانی رکھ سکے۔ آدینہ بیگ نے وہ تمام ہیرے جواہرات بھی بیگم کو واپس کر دیئے جو اس نے جہان خان کو مالیہ کی قسط ادا کرنے کے لئے اسے بھیجے تھے اور اپنے خزانہ سے اس کے لئے دو ہزار روپیہ ماہانہ اور اس کے گھریلو اخراجات کے لئے پچاس روپے روزینہ مقرر کر دیا۔ بیگم کے تمام ملازمین کو سواریاں فراہم کر کے ان کے مشاہرے مقرر کر دیئے۔ وہ مغلانی بیگم کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ بیگم اس کے مقاصد کو جانتی اور سمجھتی تھی کہ اس پر حویلی کی بجائے لشکر گاہ میں

قیام کرنے کی پابندی کیوں لگائی گئی ہے۔ وہ آدینہ بیگ کی نوازشات کے باوجود خوش نہیں تھی۔

آدینہ بیگ دارالحکومت اور سکھوں کی قوت کے مراکز سے قریب رہنا چاہتا تھا۔ اس نے پہاڑوں کے دامن میں ایک نیا شہر آدینہ نگر آباد کرنے کا حکم دیا اور خود بٹالہ میں بیٹھ کر حالات کی نگرانی کرنے لگا۔ پنجاب کے شمال مشرق میں بٹالہ ایک اہم انتظامی اور علمی مرکز رہا ہے۔ زمین کی زرخیزی اور خوشگوار آب و ہوا کی وجہ سے بٹالہ لاہور کے مغل امراء اور درباریوں کا پسندیدہ شہر ہوا کرتا تھا ان کی جاگیریں زیادہ تر بٹالہ کے گردونواح میں تھیں۔ لاہور کے شمال اور مغرب میں مغل اور ترک امراء کی مشکل سے ہی کوئی جاگیر یا بستی ملتی تھی۔ لاہور سے سرہند اور دوآبہ جالندھر کو جانے والے راستے بٹالہ میں ملتے تھے۔ شمال مغرب میں جموں سیالکوٹ اور لاہور کے اوپر سے دریائے راوی عبور کر کے وزیر آباد اور آگے پشاور کو جانے والے راستے بھی یہاں آ کر مل جاتے تھے۔ سکھوں کی شورش کے مراکز امرتسر کرتار پور ایمن آباد اور گوجرانوالہ پر وہاں سے نگاہ رکھنا آسان تھا۔ آدینہ بیگ نے بٹالہ کے اہم مرکز میں بیٹھ کر نئی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

پنجاب میں دو ہی قوتیں رہ گئی تھیں سکھ اور وہ خود سکھوں کی چالوں اور گوریلا جنگ کے طریقوں اور مراکز سے اس سے زیادہ کوئی اور واقف نہ تھا۔ پنجاب سے باہر شمال مغرب میں ابدالی تھا اور شاہجہان آباد میں عمادالملک۔ آدینہ بیگ کے مرہٹہ سرپرست بھی تھے مگر وہ دور تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر شاہجہان آباد اور قندھار اس کے خلاف فوج کشی نہ کریں تو وہ سکھوں کو دبا کر پنجاب میں امن بحال کر دے گا۔ پنجاب میں امن بحال ہو جانے سے شاہجہان آباد کے تخت پر بیٹھا نام نہاد مغل شہنشاہ اور اس کا وزیراعظم عمادالملک اس سے اچھے تعلقات قائم رکھنا پسند کریں گے۔ احمد شاہ ابدالی کو بھی سکھوں کی شورش کے نام پر پنجاب پر فوج کشی کی ضرورت نہیں رہے گی اور مسلمان علماء ابدالی کو مراسلے بھیجنے کی بجائے آدینہ بیگ کی حمایت شروع کر دیں گے۔

اس منصوبے میں ایک ہی کمزور کڑی تھی اور وہ تھی مغلانی بیگم جو عمادالملک کی خوشدامن اور احمد شاہ ابدالی کی منہ بولی بیٹی تھی اور اس میں اتنی صلاحیت تھی کہ اپنی ماضی کی تمام تر کمزوریوں اور غلطیوں کے باوجود ان دونوں میں سے کسی کو مداخلت پر آمادہ کر لے۔

"ہم چاہتے ہیں کہ مغلانی بیگم پر نگرانی سخت کر دی جائے"۔ آدینہ بیگ نے اپنے فوجدار صدیق خاں کو ایک روز ہدایت کی۔

"حضور کا ارشاد خادم کے لئے ہمیشہ راہنما اصول رہا ہے اگر حضور گستاخی کے لئے معاف فرما دیں تو خادم عرض کرنے کی جرأت کرے گا کہ بیگم کی حیثیت پنجرے میں قید پر کٹے پرندہ سے زیادہ نہیں رہی"۔ صدیق خاں نے کہا۔ "اس کی بجائے ہمیں سکھوں کے خلاف جلد مہم شروع کرنے پر توجہ دینا چاہئے"۔

آدینہ بیگ نے صدیق خاں کی بات بڑے اطمینان سے سنی اور داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "پنجرے میں نہیں بیگم ہمارے سنہری پنجرے میں بند ہے لیکن یہ کبھی نہ بھولیں کہ وہ پر کٹا پرندہ نہیں زخمی ناگن ہے اور سانپ دودھ پلانے والے کا بھی دوست نہیں ہوتا"۔

صدیق خاں نے اندازہ کیا کہ آدینہ بیگ کی فراست سے اختلاف کی اس میں سوجھ بوجھ نہیں۔ "خادم کا فہم معاملات کی اس گہرائی کو سمجھنے میں ہمیشہ خام رہا خادم شرمندہ ہے وہ بیگم کی نگرانی میں کوتاہی نہ ہونے دے گا"۔

"صدیق خاں! یہ جان لینے کے بعد کہ بیگم زخمی

ناگن ہے۔ یہ اندازہ کرو کہ وہ کیسے ڈس سکتی ہے"۔ آدینہ بیگ نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور اسے اس سے کیسے باز رکھا جا سکتا ہے؟"

"خادم آج ہی اس کے ڈیرے پر نگرانی سخت کر دے گا"۔ صدیق خاں نے آدینہ بیگ کی بات پر توجہ دیتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیا۔

"صدیق خان! پہرہ کافی نہیں اس کے با اعتماد ملازمین کو اعتماد میں لینے کا بندوبست کرو جن کے ذریعے وہ باہر رابطہ کر سکتی ہے اور جن کے ذریعے تم اس کی سوچ اور منصوبوں سے آگاہی حاصل کر سکتے ہو"۔

"حضور عالی کے حکم کی تعمیل میں خادم نے کبھی کوتاہی نہیں کی"۔ صدیق خاں نے عرض کیا۔

"بیگم کے ملازمین میں طہماس خاں سب سے ہوشیار ہے اس کو اعتماد میں لینے کا اہتمام کرو"۔

خادم حضور کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی پوری کوشش کرے گا"۔ صدیق خاں نے آدینہ بیگ کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرنے کا عادی تھا۔

"صدیق خان! یہ جان لو کہ طہماس خان غلام بچہ ہے اور اس کے دل میں دقو کے پاس ہی کہیں آزادی اور ترقی کی خواہش بھی موجود ہو گی اس کا اندازہ کرو اور اسے پورا کرنے کا یقین دلاؤ"۔ آدینہ بیگ نے صدیق خاں کو طہماس خاں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا نسخہ سمجھا دیا۔

صدیق خاں نے مرعوبیت سے ایک دفعہ پھر سر جھکا دیا۔

"حکمرانوں اور امراء کے گھریلو ملازموں کے درمیان رقابت اور حسد کا ایک غیر محسوس جذبہ موجود ہوتا اس کو کام میں لاؤ"۔ آدینہ بیگ نے ہدایت کی۔

صدیق خاں کے لئے یہ ہدایات بڑی واضح تھیں ان پر عمل اس کے لئے مشکل نہ تھا پھر بھی اس نے آدینہ بیگ کی خوشامد ضروری سمجھی۔ "امراء کے زنان خانہ کے خدام کی فطرت اور خواہشات کا جتنا علم حضور کو ہے کہیں اور نظر نہیں آیا خادم حضور کی ہدایات سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے ضرور کامیاب ہو گا"۔

مغلانی بیگم کے پرانے ملازمین میں سے شہباز خاں طہماس خان، عاقل خان اور خواجہ سراؤں کے علاوہ کوئی اس کے ساتھ نہ رہا تھا۔ سرفراز خاں کو جہان خان قید سے اپنے ہمراہ قندھار لے گیا تھا لشکرگاہ سے باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ انہی ملازمین کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ شہباز خان شہر جاتا اور گلیوں اور بازاروں کی افواہیں اگر اسے پیش کر دیتا جن کے تجزیہ سے بیگم پنجاب کے حالات کا اندازہ لگاتی تھی جب اسے خواجہ مرزا خاں اور اس کے بھائی خواجہ سعید کی ایمن آباد اور گوجرانوالہ کے نواح میں سکھوں کے خلاف کامیاب مہمات کی اطلاعات موصول ہونے لگیں تو اسے خوشی ہوئی۔

"جہان کی فوجوں کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں"۔ ایک شام اس نے شہباز خاں سے شہر کی تازہ ترین خبریں سن کر پوچھا۔

"افغانوں کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہیں سب لوگ نواب آدینہ بیگ کی کامیابی کی دعائیں کرتے ہیں"۔ شہباز خاں بیگم کے سوال کی گہرائی کو نہ پہنچ سکا۔

"یہ آدینہ بیگ کی کامیابی نہیں، ناکامی ہے"۔ بیگم نے غیر ارادی طور پر کہہ دیا۔ "اب افغان آئے تو آدینہ بیگ اکیلا ہو گا"۔

"افغان پھر آئیں گے حضور؟" شہباز خان نے حیرانی سے پوچھا۔

"بادشاہ معظم اپنے بیٹے اور جرنیل کی شکست اور پنجاب پر قبضہ پر خاموش نہیں رہ سکتے"۔ بیگم کے دل میں جو خیالات جمع ہوتے رہے تھے وہ کسی سے ان کا اظہار

کرنا چاہتی تھی اور اظہار کے لئے اب شہباز خاں ہی رہ گیا تھا۔

طہماس خان آدینہ بیگ کے دیئے اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سواری کرنے لگا تھا۔ وہ کلغی والی ٹوپی پہنتا اور صدیق خان کے فوجی سرداروں سے میل ملاپ میں مصروف رہتا تھا۔ بیگم اس سے خوش نہیں تھی اس لئے راز کی بات صرف شہباز خاں سے کر سکتی تھی۔

بیگم کی اس بات پر خوش ہونا چاہئے یا افسوس کا اظہار کرنا چاہئے شہباز خاں کچھ فیصلہ نہ کر سکا اس کے اپنے خیال میں آدینہ بیگ جہان خان اور افغانوں کے مقابلہ میں ان کے لئے بہت بہتر تھا اور کفار کو بھی دبا رہا تھا۔ وہ آداب عرض کر کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔

***

ریاست جموں کے مشرق میں چھوٹی چھوٹی پہاڑی ریاستوں کے راجواڑے ہمیشہ طاقتور کو سلام کر کے اپنی حفاظت کا بندوبست کیا کرتے تھے۔ آدینہ بیگ لشکر لے کر ان سے اطاعت اور فرمانبرداری کی ضمانت حاصل کرنے نکلا اور طوفانی دورہ کر کے واپس بٹالہ آ گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں بیگم لشکر گاہ سے چند روز کے لئے حویلی منتقل ہو گئی تھی۔ وہ لشکر کی واپسی کی خبر سن کر ڈیرے پر واپس آ گئی لیکن اگلے ہی روز لشکر گاہ میں طہماس خاں کے قتل کی افواہ پھیل گئی۔ آدینہ بیگ کے لئے بیگم کا اپنے کسی ملازم کو جان سے مروا دینا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم کے خلاف کوئی کارروائی کرنا اس کے بس میں نہیں لیکن بیگم نے طہماس خاں جیسے وفادار ملازم کو اتنی سخت سزا کیوں دی۔ اس نے اپنے مخبروں کو اس کا پتہ کرنے کا حکم دے دیا تھا مگر اپنی پرانی خادمہ طہماس خاں کی بیوی گل بنفشہ کی منت سماجت پر اس کی جان بخشی تو کر دی مگر قید میں اب بھی

[illegible]

کئی روز تک آدینہ بیگ نے اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی اس کا خیال تھا کہ بیگم کا غصہ کم ہو گیا تو وہ خود ہی اسے رہا کر دے گی لیکن جب اس کے مخبروں نے خبر دی کہ بیگم کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا اور قید میں طہماس خاں پر سختیاں جاری ہیں تو اس نے صدیق خان کو بلا کر بیگم تک اپنی ناراضگی پہنچانے کا حکم دیا مگر صدیق خان کے پیغام اور اظہار ناراضگی پہنچانے کے باوجود بیگم نے اسے رہا نہیں کیا۔

''ہم اپنے گھریلو معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے''۔

صدیق خان چپکے سے واپس چلا آیا۔ اسے کسی صوبہ کے حاکم اور پرگنہ کے ناظم نے بھی کبھی اس انداز میں جواب نہیں دیا تھا۔

دو ہفتے بعد بیگم نے گل بنفشہ کی درخواست پر طہماس خان کو قید سے رہائی دی۔ وہ اپنے ملازمین کو سمجھانا چاہتی تھی کہ آدینہ بیگ یا اس کا کوئی نائب انہیں تحفظ نہیں دے سکتا اب بھی وہی ان کی زندگی اور خوش حالی کی مالک ہیں۔

اس واقعہ کے بعد اس کے سب ملازمین کسی اور سے ملتے ہوئے خوف کھانے لگے۔ طہماس خان کا جرم یہی تھا، صدیق خان اور اس کے سرداروں سے بیگم کی منشاء کے خلاف میل جول رکھنا۔

قید سے رہائی کا حکم دینے کے بعد بیگم نے طہماس خان کو اپنے ڈیرے پر بلایا اور چار صد روپیہ عطا کر کے حکم دیا کہ وہ اپنے لئے شاندار لباس اور جیغہ و کلغی خریدے اور پہن کر بازار اور لشکر گاہ میں نکلا کرے۔

آدینہ بیگ نے اس پر نگرانی سخت کر دی تھی اور طہماس خان اب صدیق خان اور اس کے سرداروں سے ملتے ہوئے خوف کھانے لگا تھا۔

(جاری ہے)

طب وصحت

دستِ شفاء

تندرستی ہزار نعمت

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ایچ۔ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرا میڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبہ طب ونفسیات

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے اور اس بارے میں اکثر و بیشتر مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں مگر اس مضمون میں ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کو چند نہایت ہی قیمتی اور نایاب معلومات ضرور ملیں گی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ تندرستی بے بہا نعمت ہے۔ یہ بات کتنی درست ہے کسی ''سدا بیمار'' سے پوچھیں۔ یوں تو سب اعضاء جسمانی اپنی اپنی جگہ ایک بے بہا نعمت ہے مگر میرے خیال میں آنکھوں کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے۔ اس وجہ سے کہ ہمیں روزمرہ کے کاموں میں گائیڈ کرنے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے میرے اس مضمون کا زیادہ حصہ اسی بارے میں ہے۔ تو سب سے پہلے آنکھوں کی حفاظت کے بارے میں چند اہم پوائنٹس حاضر خدمت ہیں۔

(1) کبھی کم روشنی میں مطالعہ نہ کریں۔ (2) جوں ہی آنکھیں جھکنے لگیں فوراً آرام کے لئے آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیں۔ (3) زیادہ باریک لکھائی پڑھنے سے بھی پرہیز کریں۔ (4) آنکھوں کو گاہے بگاہے کسی ماہر ڈاکٹر سے چیک کرواتے رہیں۔ (5) اگر پڑھتے یا چلتے وقت چکر آئیں، الفاظ یا اشیاء صاف نظر نہ آئیں تو فوراً نظر ٹیسٹ کروا کر ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق عمل کریں۔ (6) بازاری یا نیم حکیمانہ ادویات خصوصاً بسوں وغیرہ میں بکنے والی ادویات کو ہرگز استعمال نہ کریں کیونکہ یہ کسی فارمولے یا چیکنگ کے بغیر ہی بنائی اور استعمال کرائی جاتی ہیں۔ (7) آنکھیں ایک انتہائی حساس اور اہم عضو ہیں اس لئے ان میں کبھی بھی کوئی تیز یا مضرت رساں اشیاء

ہرگز نہ ڈالیں ورنہ عمر بھر کی معذوری بھی مل سکتی ہے۔ کبھی ان کاروباری اور اَن ٹرینڈ اور غیر پیشہ ور لوگوں کے ساتھ بے وقوف نہ بنیں ورنہ ساری عمر پچھتاتے رہیں گے۔ اس ضمن میں میں آپ کو اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں۔

جب میں چھوٹا تھا ابھی پانچویں کلاس کا سٹوڈنٹ تھا صحت شروع سے بہت اچھی تھی۔ اچانک ایک دن آنکھوں میں خارش ہوئی۔ کسی نے کوئی مشورہ دیا کسی نے کچھ عجیب عجیب فارمولے بتائے۔ کوئی کسی بس سے کوئی سرمہ خرید کر لا رہا ہے۔ اس طرح ایک سال یہی تماشا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ میرے پاس رنگ برنگے سرموں کی شیشیوں کا ایک پورا ڈبا بھر گیا۔ کم از کم تین درجن تو ہوں گے۔ مگر ایک رتی بھر آرام نہ آیا۔ حتیٰ کہ نظر بھی خاصی خراب ہوگئی۔ آخر کار ایک روز میرے ایک رشتہ دار مجھے آنکھوں کے ایک معروف ڈاکٹر محترم میجر (R) فاروقی صاحب کے پاس لے گئے جو کہ اس وقت ڈسٹرکٹ ہسپتال گوجرہ کے M.S انچارج بھی تھے۔ اس وقت پورے پنجاب میں ان کا چرچا تھا اور بہت دور دراز سے ان کے پاس آنکھوں کے مریض آتے اور شفایاب ہوتے۔ اس کے علاوہ دوسرے مریض بھی ضد کر کے انہیں ہی دکھاتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نیک صفت ڈاکٹر کے ہاتھ میں بڑی شفا رکھی تھی۔ وہ دن رات کام میں مصروف رہتے آپریشن بھی کرتے۔ ذاتی پریکٹس نہیں کرتے تھے۔

انہوں نے دیکھ کر کہا کہ ”آنکھوں میں ککرے ہیں۔ آپ بہت لیٹ آئے ہیں۔ اب دوا کے ساتھ شیشے بھی لگانے پڑیں گے“۔ بہرحال علاج ہوا اور پھر عینک میری زندگی کا ایک حصہ بن گئی۔ جس کے نمبر ہر دو سال کے بعد تبدیل ہوتے رہے۔ تاہم میں نے اس کو معذوری نہ بنایا (یاد رہے کہ اس وقت لینز وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ عینک کو سنبھالنا اور بارش میں استعمال کرنا بھی بذات خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تاہم مجبوری میں یہ سب کرنا پڑتا ہے)۔

اب میں آپ کو ککروں کے ہومیو پیتھک علاج سے ایک دو واقعات بھی سنا دیتا ہوں۔ میں ایک بار PAF ہسپتال لوئر ٹوپہ (مری) میں بھائی کی عیادت کے لئے گیا تو وہاں سٹور انچارج آ گیا اس کی آنکھیں بہت سوجی ہوئی تھیں اور پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا ہے مگر کوئی رزلٹ نہیں۔ ککرے ٹھیک نہیں ہو رہے۔ میں نے کہا کہ صرف میرے ایک سوال کا جواب دے دیں وہ یہ کہ کیا آنکھوں کو ٹھنڈے پانی سے سکون آتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں آتا ہے۔ میں نے فیصل آباد جا کر اس کو ایک ماہ کی دوائی بھیج دی اور وہ اس سے بالکل ٹھیک ہوگیا۔ اس کے بعد وہ میرے بھائی کا بہت احسان مند ہوگیا۔ میں نے اس دوا کو بار بار آزمایا ہے اور کامیاب پایا۔ زیادہ ادویات اور علامات کے چکر فضول ہیں۔

میں یہ دو ادویات لکھ دیتا ہوں آپ بھی آزما سکتے ہیں لیکن اگر علامات مرض مختلف ہوں تو آپ ہمارے شعبہ طب و نفسیات سے رجوع کریں۔ وہ ادویات یہ ہیں:

(1) Apis Melf-6

دن میں تین بار کھائیں (صبح+دوپہر+شام)

(2) Arg. Nit 30

دن میں دو بار کھائیں (صبح+شام)

جو احتیاطیں پہلے لکھی ہیں ان پر عمل ضرور کریں۔
ان شاء اللہ شفا ہوگی۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اگر آنکھوں میں موتیا وغیرہ ہو تو اول ہومیو پیتھک علاج کو آزمائیں۔ آنکھ میں ڈالنے کے لئے اکثر ڈاکٹرز (Cineria Martima Eyes Drops) لکھ دیتے ہیں لیکن میرے خیال میں ان کا استعمال بھی ایک محدود حد تک ہے اور وہ بھی اگر Non-Alcholac ہوں تو بہتر ہے کیونکہ اکثر ہومیو پیتھک ادویات میں الکحل استعمال

ہوتی ہے۔ اگر گولیاں بنا کر دی جائیں تو الکحل اڑ جاتی ہے اور نقصان وہ نہیں رہتی مگر جب الکحل والے ڈراپس آنکھوں میں ڈالیں گے تو اس سے الرجی بھی ہو سکتی ہے اور Irritation بھی بہرحال اگر لینے ہیں تو الکحل کے بغیر بھی ملتے ہیں اور کچھ ڈاکٹر سفید موتیا کے علاج کا دعویٰ بھی کرتے ہیں مگر میں ان کے بارے میں کوئی ٹھوس رائے نہیں دے سکتا (It is your own risk) اب میں دوسرے طریقہ علاج کی طرف آتا ہوں۔ وہ ہے یونانی طریقہ علاج۔ اس کے بارے میں پہلے ہی کسی شمارے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اب میں ایلوپیتھک طریقہ علاج کی طرف آتا ہوں۔ تو اس میں صرف آپریشن ہی اس مسئلے کا حل ہے۔ بہرحال اگر نوبت آپریشن تک آ جائے تو مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل ضرور کریں۔

(1) کسی اَن ٹرینڈ یا عطائی کے چکر میں نہ آئیں۔ یہ آپ کی آنکھ کا مسئلہ ہے پوری طرح اپنی تسلی کرنے کے بعد ہی آپریشن کرائیں۔ ہو سکے تو لیزر کا آپریشن کرائیں کیونکہ یہ آسان بھی ہے اور بعد میں جلد صحت یابی بھی ہو جاتی ہے۔

(2) اگر زیادہ دیر سے آپریشن کرائیں گے تو موتیا زیادہ پک جائے گا اور پھر لیزر (Feco) سے آپریشن نہیں ہو سکتا اور مریض اور ڈاکٹر دونوں کے لئے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

(3) تمام ڈاکٹر آپریشن کے دوران اور بعد مریض کو کچھ ہدایات بتاتے ہیں۔ ان پر عمل لازمی کریں۔ تاہم میں اپنی طرف سے آپ کو چند مزید ہدایات بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ان پر عمل کریں گے تو ساری عمر سکھی رہیں گے خصوصاً لینز والے اگرچہ لینز سے آدمی بہت بہتر محسوس کرتا ہے مگر

(1) آنکھوں سے ضرورت سے زیادہ کام نہ لیں۔

(2) دھوئیں، گرد و غبار، مٹی اور تیز دھوپ/ گرمی/ آگ والی جگہوں سے سخت پرہیز کریں۔ آندھی وغیرہ کے عالم کبھی آنکھیں بند کر کے آرام سے کھڑے ہو جائیں۔ اگر مٹی یا شیشہ وغیرہ آنکھوں میں پڑ جائے تو پانی سے دھوئیں آنکھ کو ملنے سے سخت پرہیز کریں۔ اگر کوئی چیز پڑ جائے تو Betnesol Eyes Drops بہترین کام کرتے ہیں یا پھر فوراً اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

اگر A/C میں رہیں تو بہت بہتر ہے۔ رنگوں والی عینک کا استعمال بہت ضروری ہے تاکہ تیز ہوا اور مٹی سے آنکھ محفوظ رہے۔

ایک بات یاد رکھیں کہ اگرچہ موجودہ لینز پچھلے آلات کی نسبت بہتر ہیں مگر تاحیات ان کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ پھر یہ خراب بھی ہو سکتے ہیں اور ضائع ہونے کا بھی خطرہ ہے۔

اگر آنکھوں میں Lense فٹ کرا لئے ہیں تو ان کی حفاظت کے لئے چند اصول لکھ دیتا ہوں:

(1) گرد و غبار، مٹی اور سخت گرمی والے مقامات سے حتی المقدور اپنے آپ کو دور رکھیں۔

(2) کوشش کریں کہ آنکھوں میں پسینہ نہ پڑے۔

(3) گرلیں یا آئل والی اشیاء کو چہرے سے دور رکھیں۔

(4) سپرے یا Spray قلعی، پٹرول، تھنر، Paints کے کاموں سے خود کو دور رکھیں کیونکہ یہ کیمیکل اڑ کر آنکھ میں آ جاتے ہیں۔ ورکشاپوں اور تندوروں یا سموسے پکوڑے وغیرہ کی دکانوں پر جانے سے قبل احتیاطی تدابیر ضرور کریں۔

(5) ہر وقت تازہ پانی کی ایک بوتل ہمراہ رکھیں تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں فوراً آنکھوں کو دھو سکیں۔

(6) تازہ سبزیاں، گاجر، چقندر وغیرہ، مچھلی کے تیل کے کیپسول ساتھ وٹامن اے اور ڈی لیتے رہیں۔ اس کے علاوہ سیر کرنا ضروری ہے۔

◆✻◆

عمر رفتہ

بھا سنگھ کے ٹکیت

میں اگر اس کو جھوٹا سچا معافی کا پروانہ لکھ کر دے دیتا تو یقیناً وہ چلا جاتا لیکن باوجود خطرۂ جان کے جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا میرے اصول کے خلاف تھے۔

☆ انتخاب: حبیب اشرف صبوحی

انسانی زندگی واقعات کا ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ کبھی دل خوش کن اور کبھی دل شکن۔ انسان عجیب و غریب ادوار سے گزرتا ہے۔ "عمر رفتہ" ایسے ہی واقعات سے مزین ہے۔ آیئے! تقی محمد خان خورجی صاحب کی زندگی کا ایک اور دلچسپ باب دیکھتے ہیں۔

بہشت بریں سے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بحکم خداوندی بھیجا گیا تھا۔ خدا کی مصلحت خدا ہی جانے اور خاکسار ناچیز بندے کو کشمیر جنت نظیر سے ریاست دتیا

بندیل کھنڈ جانے کا حکم ہوا۔ آدم نے شجر ممنوعہ گندم کو کھایا تھا اور میں نے کشمیر کی مکا کھائی تھی۔ اسباب وعلل پر تو غور کرنا ہمارا کام نہیں۔ اس کی مصلحت میں قانون قدرت ہے اور ہر لحاظ سے درست ہے۔ انسان کی نظر اسباب ظاہری تک محدود ہے۔ کہاں وہ آبشار، چشمے، قدرتی پھول پھل، سکون قلب، بہترین آب و ہوا، میوے وغیرہ، کہاں بندیل کھنڈ کی شدید گرمی، خشک پہاڑ، دھو کے جنگل۔

ریاست دتیا...... سینٹرل انڈیا کی ریاست ہے۔ اس کا فاصلہ ضلع جھانسی سے سترہ میل اور گوالیار سے چالیس میل ہے۔ وہ ہمیشہ سے ٹھگوں اور ڈکیتوں کا مسکن رہا ہے۔ بندھیاچل کے پہاڑ دریائے سندھ کے بڑے بڑے عمیق غار اور گھنے جنگل، یہ ان لوگوں کی ہمیشہ سے پناہ گاہیں رہی ہیں۔

1923ء میں ریاست دتیا میں علاوہ چھوٹے گروہوں کے چار پانچ گروہ مسلح ڈکیتوں کے ایسے زبردست تھے کہ جنھوں نے متواتر ڈکیتیوں سے جھانسی، جالون، للت پور، گوالیار اور آگرہ تک کے عوام کے دلوں میں خوف قائم کر دیا تھا اور بعض ڈکیتیاں تو ایسی ڈالی تھیں کہ قصبہ کی پولیس کو باندھ کر ڈال دیا اور تمام تمام رات پچاس ساٹھ آدمیوں نے قصبہ کو لوٹا۔ گورنمنٹ کی پولیس نے اپنی فوج کی مدد لے کر کئی مرتبہ جنگلوں کا محاصرہ کر کے تلاش کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بڑی وجہ اس کی یہ تھی کہ دتیا کی پولیس مرعوب اور غیر تربیت یافتہ تھی اور افسران بددیانت تھے، جو ڈکیتوں سے مل گئے تھے۔

جب ڈکیتوں کی دست درازیاں حد سے گزر گئیں اور متواتر قتل بھی ہوئے تو گورنمنٹ یو پی نے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ انڈیا کو لکھا اور مہاراج کی شکایت کی۔ وائسرائے نے مہاراجہ دتیا کو حکم بھیجا کہ ”اگر ڈکیتیوں کا انسداد نہ ہوا تو معزول کر دیے جاؤ گے“۔

مہاراجہ دتیا نے کرنل انڈرسن کو جو نو گاؤں کی ریاستوں کے پولیٹکل ایجنٹ تھے یہ جواب دیا کہ پولیس اور ڈکیتوں کی اصلاح میرے امکان سے باہر ہے۔ آپ خود اس کا انتظام کیجیے۔ صرف جو درکار ہو گا وہ ریاست دے گی۔

میں بھرت پور اور کشمیر دونوں مقامات پر کرنل انڈرسن کی ماتحتی کر چکا تھا اور میری بابت ان کی بہترین رائے تھی۔

اُدھر میری درخواست بغرض واپسی یو پی گورنمنٹ میں پہنچی، اُدھر کرنل انڈرسن کا تار مجھے پوچھ میں ملا کہ ”ریاست دتیا کو تمہاری ضرورت ہے“۔ میں راضی ہو گیا کیونکہ یہ مقام وطن سے قریب تھا۔ باہم گورنمنٹوں میں خط و کتابت ہو کر جب معاملات طے ہو گئے تو حکم پہنچنے پر اپریل 1922ء کو دتیا پہنچ گیا۔

ہندو سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دیوان ریاست (ہندو) دونوں ہٹا دیے گئے۔ دیوان کی بجائے خان بہادر قاضی عزیز الدین بلائے گئے۔ شہر کے باہر مجھے کوٹھی رہنے کے واسطے دی گئی۔

ریاست کی پولیس بیکار اور غیر تربیت یافتہ تھی۔ بجائے ڈکیتیوں کے سب سے پہلے میں نے پولیس کی اصلاح میں وقت صرف کیا۔ راشی، ڈکیتوں سے سازباز رکھنے والے اور سازشی عناصر کو نکالا، کچھ تعداد بڑھائی اور گورنمنٹ آف انڈیا کی معرفت فوجی رائفل منگائے۔ دو سب انسپکٹر اور ایک انسپکٹر اپنے اطمینان کے قابل اپنی برادری میں سے خورجہ سے بلائے۔

اُدھر جھانسی پولیس کے حکام سے مل کر یہ طے کیا کہ جب ڈکیتوں کی اطلاع جھانسی کی سرحد پر جانے کی ملے گی تو ان کو اطلاع دی جائے گی۔ اس غرض کے واسطے گورنمنٹ پولیس کی ایک جماعت ہر وقت تیار رکھنے کی ضرورت ہے۔ ان تمام انتظامات میں چھ ماہ صرف ہوئے

لیکن اس درمیان میں بھی سرکش ڈکیتوں کو آرام نہ لینے دیا اور متواتر ان کے مقامات پر شب کو ایسے اوقات میں جبکہ موسلا دھار بارش، ندی نالے چڑھے ہوئے ہوں میں خود جاتا، محاصرہ ان کے گاؤں کا کرتا لیکن وہ ایسے چوکنا تھے کہ ان کو کسی نہ کسی ترکیب سے اطلاع مل جاتی اور پہاڑوں میں چھپ جاتے۔

جب رفتہ رفتہ ان کے امدادی عناصر کم ہو گئے، آزادیاں سلب ہو گئیں، پولیس کی قوت بڑھ گئی تو چھوٹے گروہوں کے افراد فرداً فرداً گرفتار ہونے شروع ہو گئے۔ کچھ ریاست چھوڑ کر بھاگ گئے لیکن بہادر سنگھ کا گروہ جس سے اطراف و جوانب میں تہلکہ مچا ہوا تھا، وہ گرفتار نہ ہوتا تھا۔ میں بھی کچھ ایسا ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا کہ رات ہو، دن ہو، آندھی ہو، بارش ہو، اندھیرا ہو، وقت ناوقت بیس میل جا کر اس کے گاؤں کا جو پہاڑ کے نیچے ہی تھا محاصرہ کرتا۔ جب وہ نہ ملتا تو چلا آتا۔ جب اس کے گاؤں کے قریب مستقل پولیس گارڈ تعینات کر دیا جاتا تو وہ اپنے گروہ کو لے کر دور نکل جاتا اور ڈکیتیاں ڈالتا۔ اس کے اپنے ساتھی جو مستقل تھے وہ چھ سات سے زیادہ نہ تھے لیکن ضرورت کے وقت وہ پچاس تک آدمیوں کو جمع کر لیا کرتا۔ خود اس کے پاس 450 بور دو نالی رائفل، بقیہ اس کے ہمراہیوں کے پاس دو نالی کارتوسی بندوقیں تھیں۔

یہ رائفل دراصل مہاراجہ دتیا کا تھا۔ کیونکر بہادر سنگھ کے پاس پہنچا؟ یہ بھی اس کی دلیری کا اعلیٰ کارنامہ ہے۔

ایک روز مہاراجا شیر کے شکار کی غرض سے جنگل میں گئے تھے۔ بہادر سنگھ بھی اتفاق سے اسی جنگل میں موجود تھا۔ جب اس کو علم ہوا تو اس نے اپنی بندوق اپنے ساتھیوں کو دے کر کہا اس کو اپنے پاس رکھو اور ریوالور لے کر تن تنہا اس مقام پر پہنچا جہاں مہاراج کے گھوڑے کھڑے ہوئے تھے اور جہاں ان کو موٹر سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کے مقام پر جانا تھا۔ یہ درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ مہاراج مع اپنے ہمراہیوں کے اس مقام پر آئے، موٹر سے اتر کر کھڑے ہوئے، ان کا بیش قیمت رائفل ان کے ملازم نے ان کو دیا۔ مہاراج کے اے ڈی سی وغیرہ مع متعدد بندوقوں کے وہاں موجود تھے۔ بہادر سنگھ درخت کی آڑ میں سے نکلا۔ مہاراج کو آن کر سلام کیا اور کہا کہ میں فلاں موضع کا رہنے والا بہادر سنگھ ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے مہاراجہ کے ہاتھ سے رائفل لے لیا اور ملازم سے کارتوسوں کا تھیلا لیا اور کہا کہ آپ کی یادگار میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ سلام کیا، دونوں نالوں میں کارتوس لگائے اور چلا گیا۔

جب بہادر سنگھ کے رعب و جلال کا اثر دور ہوا تو ہر شخص ان میں سے شرم سے پسینے پسینے ہو گیا۔

ایک مرتبہ گوالیار کی پولیس نے جب کہ وہ اس ریاست میں ڈکیتی ڈالنے کی غرض سے گیا تھا، گھیر لیا۔ بہادر سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بڑی دلیری سے مقابلہ کیا جس میں ایک سپاہی مارا گیا اور اکثر زخمی ہوئے۔ وہ بچ کر نکل آیا۔

ایک مرتبہ نوآباد جھانسی میں پولیس کے تھانے میں پہنچ کر پولیس والوں کو باندھ کر ڈال دیا اور تمام رات قصبہ کو لوٹا۔ مکان اس کا پہاڑی کے دامن میں تھا اور پہاڑ پر بکثرت جنگلی درخت تھے۔ جب بھی وہ اندیشہ محسوس کرتا، پہاڑ پر چلا جاتا اور وہاں سے پناہ لے کر بندوق چلانے میں اس کو آسانی ہوتی۔

ایک مرتبہ مخبر نے مجھے اطلاع دی کہ وہ آج گاؤں کے کنارے اپنے کھیت کے کھلیان میں رات گزارے گا۔ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر اور تمام رات سفر کر کے کھلیان کے آس پاس پوزیشن لے کر بیٹھ گیا تاکہ صبح نمودار ہوتے ہی اس کو کھلیان سے باہر نکلنے کو کہا جائے۔ میں اس کے گاؤں کی طرف پہاڑ کے دامن میں ایک

بہت بڑے پتھر کی آڑ لے کر بیٹھا ہوا تھا اور میری بندوق کا رخ کھلیان کی جانب تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بہادر سنگھ دس گز کے فاصلے پر بلندی پر بیٹھا ہوا اپنے رائفل کا نشانہ مجھ پر لے رہا تھا لیکن قدرت کو بچانا منظور تھا اس لئے اس نے فائر نہ کیا۔ جب کھلیان میں وہ یا اس کے ساتھی مجھے نہ ملے تو میں واپس آ گیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کبھی رات کو پوری نیند نہ سوتا اور دو تین گھنٹے کے بعد جگہ تبدیل کرتا رہتا۔

وہ تمام بندیل کھنڈ کے واسطے ایک مصیبت تھا۔ نہایت دلیر، مغلوب الغضب، سرکش اور بے رحم، لمبا قد، چوڑا چکلا سینہ، قوی الجسم۔ اس کے ساتھی بھی بعض قاتل اور بعض سنگین جرائم میں مطلوب تھے۔

کوئی گاؤں والا بوجہ خوف اس کی موجودگی کی اطلاع پولیس کو نہ دیتا، نہ کوئی مخبری کرتا، ورنہ ہلاک کر دیا جاتا۔ ضرورت کے وقت جس گاؤں سے مدد لینا چاہتا، اس کو جرائم میں شریک ہونے کے واسطے آسانی سے آدمی مل جاتے۔ ایک گاؤں کے لڑکے نے جو گرفتار کر کے میرے پاس لایا گیا تھا، کہا کہ ایک مرتبہ میں اپنے گاؤں میں کنوئیں پر شام کو پانی بھر رہا تھا، بہادر سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے پکڑ لیا اور مجھ سے ڈکیتی میں شرکت کے واسطے ساتھ چلنے کو کہا، میں بوجہ خوف ساتھ ہو گیا۔ ایک بہت وزنی ہتھوڑا جس کو گھن کہتے ہیں اور جو دروازوں کی زنجیریں اور قفل توڑنے کے کام میں آتا ہے، میرے کندھے پر لاد دیا۔ دتیا سے کافی فاصلے پر ایک گاؤں میں آدھی رات کے قریب پہنچے۔ ایک بنئے کے مکان کے کواڑ توڑ کر اندر داخل ہوئے۔ خوب دل کھول کر لوٹا۔ ایک ڈکیت چھت پر چڑھ کر بندوقیں چلا رہا تھا جس کی وجہ سے کسی کو قریب آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ واپس آن کر فلاں جنگل میں بانٹ ہوئی۔ مجھے بھی پانچ روپے ملے۔ اس روز تو میں بہت خوفزدہ تھا لیکن رفتہ رفتہ عادی ہو گیا۔

اس کے بعد اس نے اکثر ڈکیتیوں کے تفصیلی حالات سنائے۔ اس کے نیز دیگر ڈکیتوں کے بیانات سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ بندیل کھنڈ میں ہر شخص نہایت آسانی سے ڈکیت بن جاتا ہے۔ یہ خطہ پہلے زمانے میں ٹھگوں کی وجہ سے مشہور تھا، جو راہ گیروں کے گلے میں پھندا ڈال کر ہلاک کر دیتے تھے۔ جب انگریزوں کی عملداری آئی اور انہوں نے ان لوگوں کا قلع قمع کر دیا تب یہاں کے لوگ ڈکیتی کی طرف متوجہ ہوئے۔

بہادر سنگھ تقریباً پندرہ سال سے اسی قسم کے جرائم کرنے اور آوارہ گردی کی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ مجھ سے پہلے تو اس قدر آزاد تھا کہ گھر پر رہتا تھا اور اس کے اولاد بھی ہوتی تھی لیکن اس ڈیڑھ سال میں میں نے اس کی زندگی تلخ کر دی اور اس نے بھی میرا آرام اور سکون کھو دیا۔ اکثر گاؤں والوں کے ذریعے پیغامات بھیجے اور مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ ایسے شخص سے اس قسم کی حرکت بعید از قیاس تو نہ تھی لیکن بقول شخصے "جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈر"۔ اس کا کام قتل و غارت گری اور میرا کام اس کو گرفتار کر کے یا جان سے مار کر امن و امان قائم کرنا۔ چونکہ دونوں باتیں متضاد تھیں اس لئے نہ اس کو موت سے ڈر تھا اور نہ مجھے جان جانے کا خوف تھا۔

میری کوٹھی شہر سے کچھ فاصلے پر جنگل سے ملحق تھی۔ ایک روز صبح کے وقت میں چائے سے فارغ ہو کر اپنے مکان کے دفتر کے کمرے میں آن کر بیٹھ گیا اور حسب معمول گزرے ہوئے دن کے حالات اپنی نجی ڈائری میں لکھ رہا تھا۔ میرا رخ سڑک کے پھاٹک کی طرف تھا۔ میں نے دیکھا کہ سب انسپکٹر محمود خاں چند قدم آگے اور پیچھے ایک شخص دراز قامت ہاتھ میں دو نالی رائفل، کمر میں تلوار، بھرنے والا ایک نال کا پستول لٹکائے ہوئے آ رہے ہیں۔ سیڑھیوں پر چڑھے، کمرے کے اندر آئے:

محمود خاں کرسی پر بیٹھ گئے اور دوسرے شخص نے اپنا رائفل میرے بیری طرف جھکایا اور کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا:

"میں بہادر سنگھ ڈکیت ہوں۔ آپ کے یہ سب انسپکٹر کل شام کو مع ایک سپاہی کے میری تاک میں گھوڑے پر چڑھے ہوئے جا رہے تھے۔ میں مع اپنے چند ساتھیوں کے ایک پہاڑی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پیچھے سے آن کر ساتھیوں کی مدد سے ان دونوں کو پکڑ لیا اور سب انسپکٹر صاحب سے کہا کہ میں تمہیں ابھی جان سے مار سکتا ہوں لیکن تم اس بات کا وعدہ کرو کہ مجھے معافی دلوا دو گے اور سزا نہ ہونے پائے گی۔ میں جرائم کرنے سے توبہ کرلوں گا ورنہ تم اور تمہارے سپرنٹنڈنٹ مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ جب موقع ملے گا مار دوں گا۔ سب انسپکٹر نے اس کا یہ جواب دیا کہ معافی دینے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ یہ کام سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مدارالمہام ریاست کا ہے۔ تم چلو میں ان سے ملوائے دیتا ہوں۔ چنانچہ ہم نے سب انسپکٹر کو اپنی حراست میں رکھا اور شب تنہا ان کو جنگل کے راستے سے بہ راہ راست یہاں لایا ہوں۔ سپاہی اور گھوڑا ہمارے ہی قبضے میں ہیں"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی رائفل کا چیمبر کھول کر مجھے دکھلایا۔ اس میں کارتوس لگے ہوئے تھے اور پستول بھی تیار تھا۔

"پچاس کارتوس آپ میرے گلے میں پڑے ہوئے دیکھ رہے ہیں"۔ اس نے کہا۔ "یہ آپ دونوں اور آپ کے گارڈ کے سپاہیوں کے مار ڈالنے کے واسطے کافی ہیں۔ قبل اس کے کہ میں آپ سے بات چیت کروں اس پہرے والے سپاہی سے کہئے کہ میرے سامنے کھڑا رہے اور آپ یا آپ کے سب انسپکٹر بھی انگریزی میں بات چیت نہ کریں نہ کوئی اشارہ آپس میں کیا جائے ورنہ ہلاکت یقینی ہے"۔

یہاں یہ حالت تھی کہ پستول تو درکنار میرے پاس کوئی چھڑی بھی نہ تھی۔ میرے گارڈ کے سپاہی رات کے وقت تو بندوق لے کر پہرہ دیتے اور دن کے وقت صرف ایک ہاتھ لمبا ڈنڈا پاس رکھتے۔ ایسے جاں فروش اور نڈر شخص کا کیونکر مقابلہ کیا جا سکتا۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ وہ ڈنڈا زمین پر ڈال کر برآمدے میں کھڑا ہو جائے۔

مختلف خیالات میرے دماغ میں چکر لگاتے تھے لیکن اس وقت کے حالات نے کچھ ایسا جنتر بند کر دیا تھا کہ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں اگر اس کو جھوٹا سچا معافی کا پروانہ لکھ کر دے دیتا تو یقیناً وہ چلا جاتا لیکن باوجود خطرۂ جان کے جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا میرے اصول کے خلاف تھے۔ دوم میری یہ کارروائی خلاف ضابطہ ہوگی۔ سوم ایسے خطرناک شخص کا میرے مکان پر آن کر اور بات چیت کر کے چلا جانا چھپنے والی بات نہ تھی۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر ریاست اور ریاست کے باہر پھیل جاتی اور نہ صرف یہ کہ میری ایمانداری اور نیک نامی پر حرف آتا بلکہ تمام ملازمت کے کارناموں پر پانی پھر جاتا۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں اچانک ڈکیت کے سر پر پہنچ کر اور ریوالور لے کر اس کو اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنے دیتا تھا اور اس روز ایک ڈکیت کا دونالی رائفل جس کا رخ میری طرف تھا مجھے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرنے دیتا تھا۔

میرے لیے صرف دو راستے تھے۔ معافی کا اقرار یا انکار اور میں گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ میری عقل اور تدبیر دونوں کی حدود ختم ہو چکی تھیں لیکن جہاں تاریکی ختم ہوتی ہے وہاں سے روشنی کی شعاعیں نمودار ہوتی ہیں اس نے مجھ سے اپنی خواہش بیان کی کہ مجھے معافی کا پروانہ دے دیا جائے۔

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ دیوان ریاست

ایسا کر سکتے ہیں"۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

اس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک بوسیدہ پرچہ جو تعویذ کی طرح تہہ کیا ہوا اور پسینے سے خراب ہو گیا تھا، نکال کر سب انسپکٹر کے ذریعے سے جو اس کے قریب تھے، مجھے دے کر کہا۔ "سابق دیوان ریاست اور سپرنٹنڈنٹ نے جن کے اس پر دستخط ہیں، مجھے یہ معافی کا پروانہ لکھ دیا تھا۔ ا۔ چونکہ وہ دونوں ختم ہیں، اس کی تجدید کی ضرورت ہے"۔

یہ پڑھ کر میں نے وہ پرچہ سب انسپکٹر کے ذریعے سے اس کو واپس دے دیا لیکن اس سے مجھے امید کی ایک کرن دکھلائی دی اور چند سیکنڈ مزید سوچنے کا موقع مل گیا۔

"تم میرے ساتھ دیوان صاحب کے پاس چلو"۔ میں نے کہا۔ "ان سے اس بارے میں بات چیت تمہاری موجودگی میں کروں گا"۔

ان کی اور میری کوٹھیاں اس قدر قریب تھیں کہ دونوں کی دیوار احاطے کی ایک ہی تھی۔ وہ اس پر راضی ہو گیا اور ہم تینوں پھاٹک کی طرف روانہ ہوئے۔

ہم دونوں کو اس نے اس وجہ سے آگے رکھا کہ پیچھے سے وہ پوری طرح ہم پر قابو رکھ سکے۔

مجھے سب انسپکٹر کی اس حماقت پر کہ پہلے سے اطلاع دیئے بغیر اس کو کیوں لے آیا، جس کی وجہ سے مجھے ایسی دشواری پیش آئی جو تمام مدت ملازمت میں پیش نہ آئی تھی، نہایت غصہ تھا لیکن سب انسپکٹر بھی کیا کرتا اگر وہ اس کے ساتھ آنے سے انکار کرتا تو مارا جاتا۔

اسی سوچ میں تھا کہ وہاں جا کر بھی میں کیا کروں گا، ان کی کوٹھی پر ہم پہنچ گئے۔ خان بہادر قاضی عزیز الدین احمد صاحب کمرے کے سامنے آرام کرسی پر سیڑھیوں کے قریب لیٹے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے۔

بہادر سنگھ نے حسبِ سابق وہاں کے دستور کے مطابق بندوق کو اُن کے پیروں کی طرف جھکایا اور سیڑھیوں کے کنارے پر بیٹھ کر پولیس کے ڈنڈے والے سپاہی کو دور اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"یہ کون ہے؟" قاضی صاحب نے پوچھا۔

"بہادر سنگھ، مشہور ڈکیت ہے"۔ میں نے کہا۔

یہ سن کر وہ سکتے کے عالم میں ہو گئے، زرد پڑ گئے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ "بہادر سنگھ کو جو سابق دیوان اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے معافی کا پروانہ لکھ دیا تھا، اس کی تجدید کرانے کے واسطے آیا ہے۔ اس کو دیکھ لیجیے"۔

تھے وہ بلا کے ذہین، کہنے لگے۔ "وہ کہاں ہے؟"

میں چاہتا تھا کہ صرف ایک سیکنڈ کے واسطے اس کے خیالات بندوق کی طرف سے ہٹ جائیں اور اس کی انگلی جو ہر لمحے لبلبی پر رکھی ہوئی تھی، ایک سیکنڈ کے واسطے وہاں سے ہٹ جائے تو میں جان پر کھیل کر اس سے لپٹ جاؤں۔ یہی آخری تدبیر تھی۔

چنانچہ جیسے ہی اس نے داہنے ہاتھ سے پرچہ نکالا اور اس کو کھولنے کے واسطے دوسرے ہاتھ کی مدد لی، میں قریب تو تھا ہی، جھپٹ کر بہادر سنگھ سے چمٹ گیا اور سب انسپکٹر اور چپڑاسی نے بھی دوڑ کر مدد کی۔ دیوان صاحب ڈر کے مارے غسل خانے میں گھس گئے اور کواڑ بند کر لیے۔

اس نے اپنی حتی المقدور کافی جدوجہد کی۔ اسی ہشت مشت میں ایک ایک ہتھیار اس سے علیحدہ کیا گیا۔ لات اور گھونسوں کی چوٹیں بھی حصہ رسدی سب کو لگیں۔ جب ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے تو گالیوں پر اتر آیا لیکن تھپڑ اور گھونسوں نے اس کی زبان بند کر دی۔

غرور کا یہ حشر ہوا۔ اس کے بعد مقدمہ چلا اور اس کو پھانسی کی سزا دے دی گئی تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

▲

شخصیات

مادرِ ملت کا سفرِ آخرت

- ان کی موت طبعی تھی یا قتل؟
- ان کے آخری دیدار کی اجازت کیوں نہیں دی گئی؟
- جسم پر گہرے زخموں کے نشان اور پیٹ میں سوراخ تھا۔ (غسال)
- محترمہ کے خون آلود کپڑے میرے پاس موجود ہیں۔ (غسال)
- ان کی موت بہت سے سوالیہ نشان چھوڑ گئی۔

☆ انتخاب: ڈاکٹر عبداللہ / تحقیق: اختر بلوچ

محترمہ فاطمہ جناح بانی پاکستان محمد علی جناحؒ کی نہ صرف خیال رکھنے والی مشفق بہن بھی تھیں بلکہ وہ جناح صاحب کی سیاسی شریک کار بھی تھیں۔ جناح صاحب کی وفات کے بعد لوگ انہیں اسی قدر و منزلت سے دیکھتے تھے جس طرح جناح صاحب کو لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جناح صاحب کی وفات کے بعد انہیں سیاست سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی حکومت اور انتظامیہ کسی صورت بھی نہیں چاہتی تھی کہ فاطمہ جناح آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ اس کوشش میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ ریڈیو پاکستان سے ان کی تقریر کے دوران کچھ مواقع پر نشریات روک دی گئیں۔ قدرت اللہ شہاب اپنی کتاب ”شہاب نامہ“ کے صفحہ نمبر 432 پر لکھتے ہیں کہ قائداعظم کی وفات کے بعد محترمہ فاطمہ جناح اور حکومت کے درمیان سرد مہری کا غبار چھایا اور قائد کی دو برسیاں آئیں اور گزر گئیں۔ دونوں بار مس جناح نے برسی کے موقع پر قوم سے خطاب کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی شرط یہ تھی کہ براڈ کاسٹ سے پہلے وہ اپنی تقریر کا متن کسی کو نہیں دکھائیں گی جبکہ حکومت شرط ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ غالباً اسے خوف تھا کہ نہ جانے مس جناح اپنی تقریر میں حکومت پر کیا کچھ تنقید کر جائیں گی۔

آخر خدا خدا کر کے قائداعظم کی تیسری برسی پر یہ طے پایا کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنی تقریر پہلے سے سنسر کروائے بغیر ریڈیو سے براہ راست نشر کر سکتی ہیں۔ تقریر نشر ہو رہی تھی کہ ایک مقام پر پہنچ کر اچانک ٹرانسمیشن بند ہو گئی۔ کچھ لمحے ٹرانسمیشن بند رہی، اس کے بعد خود بخود جاری ہو گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مس جناح کی تقریر میں کچھ فقرے ایسے تھے جن میں حکومت پر نکتہ چینی کی۔ وہ حسب دستور ان فقروں کو مائک پر پڑھتی گئیں لیکن ٹرانسمیشن بند

ہو جانے کی وجہ سے وہ فقرے براڈ کاسٹ نہ ہو سکے۔

اس بات پر بڑا شور شرابا ہوا۔ اخباروں میں بہت سے احتجاجی بیانات بھی آئے۔ اگرچہ ریڈیو پاکستان کا موقف یہی تھا کہ ٹرانسمیشن میں رکاوٹ کی وجہ اچانک بجلی فیل ہونا تھی لیکن کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ مس جناح کی تقریر میں ضرور کوئی ایسی بات تھی جسے حذف کرنے کے لئے یہ سارا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ اس ایک واقعے نے حکومت پر اعتماد کو جتنی ٹھیس پہنچائی اتنا نقصان مس فاطمہ جناح کے چند تنقیدی جملوں نے نہیں پہنچایا تھا۔

جنوری 1965ء کو انتخابات ہوئے۔ حزب مخالف کے سیاستدانوں کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ محترمہ کامیاب ہوں گی لیکن الیکشن کمیشن کے مطابق صدر ایوب کامیاب قرار دیئے گئے۔ غالباً حکومت اور محترمہ مس فاطمہ جناح کے درمیان انہی کشیدگیوں کی وجہ سے 9 جولائی 1967ء میں ان کے انتقال کے بعد مزار قائد کے احاطے میں دفن کیے جانے کی ان کی خواہش کے باوجود کوشش یہ ہوتی رہی کہ انہیں کراچی کے قدیم میوہ شاہ قبرستان میں دفن کیا جائے۔

اس حوالے سے آغا اشرف اپنی کتاب "مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح" کے صفحہ نمبر 184 پر لکھتے ہیں: محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی زندگی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مرنے کے بعد انہیں قائداعظم کے پاس دفن کیا جائے۔ اب محترمہ فاطمہ جناح کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیش آیا کہ انہیں کس جگہ دفن کیا جائے۔ بقول مرزا ابوالحسن اصفہانی صاحب اس وقت کی حکومت محترمہ کو میوہ شاہ قبرستان میں دفنانا چاہتی تھی (ایم اے ایچ اصفہانی انٹرویو 14 جنوری 1976ء کراچی) جس کی مخالفت کی گئی اور کمشنر کراچی کو متنبہ کیا گیا کہ اگر محترمہ فاطمہ جناح کو قائداعظم کے مزار کے قریب دفن نہ کیا گیا تو بلوہ ہو جائے گا۔

یہ فیصلہ تو ہو گیا کہ محترمہ فاطمہ جناح کو بلوے کے خدشے کے پیش نظر مزار قائد کے احاطے میں دفن کیا جائے لیکن اس کے باوجود ان کی تدفین کے موقع پر بلوہ ہوا۔

جب مادر ملت کی میت پونے نو بجے قصر فاطمہ سے اٹھائی گئی تو لاکھوں آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ قصر فاطمہ کے باہر دور دور تک انسانوں کا سمندر نظر آ رہا تھا۔ میت کو کندھوں پر اٹھایا گیا تو ہجوم نے مادر ملت زندہ باد کے نعروں کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

محترمہ فاطمہ جناح کی میت ایک کھلی مائیکرو وین میں رکھی گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف مسلم لیگ کے نیشنل گارڈز کے چار سالار کھڑے تھے۔ ایک عالم دین بھی موجود تھے جو سورہ یٰسین کی تلاوت کر رہے تھے۔ غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا یہ جلوس جب ایک فرلانگ بڑھ گیا تو مسلم لیگ نیشنل گارڈز نے ایک قومی پرچم لا کر مرحومہ کے جسد خاکی پر ڈال دیا۔ لوگوں نے جب مادر ملت کو ستارہ ہلال کے سبز پرچم میں لپٹے ہوئے دیکھا تو پاکستان زندہ باد، مادر ملت زندہ باد کے نعروں سے خراج عقیدت پیش کیا۔ جلوس جوں جوں آگے بڑھتا رہا لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ راستے میں چھتوں سے عورتیں مادر ملت کے جنازے پر پھول کی پتیاں نچھاور کر رہی تھیں۔ جلوس دس بجے پولو گراؤنڈ پہنچ گیا جہاں میونسپل کارپوریشن نے نماز جنازہ کا انتظام کیا تھا۔ وہاں جنازہ پہنچنے سے پہلے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ دوسری نماز جنازہ مفتی محمد شفیع نے پڑھائی۔ نماز جنازہ کے بعد میت کو دوبارہ گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ اب ہجوم لاکھوں تک پہنچ چکا تھا۔

قائداعظم کے مزار کے قریب محترمہ کا جنازہ میوزیکل فوتنین اور الفنسٹن اسٹریٹ (زیب النساء اسٹریٹ) سے ہوتا ہوا جب آگے بڑھا تو ہجوم کی تعداد

چار لاکھ تک پہنچ گئی اور پولیس کو جنازے کے لئے راستہ بنانا مشکل ہوگیا۔

راستے میں میت پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جاتی رہیں۔ لوگ کلمہ طیبہ، کلمہ شہادت اور آیات قرآنی کی تلاوت کر رہے تھے۔ جنازے کا جلوس جب مزار قائد کے احاطے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے وزیر خارجہ شریف الدین پیرزادہ نے اسے کندھا دیا۔

اس وقت دوپہر کے بارہ بجے تھے اور لوگوں کی تعداد چھ لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی کیونکہ مادر ملت کی موت پر تمام دکانیں، تعلیمی ادارے، سرکاری دفاتر، سینما گھر وغیرہ بند تھے اور حکومت کی طرف سے عام تعطیل ہونے کے باعث اہل کراچی نے بانی پاکستان کی ہمشیرہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ان کے جنازے کے جلوس میں شرکت کی تھی۔ اس بے پناہ ہجوم کے باعث گڑبڑ ہوگئی تھی۔

اچانک کچھ لوگوں نے جنازے کے قریب آنے کی کوشش کی۔ پولیس نے پُرامن طریقے سے انہیں پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ آنسو گیس کا استعمال کیا۔ جوابی کارروائی میں پولیس پر پتھراؤ ہوا۔ پولیس کے کئی سپاہی زخمی ہوئے۔ ایک پیٹرول پمپ اور وفل ڈیکر کو آگ لگا دی گئی۔ ایک شخص اس حادثے کا شکار ہوا اور کئی بچے عورتیں اور مرد زخمی ہوئے۔

بارہ بج کر پینتیس منٹ پر کے ایچ خورشید اور ایم اے ایچ اصفہانی نے لرزتے ہاتھوں، کپکپاتے ہونٹوں اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ خاتون پاکستان کے جسد خاکی کو قبر میں اتارا۔ جونہی میت کو لحد میں اتارا گیا، ہجوم دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ تدفین کی آخری رسومات میں شیعہ عقیدے کے مطابق تلقین پڑھی گئی جس میں فاطمہ بنت پونجا پکارا گیا۔ قبر کو آہستہ آہستہ بند کئے جانے

لگا اور 12 بج کر 55 منٹ پر قبر ہموار کر دی گئی۔

یہ تو تھی محترمہ فاطمہ جناح کے سفر آخرت کی کہانی لیکن فاطمہ جناح کی موت پورے معاشرے کے لیے ایک عجب کہانی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ محترمہ کی موت طبعی طریقے سے نہیں ہوئی بلکہ انہیں قتل کیا گیا تھا۔ جنوری 1972ء میں غلام سرور نامی ایک شخص نے محترمہ فاطمہ جناح کے حوالے سے عدالت میں ایک درخواست سماعت کے لیے دائر کی۔

غلام سرور ملک نے اپنی درخواست میں کہا کہ میں پاکستان کا ایک معزز شہری ہوں اور محترمہ فاطمہ جناح سے مجھے بے انتہا عقیدت ہے، محترمہ قوم کی معمار اور عظیم قائد تھیں۔ انہوں نے تمام زندگی جمہوریت اور قانون کی سربلندی کے لیے جدوجہد کی۔ 1964ء میں جب انہوں نے صدارتی انتخابات میں حصہ لیا تو وہ عوام کی امیدوں کا مرکز بن گئیں۔ وہ اس ٹولے کی راہ میں جو ہر صورت اقتدار سے چمٹا رہنا چاہتا تھا، زبردست رکاوٹ تھیں اور یہ ٹولہ ہر قیمت پر ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جولائی 1964ء کو محترمہ فاطمہ جناح رات کے گیارہ بجے تک ایک شادی میں شریک تھیں اور وہ ہشاش بشاش تھیں جبکہ 9 جولائی کو اچانک یہ اعلان کر دیا گیا کہ وہ انتقال کر گئی ہیں۔ ان کی تجہیز و تکفین کے وقت عوام کو جنازے کے قریب نہیں جانے دیا گیا اور یہاں تک کہ انہیں سپرد خاک کرنے تک ان کے آخری دیدار کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی۔ اس دوران جو لوگ آخری دیدار کرنا چاہتے تھے ان پر لاٹھی چارج کیا گیا اور آنسو گیس پھینکی گئی۔

اس وقت بھی یہ افواہیں عام تھیں کہ محترمہ فاطمہ جناح کے جسم پر زخموں کے نشانات ہیں لیکن ان افواہوں کو دبا دیا گیا۔ غلام سرور ملک نے اپنی درخواست میں کہا کہ مجھے یہ تشویش رہی کہ محترمہ فاطمہ جناح کو کہیں قتل نہ کیا گیا ہو۔ بعدازاں حسن اے شیخ اور دیگر معزز ہستیوں نے اس سلسلے میں اپنے شک وشبہ کا اظہار بھی کیا تھا اور یہ معاملہ اخبارات میں نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کیا گیا اور اداریے بھی لکھے گئے۔

اگست 1971ء میں ایک مقامی اردو روزنامے میں یہ خبر شائع ہوئی کہ محترمہ فاطمہ جناح کو قتل کیا گیا ہے۔ اس خبر میں غسل دینے والوں کے بیانات بھی شائع ہوئے جس میں ہدایت علی عرف کلو غسال نے یہ کہا تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح کے جسم پر زخموں کے گہرے نشانات تھے اور ان کے پیٹ میں سوراخ بھی تھا جس سے خون اور پیپ بہہ رہی تھی۔ غسال نے کہا تھا کہ محترمہ کے خون آلود کپڑے اس کے پاس موجود ہیں لیکن اس وقت کی حکومت نے نہ تو اس کی تردید کی اور نہ ہی اس معاملے میں انکوائری کی ہدایت کی گئی۔ اس کے علاوہ اس معاملے کی دیگر غسالوں نے بھی تصدیق کی تھی۔

فاطمہ جناح مادر ملت ہیں اور ان کے جنازے اور تدفین میں ہونے والی یہ بدحرگی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔

اس مضمون سے ہمارا مقصد کسی بھی شخص، فرد یا ادارے پر انگلی اٹھانا نہیں۔ ہم نہ ہی یہ کہتے ہیں کہ خدانخواستہ انہیں قتل کیا گیا اور نہ ہی یہ کہ اس ساری بدحرگی سے کسی نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ہمارا مقصد صرف ان حقائق کو سامنے لانا تھا جن سے آج کے نوجوانوں کی بڑی تعداد لاعلم ہے۔ ہاں ایک اور سوالیہ نشان یہ ہے کہ جن تحقیقات کے وعدے کیے گئے تھے، وہ وعدے کیا ہوئے؟

(بہ شکریہ "اخبار جہاں")

✱◆✱

کار لفٹر گینگ

☆ سید بدر سعید

- ان کے اصل ماسٹر مائنڈ کا علم گینگ کے اراکین کو بھی نہیں ہوتا
- ایک کار کی چوری میں نگران' لاک ماسٹر' مکینک اور ڈرائیور سمیت درجن بھر افراد کی پوری ٹیم ملوث ہوتی ہے
- کار لفٹر رقم منگوانے کے لیے وہ شناختی کارڈ استعمال کرتے ہیں جو ہم خود انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کر چکے ہیں
- کار لفٹر ''رابطہ'' کے لیے ملنگوں اور جعلی فقیروں کے نام پر سم کارڈ حاصل کرتے ہیں
- کار لفٹرز کے گروہ کا کوئی شخص گرفتار ہو جائے تو اصل گینگ کی بجائے پہلے سے تیار کیے گئے ''مرغے'' کو پھنسا دیتا ہے
- کار کے تالے توڑنے والے ماہر کی ''ٹول کٹ'' اس کے جبڑے میں ہوتی ہے
- چوری شدہ گاڑی ایک پوائنٹ سے دوسرے پوائنٹ تک پہنچانے والے ''ڈرائیور'' کو دس سے چالیس ہزار معاوضہ ملتا ہے

ہر روز پاکستان کے ہر بڑے شہر سے درجنوں گاڑیاں چوری ہوتی ہیں۔ عام طور پر یہ چوری شدہ گاڑیاں کبھی بھی نہیں مل پاتیں چند ایک خوش نصیبوں کو تاوان ادا کر کے گاڑی مل جاتی ہے ورنہ ان کا کچھ علم نہیں ہو پاتا کہ یہ کہاں ہیں۔ اس بارے میں عام طور پر سنی سنائی باتیں گردش کرتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ گاڑیاں علاقہ غیر پہنچا دی جاتی ہیں تو کچھ کا کہنا ہے کہ ان کے پرزے الگ الگ کر کے بیچ دیے جاتے ہیں۔ گاڑی چوری سے لے کر اسے ٹھکانے لگانے تک کی مکمل روداد کا علم بہت کم لوگوں کو ہو پاتا ہے۔ اسی طرح بہت کم لوگ جان پاتے ہیں کہ ایک گاڑی چوری کرنے کے عمل میں درجن بھر افراد کا منظم گروہ کام کرتا ہے اور سبھی کو مناسب "معاوضہ" ادا کیا جاتا ہے۔

ooo

پاکستان میں کار چوری محض واردات کی بجائے باقاعدہ فن میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اب تو صورت حال یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ لگتا ہے۔ کار لفٹر بھی سوچتے ہیں کہ اب رات کا انتظار کون کرے' اب دن میں کیا نہیں ہوتا۔ اکثر دن دیہاڑے بھرے بازار کے بیچ سے گاڑی چوری کر لی جاتی ہے۔ آپ لاکھ تالے لگائیں' مہنگا چور لاک لگوائیں' متوجہ کرنے والا الارم لگائیں غرض اپنی کار کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر حیلہ کر لیں لیکن جیسے ہی وہ کار چور کی نظر میں آ گئی سمجھیں غائب ہو گئی۔ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ہزاروں افراد کار لفٹرز کی وجہ سے اپنی گاڑیوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ عام طور پر چوری ہونے والی گاڑیاں نہ تو پولیس پکڑ پاتی ہے اور نہ ہی چوروں کا سراغ ملتا ہے۔ اکثر گاڑیاں گھروں' شاپنگ پلازوں' دفاتر کے باہر سے اٹھائی جاتی ہیں۔ کار چور اس قدر صفائی سے گاڑیاں چوری کرتے ہیں کہ بعض اوقات گاڑی کھڑی کر کے سامنے ہی دکان سے بوتل خریدنے کے لئے جانے والا شخص پلٹ کر دیکھتا ہے تو اس کی گاڑی غائب ہو چکی ہوتی ہے۔

کار لفٹرز کے بارے میں مختلف ذرائع سے حاصل کی گئیں معلومات ظاہر کرتی ہیں کہ یہ کام معمولی چوروں کی بجائے انتہائی چالاک اور خطرناک گروہ کرتے ہیں۔ مجھے ملنے والی معلومات کے مطابق گاڑیاں چرانے میں صرف ایک شخص ملوث نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے ایک پورا گروہ مصروف عمل ہوتا ہے اس سلسلے میں عام طور پر ایک شخص کے ذمہ صرف شکار تلاش کرنا ہوتا ہے۔ یہ شخص مطلوبہ شکار کی کئی روز تک نگرانی کرتا ہے۔ اسے ریکی بھی کہا جاتا ہے اس طرح وہ اندازہ لگاتا ہے کہ ان کا شکار کس کس جگہ کتنا وقت صرف کرتا ہے' کس جگہ جانے کے بعد وہ خیر سے لوٹتا ہے' اس کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے کہ گاڑی کس جگہ سے چوری کی جائے گی اور وہاں سے کس ٹھکانے تک پہنچائی جائے گی۔ ریکی کرنے والا اپنا کام ختم کر کے ماسٹر مائنڈ کو رپورٹ دے دیتا ہے۔ اس کے بعد "لاک ماسٹر" کا کام شروع ہوتا ہے۔ "لاک ماسٹر" ہر طرح کے تالے کھولنے کا ماہر ہوتا ہے۔ اسی طرح اسے چور لاک اور ٹریکر تلاش کر کے بند کرنے میں بھی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ یہ لمحوں میں اپنا کام کرتا ہے۔ "سورس" کے مطابق "کار لفٹر گینگ" میں "لاک ماسٹر" خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ تالہ کھولنے کے لئے لاک ماسٹر کو کسی قسم کے اوزاروں کا تھیلا یا ٹول کٹ لانے کی ضرورت نہیں ہوتی اس کی "ٹول کٹ" اس کے جبڑے اور ہتھیلیوں میں ہوتی ہے۔ اس لئے تلاشی لینے پر بھی یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ شخص "لاک ماسٹر" ہے۔ ان کے جبڑے میں دانتوں کے درمیان خلا ہوتا ہے۔ یہ باریک سوئیاں اور باریک تار کے ٹکڑے دانتوں کے درمیان موجود ان جگہوں میں رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہاتھ کی ہتھیلی میں بھی کاٹن پن اور سوئیاں لگائے ہوتے ہیں' اپنے کام کے

لیے انہیں بس انہی باریک اور معمولی سوئیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ان کی مدد سے ہر قسم کا تالہ کھولنے کے ماہر ہوتے ہیں۔

''سورس'' کے مطابق لاک ماسٹر گاڑی کا تالہ کھول کر اسے جائے واردات کے قریب ہی پہلے سے طے شدہ ٹھکانے تک پہنچا دیتا ہے۔ مطلوبہ گیراج تک گاڑی پہنچانے کے بعد ''لاک ماسٹر'' کا کام بھی ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد ''میکینک'' کا کام شروع ہوتا ہے۔ ''میکینک'' اس گاڑی کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح چند چیزوں کا اضافہ یا کمی کر کے گاڑی کا ظاہری حلیہ بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ بعض اوقات گاڑی کا رنگ بھی تبدیل کر دیا جاتا ہے اس کے علاوہ اس پر سٹیکرز لگا کر اس کی ظاہری شکل میں بھی کچھ تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ اگر گاڑی کو شہر سے باہر نہ لے جانا ہو یا اس کے بدلے زیادہ رقم ملنے کی امید نہ ہو تو پھر ''میکینک'' چند ہی لمحوں میں اس گاڑی کو کھول کر اس کا ہر پرزہ الگ کر دیتا ہے۔ یہ پرزے اگلے ہی روز مارکیٹ میں مخصوص دکانوں پر بیچ دیئے جاتے ہیں۔ ''میکینک'' کا کام یہیں تک ہوتا ہے۔ وہ یا تو گاڑی کا ظاہری حلیہ اس حد تک تبدیل کر دیتا ہے کہ اس تبدیلی پر رقم بھی خرچ نہ ہو اور گاڑی پہچانی بھی نہ جائے یا پھر وہ گاڑی کھول کر اس کا ہر پرزہ الگ کر دیتا ہے تاکہ سپیئر پارٹس کی دکان پر پہنچائے جا سکیں۔ اگر گاڑی کھول کر پرزے بیچ دیئے جائیں تو کار چوری کی یہ واردات یہیں پر اپنے انجام تک پہنچ جاتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو یہ کہانی مزید آگے چلتی ہے۔ ''مکینک'' اپنے کام کی تکمیل کے بعد ایک طرف ہو جاتا ہے اس کے بعد ''ڈرائیور'' کا کام شروع ہوتا ہے۔

کار لفٹر گینگ کا ''ڈرائیور'' بھی معمولی انسان نہیں ہوتا اس کے ذمہ گاڑی کو شہر سے باہر لے جانا اور مخصوص مقام تک پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ شہر کے باہر لگے ناکوں سے بچ نکلنے کا ماہر ہوتا ہے۔ ڈرائیور نہ صرف ایک خطرناک مجرم ہوتا ہے بلکہ پولیس اہلکاروں کو ''کل کے بچے'' سمجھتا ہے۔ یہ مکمل اعتماد کے ساتھ پولیس ناکوں سے گزرتا ہے۔ پولیس اہلکاروں کو جل دینے کے لئے ''ڈرائیور'' خود ہی ناکے پر کھڑے اہلکاروں کو ''انگیج'' یعنی مصروف کرتا ہے۔ عام طور پر وہ ان کے قریب جا کر خود ہی بریک لگاتا ہے' اس کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ ناکے پر کھڑے اہلکاروں کو بھی علم ہو جاتا ہے کہ اس کار کا ڈرائیور ان کی طرف آ رہا ہے اس لئے وہ اسے رکنے کا اشارہ کرنے کی بجائے اس کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ''ڈرائیور'' ناکے پر گاڑی روکنے کے بعد پولیس اہلکاروں سے ہاتھ ملاتا ہے اور آگے راستے' پٹرول پمپ یا مسجد وغیرہ کا پوچھتا ہے۔ اس قسم کی ایک دو باتوں کے بعد وہ ان کا شکریہ ادا کرتا ہے' ہاتھ ملاتا ہے اور مسکراتا ہوا گاڑی کو آگے بڑھا دیتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے وہ ناکے سے بچ نکلتا ہے اور پولیس اہلکار بھی عموماً ایسے شخص کو مشکوک نہیں سمجھتے جو خود قانون کے پاس آ گیا ہو۔

ہماری پولیس آج بھی یہی سمجھتی ہے کہ جو مجرم ہے وہ پولیس ناکا دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ''ڈرائیور'' خود پولیس کے پاس نہ جانا چاہے تو پھر اس مقصد کے لئے دو تین اور افراد موقع پر موجود ہوتے ہیں جیسے ہی ڈرائیور ناکے کے قریب پہنچے وہ افراد کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس سے پولیس اور لوگ ان کی جانب متوجہ ہو جائیں اور ''ڈرائیور'' موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے آگے چلا جائے۔ یہ لوگ معمولی سے حادثہ یا لڑائی جھگڑے کی مدد سے پولیس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتے ہیں' ''ڈرائیور'' کے گزر جانے کے بعد ان کا جھگڑا بھی ختم ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ''ڈرائیور'' کو بھی اصل گینگ کا علم نہیں ہوتا' یہ صرف اس شخص کو جانتا ہے جو گاڑی کسی مخصوص جگہ پہنچانے کے

لئے اس کی خدمات لیتا ہے۔

"سورس" کے مطابق "ڈرائیورز" کو گاڑی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لئے دس سے چالیس ہزار تک کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ یہ معاوضہ گاڑی کی قیمت، راستے اور صورت حال کے حساب سے طے کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات گاڑی پہلے پوائنٹ سے آخری منزل تک پہنچانے کے لئے ایک سے زیادہ "ڈرائیورز" کی خدمات لی جاتی ہیں۔ اس طرح درمیان والی کڑی کے ڈرائیور کو سرے سے علم ہی نہیں ہو پاتا کہ اس گاڑی چوری کا اصل گینگ کون ہے۔ وہ ایک ڈرائیور سے دوسرے ڈرائیور تک گاڑی پہنچا رہا ہوتا ہے۔ اس طرح گینگ کا اصل ماسٹر مائنڈ ساری صورت حال پر نظر رکھتے ہوئے بھی گینگ تک پہنچنے کی کڑی توڑتا چلا جاتا ہے۔ راستے میں گرفتار ہونے کی صورت میں ڈرائیور کو علم ہی نہیں ہوتا کہ اب وہ کس کی نشاندہی کرے گا کیونکہ اس پر نظر رکھنے والے اراکین اس کی گرفتاری کی اطلاع فوراً پہنچا دیتے ہیں اور سبھی اپنے رابطہ نمبر ختم کر کے انڈر گراؤنڈ چلے جاتے ہیں۔ ذرائع کے مطابق زیادہ تر گاڑیاں رات کے وقت شہر سے باہر لے جائی جاتی ہیں کیونکہ اس وقت ناکے نہیں لگے ہوتے۔

اس سارے عمل کے دوران اصل مرحلہ چوری شدہ گاڑی کی فروخت ہے۔ اس سلسلے میں جعلی کاغذات بھی بنوائے جاتے ہیں اور بعض اوقات "تاوان" بھی وصول کیا جاتا ہے۔ "تاوان" کا عمل ابتدائی مرحلے میں طے کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں گاڑی چوری کرنے کے بعد محفوظ گیراج میں کھڑی کر دی جاتی ہے اور اصل مالک کو آفر دی جاتی ہے کہ وہ کچھ رقم دے کر اپنی گاڑی واپس لے سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایزی پیسہ کے ذریعے رقم منگوائی جاتی ہے۔ اگر تاوان مل جائے تو گاڑی کسی بھی جگہ کھڑی کر کے مالک کو بتا دیا جاتا ہے کہ اس کی گاڑی کس جگہ "لاوارث" کھڑی ہے۔ سورس کے مطابق کار لفٹر گینگ کے پاس متعدد سم کارڈز ہوتے ہیں فون کرنے اور ایزی پیسہ منگوانے کے بعد وہ سم کارڈ ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایزی پیسہ وصول کرتے وقت جو شناختی کارڈ دیا جاتا ہے وہ بھی جعلی ہوتا ہے۔ جب سورس سے پوچھا گیا کہ سم کارڈ کی بائیو میٹرک سسٹم کے ذریعے تصدیق ہونے کے بعد یہ سب کیسے ممکن ہے تو اس کا کہنا تھا کہ ہمارے لوگ حکومت اور نادرا پر تنقید کرنے کے لئے ایسے درجنوں شناختی کارڈ انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کر دیتے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی غلطی ہو۔ کہیں جنس کی غلطی ہوتی ہے تو کہیں تاریخ پیدائش غلط ہوتی ہے۔ اسی طرح ناموں کی غلطی والے شناختی کارڈ بھی آن لائن موجود ہیں۔ انہی شناختی کارڈ کی کاپی مجرم ایزی پیسہ کے ذریعے رقم وصول کرتے وقت جمع کروا دیتے ہیں۔ اس لئے عام شہریوں کو بھی چاہئے کہ اپنے شناختی کارڈ اس طرح اپ لوڈ نہ کریں۔ بائیو میٹرک سسٹم والے سوال کے جواب میں سورس نے انکشاف کیا کہ کار لفٹرز جعلی فقیروں، ملنگوں وغیرہ کے ذریعے سم کارڈ حاصل کرتے ہیں۔ جب پولیس سم کارڈ کے اس مالک تک پہنچتی ہے کہ وہ کسی سڑک کنارے بیٹھا بھیک مانگ رہا ہوتا ہے۔ اس کے پاس پہلے سے ہی رٹی رٹائی کہانی ہوتی ہے کہ کچھ "سرکاری ملازم" اسے لے گئے تھے اور انگوٹھے لگوا کر حکومت کی جانب سے ہزار روپے دیئے گئے تھے۔ یہ فقیر بعض اوقات اصل صورت حال سے واقف ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہی سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ حکومت نے کسی امدادی سکیم کے تحت انہیں ہزار روپے دیے تھے۔ دونوں صورتوں میں ان کی مدد سے کار لفٹر تک پہنچنا ناممکن ہوتا ہے کیونکہ انہیں اس کے اصل ٹھکانے یا درست نام کا علم نہیں ہوتا۔

کار لفٹرز کے حوالے سے سورس نے یہ انکشاف

بھی کیا ہے کہ یہ لوگ اپنے اصل خریداروں کے ساتھ ساتھ چند "مرغے" بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ یہ "مرغے" دراصل ایسے افراد ہوتے ہیں جو کبھی کبھار ایک آدھ گاڑی خرید کر آگے بیچ دیتے ہیں ان میں ورکشاپ کے مالک یا مکینک بھی شامل ہوتے ہیں۔ انہیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ وہ چوری شدہ گاڑی خرید رہے ہیں انہیں بیچی جانے والی گاڑی کے کاغذات بھی تیار کرائے جاتے ہیں۔ اگر کار لفٹر گینگ کا کوئی فرد پکڑا جائے تو وہ اصل گینگ یا گروپ لیڈر کا نام بتانے کی بجائے ان شریف انسانوں یعنی "مرغوں" میں سے کسی ایک کا نام بتا دیتا ہے۔ ظاہر ہے پولیس اس شریف انسان سے چوری شدہ گاڑی بھی برآمد کر لیتی ہے یا جسے اس نے گاڑی بیچی ہو اس تک پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح مال مسروقہ "برآمد" ہونے کی وجہ سے پولیس اسی شریف انسان کو اصل "گینگ" تسلیم کر لیتی ہے۔ پولیس کی توجہ اس جانب مبذول کرانے کے بعد گرفتار ہونے والے اصل مجرم کو اس کا گروپ لیڈر چھڑا لیتا ہے یا اس کی ضمانت کروا دیتا ہے۔ پولیس بھی اس زعم میں رہتی ہے کہ چور "چوری" کو پکڑنے کا بھلا اب کیا فائدہ، ہم نے تو اصل بندے کو گرفتار کر ہی لیا ہے۔ اس طریقے سے "کار لفٹر گینگ" مکھن میں سے بال کی طرح نکل جاتا ہے اور بے گناہ شہری جیل پہنچ جاتا ہے۔

عام طور پر کار لفٹر 10 گاڑیاں چوری کریں تو ان میں سے 3 کسی مرغے کو فروخت کر دیتے ہیں تاکہ مستقبل میں اسے پکڑوا کر خود کو بچایا جا سکے۔ اسی طرح کار چوری کرتے وقت بھی اس گینگ کے چند "معزز افراد" موقع واردات کے قریب ہی ہوتے ہیں۔ اگر چور یعنی لاک ماسٹر موقع واردات پر رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو یہ "معزز افراد" فوراً وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ "چور" کو گھیرے میں لے کر دو چار لگا دیتے ہیں اور گریبان سے پکڑ کر تھانے لے جاتے ہیں۔ یہ وہ "تھانہ" ہوتا ہے

کتابِ زندگی

☆زندگی کیا ہے؟ صرف یہ کہ لمحے صدیوں کے فاصلے ماپ لیتے ہیں اور وقت کی طنابیں ساحل کی ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتی چلی جاتی ہیں۔

☆ماضی ایسی کتاب ہے جس کے صفحے پیچھے کی طرف الٹ کر ہم سرزد ہوئے واقعات میں اصلاح نہیں کر سکتے۔ (حکیم ممتاز۔ میانوالی)

جہاں سے "لاک ماسٹر" چوری کرنے کی نیت سے آیا ہوتا ہے۔ عام شہری چونکہ تھانہ کچہری سے گھبراتے ہیں اور محض تماشہ دیکھنے تک محدود رہتے ہیں اس لئے عام طور پر کوئی بھی ان "معززین" کے ہمراہ "تھانے" تک نہیں جاتا تو اصل تھانیدار کو ایسے واقعہ کا علم ہی نہیں ہوتا لہٰذا پھر خود ہی یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ "چور" کو "خفیہ پولیس والے" سادہ لباس میں لے گئے تھے۔

ذرائع کے مطابق کار لفٹرز کے مختلف گروہ ہیں جو اپنے اپنے "حساب" سے کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ صرف چھوٹی گاڑیاں چوری کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی گاڑی کی چوری پر پولیس کا ردعمل کم ہوتا ہے۔ ایک تو اس کی رپورٹ درج کرنے میں ہی ٹال مٹول سے کام لیا جاتا ہے دوسرا رپورٹ درج ہونے کے بعد بھی زیادہ "کارروائی" نہیں ہوتی۔ عام طور پر ایسی گاڑیوں کو سپیئر پارٹس میں بدل دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے بدلے تاوان بھی وصول کر لیا جاتا ہے۔ ایسے گروہ لمبے چوڑے چکر میں بھی نہیں پڑتے۔ ان کے خیال میں بڑی اور مہنگی گاڑی کا مالک یقیناً انتہائی اثر و رسوخ کا مالک ہوتا ہے۔ ایسے افراد کی گاڑی چوری ہونے کے فوراً بعد شہر بھر میں ناکوں پر سختی کر دی جاتی ہے اور شہر سے باہر جانے والے راستوں کی نگرانی بھی سخت ہو جاتی ہے۔ یہ گروہ بڑی

گاڑی چوری کر کے اس قدر رسک لینے کی بجائے چھوٹی گاڑیاں چُرا کر "دیہاڑیاں" لگانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسری جانب ایسے گروہ بھی موجود ہیں جو صرف بڑی اور مہنگی گاڑی چوری کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑی گاڑی کو ہی روکا جاتا ہے اس کی نمبر پلیٹ اور حلیہ تبدیل کر کے اسے شہر سے باہر بھیجنے میں آسانی رہتی ہے۔ ایسی گاڑی یا تو فوراً ہی شہر سے باہر بھیج دی جاتی ہے یا پھر طویل عرصہ کے لئے محفوظ ٹھکانے پر کھڑی کر دی جاتی ہے تاکہ جیسے ہی معاملہ ٹھنڈا ہوا سے شہر سے باہر منتقل کیا جا سکے۔

عام طور پر کارلفٹر گروہ کو پکڑنے کے لئے قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنی کسی گاڑی میں ٹریکر لگا کر اسے ایسی جگہ لاوارث چھوڑ دیتے ہیں جہاں سے اسے چوری کرنے میں آسانی ہو۔ یہ چارہ ڈال کر پھر کار چوری ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ یہ محض ایک عام طریقہ ہے کیونکہ ممکن ہے گاڑی کئی روز تک چوری ہی نہ ہو۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہلکار نے نمائندہ فیملی کو بتایا کہ ایسے ٹریکر اس قدر مہارت سے لگائے جاتے ہیں کہ تلاش نہ کئے جا سکیں۔ اس کے مطابق عام طور پر لوگ اپنی گاڑی میں ٹریکر اور "چور لاک" لگاتے ہیں مگر "چور لاک" لگواتے وقت سب کچھ مکینک کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ مکینک ہر کار میں محض پانچ مخصوص پوائنٹ پر ہی "چور لاک" لگواتے وقت مکینک کی بجائے اپنی مرضی کی جگہ بتائی جائے جو جلد ذہن میں نہ آ سکے۔ قانون نافذ کرنے والے اہلکار نے اس بات کی سختی سے تردید کی ہے کہ ناکوں اور ہائی ویز کے اہلکار کارلفٹر سے ملے ہوتے ہیں۔ اس اہلکار کا کہنا تھا کہ روٹ پر موجود سب اہلکاروں کو ساتھ ملانا ممکن نہیں ہے اور ایسی صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے ناکے سے بحفاظت گزارنے کے بعد وہ اہلکار خود ہی رپورٹ کر دے اور کار چور اگلے کسی ناکے پر گرفتار کر لیا جائے۔ اسی طرح اہلکار کا یہ بھی کہنا تھا کہ یہ انتہائی خطرناک گینگسٹر بھی ہوتے ہیں اور اکثر اپنے تعاقب میں آنے والوں پر فائرنگ کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ جب اہلکار سے پوچھا گیا کہ ناکوں پر کسی گاڑی کو روکتے وقت اس کے "مشکوک" ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے تو اس نے بتایا کہ پولیس اہلکار بعض چیزوں پر نظر رکھتے ہیں۔ گاڑی چلانے والے کے انداز، اس میں موجود افراد کے حلیوں اور ایسی ہی چند وجوہات کے ساتھ ساتھ کچھ ٹیکنیکل چیزوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پرانی گاڑی پر نئی نمبر پلیٹ یا نئی گاڑی پر پرانی نمبر پلیٹ لگی ہو تو اسے مشکوک سمجھ کر روک لیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر نمبر پلیٹ کے پیچ کم ہوں یا کھلے ہوں تو ایسی گاڑی کو بھی چیک کیا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کار چوری میں بعض اوقات بہت بااثر افراد بھی ملوث پائے گئے ہیں۔ ذرائع کے مطابق اس کی ابتدائی ٹیم میں زیادہ تر عیسائی اور کچی بستیوں کے افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ چمن آگے جا کر بااثر سیاسی شخصیات تک پہنچتی ہے۔ نچلی ٹیم کو چند ہزار ملتے ہیں جبکہ بااثر شخصیات اس "کاروبار" کے ذریعے لاکھوں روپے کماتے ہیں اور ان گاڑیوں کو اپنے غیر قانونی دھندوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اس مسئلہ کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے واضح حکمت عملی ترتیب دیں۔ جب تک بڑے مگرمچھوں تک پہنچ کر انہیں عدالت کے کٹہرے میں نہیں لایا جائے گا تب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ یقیناً کارلفٹر انتہائی شاطر اور خطرناک افراد کا منظم گروہ ہوتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ قانون ان سے زیادہ بااثر ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے روایتی طریقہ کار کی بجائے جدید انداز اپناتے ہوئے بھرپور لائحہ عمل طے کیا جائے۔

ایک حقیقت ایک افسانہ

باہر کی عورت

یہ باہر کی عورت کا طعنہ میرے غرور کو خاک میں ملا گیا
عزت، مان اور نفس کی پامالی نے میرا منہ ہی بند کر دیا۔

☆ رمی شاہد

صبح صبح کا وقت سورج کی کرنوں کے نزول سے پہلے ہی ذمہ داریوں کا بن بلایا دعوت نامہ موصول ہو جاتا ہے۔ خدا کی عبادت کا فرض سر سے بوجھ کی طرح اتارتے ہی گھر اور گھرداری میں کسی فریضے کی طرح جت چکی تھی۔ بچوں کو سکول کے لئے جگانا کسی جنگ کے لئے بگل بجانے جتنا ہی مشکل اور اہم کام تھا۔ اسے ادا کرتے کرتے گھر کے کئی اہم کام بھی ساتھ ساتھ نبھاتی جاتی۔ اولاد تکمیل نئی خواہش کو پورا کرتی ہے تو پھر ان کی تکمیل بھی ہمارے ہی ذمے بنتی ہے۔ وہ کسی قابل ہو جائیں اور زندگی کی سرخروئی ان کے قدم چومے بس یہی تمنا مجھ میں اور حوصلہ بڑھا دیتی اور میں خود کو بھولے بس انہیں ہی یاد کرتی رہتی۔

لائف ٹائم گارنٹی جیسی مشین کی طرح صبح کا آغاز مستعدی سے کرتی بچوں کو تیار کرواتے، ناشتہ دیتے اور لنچ باکس بیگ میں ڈالتے ہوئے شوہر نامدار کو جگا کر ان کے حوالے کرتے ہوئے دو چار نصیحتیں کرتے اور سنتے ہوئے دعاؤں کے پھول ان کے اطراف بکھیرتے ہوئے انہیں رخصت کیا۔ دوسرے مرحلے پر دوبارہ گھرداری کا آغاز ہوا۔ شوہر صاحب کو میرے ہاتھ کے کام کی عادت اور تسکین تھی سو کسی ''دوسرے ہاتھ'' کی سہولت سے محروم ہی رہی بچوں کی سکول سے واپسی پر گھر کی دہلیز سے لے کر چولہے کی آگ تک سب تکمیل کا سفر طے کر چکے ہوتے ہیں۔

دن کا وقت دوپہر کے سائبان میں چلا آیا۔ بچوں

کی معصوم کہانیاں سنتے، کبھی ان کے ساتھ ہنستے کبھی روتے کبھی ڈانٹتے اور کبھی پیار کرتے سبھی مرحلے طے کرتی جاتی۔ یونیفارم کی تبدیلی سے پڑھائی کی جدوجہد تک ان کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی۔ دین کی فکر بھی دنیا کے ساتھ ساتھ غالب رہتی ہے مگر یہ غلبہ دنیا کے غلبہ سے بہت کم ہوتا ہے۔ یوں جیسے کسی نے چٹکی بھر ریت ساحل سے اٹھا کر سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دی ہو۔ قرآن فہمی اور نماز کے لئے 10 منٹ دینا بھی کچھ دیر کے بعد گویا بوجھ اور وقت کا ضیاع لگنے لگتا ہے پھر سوچتی کہ شاید یہ چند منٹ ہی بخشش کا ذریعہ ٹھہریں۔

یہ دنیاداری تو خوار کرتی ہے۔ فکر آخرت پر غالب رہتی ہے اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ رات کی آغوش نے تھکن کی چادر میں لپیٹ کر مجھے سپردگی نیند کر دیا۔ نیند کا آنا بھی گویا کمال ہی ہے یہ بہت سی تھکن چبھن، کمیوں، خامیوں اور تکلیفوں کو چن لیتی ہے۔ ٹھہراؤ دیتی ہے۔ پڑاؤ دیتی ہے مگر یوں لگتا کہ جیسے نیند میں بھی، میں دنیاداری اور ذمہ داری کے جھمیلے سے دور نہ رہتی سوچیں اور خواب اسی روش پر بیٹھے رہتے جو آغاز سے انجام تک تھیں۔ صبح سے شام تک تھیں۔ زندگی کے سنہرے سال اسی تگ ودو میں بیت گئے اپنی عمر اپنی آزادی، اپنے فیصلے کی تمنا، تربیت کی نہج پر پہنچ کر فنا کی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ یہ چولہے کی آگ اور گھر کی دہلیز سے آگے جانے کی ہمت ہی نہ رکھتی تھی۔ چکردار دائرے جو گھر، شوہر، بچوں پر مشتمل تھے میرے چاروں طرف رقصاں رقصاں رہتے اور تمناؤں اور خوابوں کے جگنو کمل کے مگرمچھ کے منہ میں خون و خون ہوتے رہتے اور ادھ موئے ہو کر پھر سے جینے کی طرف لوٹ آتے۔

بچے اب جوان ہو چکے تھے اور میری جوانی ان کے بچپن کی نذر ہو چکی تھی مگر میں خوش تھی آج بچے اس مقام پر ہیں جہاں کا خواب ہر والدین آنکھوں میں چھپائے دعائیں مانگتے رات سے دن اور دن سے رات کر دیتے ہیں۔

خوبصورت سا گھر، محبت کرنے والا شوہر، عزت و تکریم کرنے والی سسرال اور بااصول اولاد ایک عورت کو اور چاہئے بھی کیا؟ اور یہ ''اور چاہئے بھی کیا؟'' میں تباہی کے سوا کچھ نہیں چھپا خواہشات کے نہ پورا ہونے کی تباہی اور چاہ پانے کی خواہش کی تباہی، کرب کی کرچیاں وجود کو چھلنی کرنے آتی ہیں تو تکلیف ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔

میکے کو بھول کر سسرال میں خود کو سمونے کی خواہش عورت کو مکمل کر دیتی ہے پھر یہ تکمیل کن مرحلوں سے گزرتی ہے کوئی جان نہیں پاتا اور نہ جان سکتا ہے۔

آج میری بیٹی عمر کی اس نہج پہ جا پہنچی ہے کہ اس کی طلب نے لوگوں کو میرے گھر کی دہلیز تک لا پہنچایا ہے۔ مجھے ایک رشتہ بہت پسند آیا اچھے خاندانی سلجھے اور پڑھے لکھے لوگ۔ مگر میرے شوہر اور سسرال والوں کو ایک ہی اعتراض تھا کہ برادری کے لوگ ہوتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ معترض ہونے کی یہ وجہ میری سمجھ سے باہر تھی۔ اس میں مضائقے والی کوئی بات نہیں تھی ایک سمجھدار سلجھی ہوئی پڑھی لکھی لڑکی ایک غیر خاندان کو خود میں سمونے اور ان میں سمٹنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی ہے اور کم ظرف لوگ اپنے ہوتے ہوئے بھی اپنا پن ساری عمر نہیں دکھا پاتے۔ اسی وجہ کو انکار کی عینک پہنا کر پھینک دیا گیا۔ دن بیتتے گئے اور بات آئی گئی ہو گئی مگر میرے ذہن کی گرہیں وہیں بندھ گئی تھیں۔ لوگ میری مثالیں دیتے کہ میں نے کس طرح ایک خاندان کی جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا ہے۔

ایک دن اسی بات پر بحث دوبارہ شروع ہوئی۔ میرے شوہر اور سسرال والے ذات برادری کی مماثلت ہونے کے حق میں بضد تھے جب کہ میں اس بات کو حتی

نہیں مانتی تھی۔ بحث بڑھتی گئی۔ آخر تنگ آ کر میرے محبت کرنے والے شوہر نے بات بظاہر ختم کرتے ہوئے کہا کہ تم ان باتوں کی نزاکت کو کیا سمجھو تم تو 'باہر کی عورت' ہو۔

'باہر کی عورت'... 'غیر خاندان کی'

سالہا سال، دن رات، گھنٹے منٹ سیکنڈ اپنی ہر سوچ، تمنا، خواہش کو اپنے گھر کے لئے تیاگ دینے کے بعد بھی میں باہر کی، غیر خاندان کی عورت ہی رہی۔ ماں باپ کی تربیت اور حکم کو حرف آخر مان کر اپنا لہو اپنے گھر شوہر اور بچوں کو دے کر بھی میں خون کا حق ادا نہ کر سکی تھی۔

دہلیز پہ رکھا چمکتا ہوا کوئی ڈیکوریشن پیس جسے ہر آیا گیا دیکھتا ہے، سراہتا ہے مگر اپنا نہیں کہہ پاتا۔

یہ باہر کی عورت کا طعنہ میرے غرور کو خاک میں ملا گیا عزت، مان اور نفس کی پامالی نے میرا منہ ہی بند کر دیا۔

کیا باہر کی عورت گھر کی تکمیل کے لئے خود کو تیاگ دیتی ہے؟ وہ جو گن بنی گھر کے گرد گھومتی اپنی اولاد اور شوہر کے گن گاتی ہے؟

اپنی ذات اور خواہش کی یوں پامالی کرتی ہے؟

باہر کی عورت

سمجھ سے عاری

رشتوں کی نزاکت سے انجان

بے حس

خود غرض

بے راہ رو

ضبط کی خواہش تھی کہ انتہا آنسو بھی آنکھوں کے راستے آنے سے گریزاں نظر آئے۔

☆❋☆

احسن الخالقین

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟ (سورۃ محمد)

☆ محمد اعظم

قرآن حکیم کو پڑھنا تو ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کیونکہ اس کے ہر ہر حرف پر نیکیاں ملتی ہیں۔ بعض ان پڑھ مسلمان مرد و خواتین قرآن پڑھنا سیکھ لیتے ہیں اور پھر نیکیاں اکٹھی کرتے رہتے ہیں۔ جو مسلمان پڑھ لکھ سکتے ہیں ان میں کچھ تو قرآن حکیم کی آیات کے ساتھ ترجمہ پڑھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور چند لوگ وہ بھی ہوتے ہیں جو ترجمہ کے ساتھ ساتھ تفسیر بھی پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی منشا کو سمجھ سکیں۔ جب تک آپ کسی تحریر کو سمجھ نہ سکیں گے اس پر عمل کیوں کر کر سکیں گے؟

یہ تو تقریباً سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی 6666 آیات مبارکہ ہیں لیکن میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید ان لکھی ہوئی آیات کے علاوہ بھی کچھ آیات کا ذکر کرتا ہے جنہیں ہم نہ تو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں نہ غور و فکر ہی کرتے ہیں۔ میں یہاں قرآن حکیم کی کچھ آیات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جن سے آپ کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔

''زمین اور آسمانوں کی تخلیق اور دن رات کے فرق میں عقلمندوں کے لئے ''آیات'' (نشانیاں) ہیں۔''
(آل عمران:196)

''زمین آسمان کی تخلیق دن رات میں اختلاف سمندر میں تیرنے والی مفید کشتیوں اور گھٹاؤں میں جو زمین اور آسمان کے درمیان خیمہ آرا ہیں ارباب عقل کے لئے ''آیات'' (نشانیاں) موجود ہیں''۔
(سورۃ البقرہ:164)

اللہ تعالیٰ کی یہ آیات بظاہر تو بے ترتیب نظر آتی ہیں لیکن دراصل یہ سب ایک زبردست نظام کا حصہ ہیں جس طرح کوئی انسان قرآن حکیم کی ایک آیت نہیں بنا سکتا اسی طرح کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ان آیات کی طرز پر کوئی چیز تخلیق نہیں کر سکتا۔ یہ پھول، یہ چٹان، یہ پھل یہ گھاس، یہ چرند یہ پرند اور کائنات میں بکھرے ہوئے یہ

ستارے یہ سب انسان کو صدیوں سے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور انسان ان کے راز جاننے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ زمین پر بکھرے ہوئے ان رازوں کو جاننے اور سمجھنے کے لئے انسان کو گھر سے نکلنا پڑے گا تب وہ ان کی حقیقت کو سمجھ سکے گا۔ سورہ عنکبوت آیت نمبر 20 اللہ تعالیٰ کا فرمان ملاحظہ ہو۔ ''اے رسول انہیں حکم دیں کہ زمین پر چل پھر کر دیکھیں کہ کس طرح آفرینش کی ابتدا ہوئی''۔

جس طرح ہم نے قرآن کی آیات سے منہ پھیرا ہوا ہے اسی طرح ہم نے اللہ کی نشانیوں سے بھی منہ پھیر رکھا ہے۔

''ان لوگوں نے کلام الٰہی سے منہ پھیر لیا''۔ (آل عمران:87)

''ارض و سما میں کتنی ایسی آیات ہیں جن سے یہ لوگ منہ پھیر کر گزر جاتے ہیں''۔ (یوسف:10)

ذرا اس آیت پر بھی غور کریں۔

''کیا یہ لوگ زمین اور آسمان کی تخلیق اور جو کچھ اللہ نے اس میں پیدا کیا ہے پر غور نہیں کرتے، معلوم ہوتا ہے ان کی موت قریب آگئی ہے''۔ (الاعراف:85)

مطالعہ کائنات کی اہمیت کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ جتنی آیات انسان کی ذاتی زندگی کے متعلق نازل فرمائی ہیں اس سے زیادہ آیات مطالعۂ کائنات کے متعلق نازل فرمائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''غور کرو کہ پہاڑوں میں سفید سرخ اور سیاہ رنگ کے پتھروں کی تہیں موجود ہیں نیز انسانوں، چوپاؤں اور مویشیوں کے مختلف رنگوں کا مطالعہ کرو۔ یاد رکھو! اللہ سے اُس کے بندوں میں سے عالم ہی ڈرتے ہیں''۔ (سورہ فاطر:27-28)

فارسی کی ایک مثل ہے۔ ''بے علم اپنے خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا''۔ جس طرح آپ دنیا میں گزرے ہوئے بڑے لوگوں کا مطالعہ کئے بغیر ان کے بڑے پن کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بالکل اسی طرح آپ کو اپنے عظیم رب کی عظمت و رفعت نظام ربوبیت کمال تخلیق اور حیرت انگیز کمالات کو سمجھنے کے لئے صحیفۂ فطرت پر ضرور غور و فکر کرنا پڑے گا۔

ایک عجیب بات پر غور فرمائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اولاد ملتے ہی اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہیں۔

''اس اللہ کا شکر ہے کہ جس نے بڑھاپے میں دو بیٹے اسمٰعیل اور اسحٰق عطا فرمائے''۔ (سورہ ابراہیم:29)

اسی طرح یوسف علیہ السلام جیل سے رہائی ملنے کے بعد یوں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

''اللہ نے جیل سے نکال کر مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا''۔ (سورہ یوسف:100)

لیکن ہم کتنے خوش قسمت ہیں جنہیں اللہ نے سورہ فاتحہ عطا فرمائی۔ جسے ہم نماز میں بار بار پڑھتے اور اس کی پہلی آیت ہی شکریہ سے شروع ہوتی ہے۔

ہم نے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کو زبانی جمع خرچ کے ساتھ محدود کر رکھا ہے اور جن اقوام نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کو عملی شکل دی وہ زمانے میں سرخرو ہو گئی ہیں اور یہ اقوام لوہے تانبے بارود اور دیگر زمین میں چھپے ہوئے خزانے تلاش بھی کر رہی ہیں اور ان سے فوائد بھی حاصل کر رہی ہیں اور حد یہ ہے کہ ہمیں اپنے ان خزانوں کو تلاش کرنے کے لئے بھی ان ہی سے مدد کی درخواست کرنی پڑ جاتی ہے۔ وجہ اس کی وہی ہے کہ ہم نے صحیفہ کائنات کی آیات کو پڑھنے اور سمجھنے کوشش ہی نہیں کی اور دوسری اقوام مسلسل اس صحیفہ کا مطالعہ کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ سورج ہمیشہ مشرق سے ہی نکلتا ہے اور مغرب میں ہی غروب ہوتا ہے بالکل اسی طرح علم و تہذیب کا سورج بھی مشرق سے ہی طلوع ہوا۔ چین، برصغیر، بابل (عراق) اور مصر کی تہذیبیں قدیم

ترین تہذیبیں مانی جاتی ہیں اور پھر ساتویں صدی عیسوی میں ریگستان عرب سے علم وعرفان کا ایک چشمہ پھوٹا جس نے مشرق ومغرب پردو اطراف کو نئی روشنی عطا کردی۔

کچھ عرصہ بعد یہ علم وتمدن کا آفتاب مغرب کی طرف بڑھا اور پورے یورپ کو اپنی روشنی سے منور کردیا لیکن لگتا ہے علم وعرفان کے نئے چشمے اب پھر مشرق کی طرف سے پھوٹنے والے ہیں۔

اب ذرا ہم ان آیات کی طرف چلتے ہیں جو اس کائنات میں بکھری ہوئی ہیں۔ پانی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''اور ہم نے ہر چیز کا مدار حیات پانی کو قرار دیا''۔
(سورہ انبیاء:30)

ذرا غور فرمائیں اس زمین پر زندگی پانی کی مرہون منت ہے جب کسی بھی زندہ مخلوق کے جسم میں سے پانی ختم ہو جائے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتی بچوں کو پیچش کی شکایت ہوتی ہے تو ڈاکٹر فوراً ڈرپ لگا دیتے ہیں کہ کہیں بچے کے جسم سے پانی ختم ہی نہ ہو جائے۔ جب پانی زندگی کے لئے اس قدر اہم ہے تو پھر اس کی مقدار بھی زیادہ ہونا چاہئے ہم دیکھتے ہیں کہ زمین پر خشکی ایک حصہ اور سمندر 3 حصہ بنائے گئے ہیں اس کے علاوہ جھیلیں، دریا اور پہاڑوں پر بے شمار برف جمادی گئی ہے جو گرمیوں میں پگھل پگھل کر دریاؤں کے ذریعہ سمندر میں پانی پہنچانے کا سبب بنتی ہے چونکہ سمندر کا پانی مسلسل عمل تبخیر کے ذریعہ بھاپ بن کر اڑتا رہتا ہے اس لئے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ سارا انتظام کیا گیا ہے۔

اب کچھ مقداروں کی بات کرتے ہیں۔ چاول اور گندم کی ترکیب ایک ہی ہے۔ یعنی دونوں میں ایک ہی طرح کے آٹھ عناصر موجود ہیں لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ گندم کے پودے کے ساتھ روئی اور روئی کے پودے ... تو وجہ یہ ہے کہ ان میں موجود سالمات کی مقدار الگ الگ ہے۔

کوئلے اور ہیرے کی بنیاد کاربن ہی ہے لیکن ہیرا شاہی تاجوں پر جڑا ہوتا ہے اور کوئلے کی قسمت میں جلنا ہی ہے۔

کالی مرچ اور لیموں بردو ہائیڈروجن 10 حصے اور کاربن 20 حصے سے تیار ہوئے ہیں لیکن دونوں کے ذائقوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں بھی وجہ سالمات کا اختلاف ہی ہے۔ اب سورۃ قمر کی آیت نمبر 49 کا ترجمہ پڑھیں تو بات خود ہی واضح ہو جائے گی۔

''ہم نے ہر چیز کو معین مقدار سے پیدا کیا ہے''۔

کائنات کی ہر شے عناصر کی عجیب وغریب آمیزش سے تیار ہوتی ہے اگر ان تراکیب میں ذرہ بھر فرق آ جائے تو سلسلہ حیات درہم برہم ہو جائے۔

میں نے ابھی سالمات کا ذکر کیا ہے تو سالمات کے متعلق بھی آپ کو بتا دوں کہ سالمات کیا ہوتے ہیں۔ تمام کائنات کی ترکیب بجلی کے خوردبینی ذرات یعنی (Electrons) سے بنی ہے ان (Electrons) میں مثبت اور منفی ذرات ہوتے ہیں جو مل کر (Neutron) بنتے ہیں جنہیں اردو میں عقیمہ کہا گیا اور یہ چند عقیمے مل کر ایٹم بن جاتے ہیں اور ایٹموں کا مجموعہ مالیکیول (Molecule) کہلاتا ہے اور حیرانگی کی بات ہے کہ ہر مالیکیول بجلی کا ایک ایک چھوٹا سا خزانہ ہے۔ مالیکیول کو ہم اردو میں سالمہ کہتے ہیں۔

تمام نباتات کی ترکیب بھی انہی ذرات برقیہ سے ہوئی ہے۔ نباتات میں عنصر نباتی کی ترکیب خلیوں سے ہوتی ہے جنہیں انگریزی میں (Cells) کہا جاتا ہے۔ ہر خلیہ میں مثبت اور منفی حصہ ہوتا ہے۔ ہر خلیہ کوئی مردہ چیز نہیں بلکہ ایک نہایت حساس اور پیچیدہ خزانہ حیات ہے جس کے مقابلے میں بڑی بڑی مشینیں بھی سادہ معلوم ہوتی ہیں۔

جس طرح مالک کائنات نے نباتات کو حالات کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ بخشا ہے اسی طرح ہر حیوان کو بھی حالات کے مطابق نئے اعضاء و آلات عطا فرمائے ہیں۔ پرندوں کی چند ہڈیاں صرف گیس سے بھری ہوتی ہیں تاکہ پرندہ ہوا میں اپنا بوجھ آسانی سے اٹھا سکے۔ مینڈک کی وہ جھلی جو پانی میں تیرنے کے کام آتی ہے۔ خشکی پر پھیپھڑے کا کام سرانجام دینے لگ جاتی ہے۔ اسی طرح مچھلی کو پانی میں رہنے کے لئے جن آلات کی ضرورت ہے۔ وہ سب عطا ہوئے ہیں بات پھر غور و فکر پر ہی آ کر رکے گی۔ یہ سب باتیں غور و فکر سے ہی تو معلوم ہو سکتی ہیں ناں۔

ایک پروفیسر انسانی کان کا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ اچانک پکار اٹھا۔ ”جس خدا نے یہ کان انسان کو سننے کے لئے دیئے ہیں یقیناً وہ اس سے بہت زیادہ سننے کی طاقت رکھتا ہے“۔ قرآنی آیت کا ترجمہ ہے۔ ”بے شک اللہ سب کچھ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے“۔ لگتا ہے پروفیسر کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قرآن کی اسی آیت کا ترجمہ تھے۔

سائنسدانوں نے زمین کی آفرینش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ زمین کو انسان کے رہنے کے قابل بننے میں لاکھوں صدیاں صرف ہوئیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ایک ایسی مخلوق تخلیق کی جس کو عقل و خرد، علم اور عمل کی قوتیں بھی عطا کیں۔ اگر یہ دنیا اسی طرح چلتی رہی تو ہزاروں سال کے بعد جو انسان دنیا میں آئیں گے ان کے لئے ہماری یہ تیز رفتار ٹرینیں، یہ کاریں اور جہاز عجائب گھروں میں رکھنے کے قابل ہوں گے کیونکہ ان کی گاڑیاں آج کی گاڑیوں سے ہزاروں گنا زیادہ رفتار سے چل رہی ہوں گی۔

انسانی جسم کی بناوٹ پر غور فرمائیں۔ ایک ڈاکٹر جب کسی مریض کا آپریشن کرتا ہے تو اس کو امید ہوتی ہے کہ اس کے آپریشن کی وجہ سے انسانی جسم میں جو کمی واقع ہوگی وہ انسانی جسم میں موجود ایک خودکار نظام پوری کر دے گا۔ اگر تلافی کا یہ سلسلہ انسانی جسم میں موجود نہ ہوتا تو کبھی ڈاکٹر عمل جراحی نہ کرتا اور مریض یونہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو جاتے۔

سورہ اعراف آیت نمبر 158 میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ”کیا یہ لوگ کائنات ارض و سما اور دیگر اللہ کی تخلیقات پر غور نہیں کرتے؟ شاید ان کی موت قریب آ گئی ہے“۔

پھر مجھے کہنا پڑ جاتا ہے کہ اپنے عظیم رب کی عظمتوں اور رفعتوں کو سمجھنے کے لئے علم بہت ضروری ہے۔

مشہور مفکر آئن سٹائن نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ”وہ انسان جو کائنات پر اظہار تعجب کے لئے ٹھہرتا نہیں اور اس پر اللہ کے خوف اور اس کے تقویٰ کی کیفیت طاری نہیں ہوتی وہ مر چکا ہے اور اس کی آنکھیں بصارت سے محروم ہو چکی ہیں“۔ اس کے یہ الفاظ قرآن کی آیت مبارکہ کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

ہم بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ نہایت ہی گہری وادیاں دیکھ کر حیرت و تعجب میں ڈوب جاتے ہیں لیکن یہ کبھی تو سوچیں کہ ان حسین مناظر کی خالق وہی ہستی ہے جس نے میدان، ریگستان، دریا اور سمندر بھی تخلیق کیے۔ تخلیق کے بعد جس کو خوبصورت پھولوں اور پھلوں سے مزین کیا۔ زمین کی تخلیق کے وقت ہر طرف پانی ہی پانی تھا زمین پر کئی زلزلے آئے اور ان زلزلوں کے نتیجے میں پہاڑ ابھر آئے زمین کہیں سے اونچی ہو گئی اور کہیں سے نیچی ہو گئی پانی نشیب کے علاقوں میں اکٹھا ہو گیا۔ یوں بڑے بڑے سمندر وجود میں آ گئے اونچے علاقوں میں موجود پانی ندی نالوں اور دریاؤں کے ذریعہ سمندر کی طرف رواں دواں

ہوگیا۔ غور کریں تمام دریا خشکی سے سمندر کی طرف جاتے ہیں کہیں بھی ایسا نہیں کہ کوئی دریا سمندر سے خشکی کی طرف بہتا ہو۔

ماہرین علم الاسماء کے مطابق اس کائنات میں ہمارے سورج سے لاکھوں گنا بڑے بے شمار سورج موجود ہیں اور نہایت تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں اور ہماری زمین کی حیثیت محض ایک ذرے کی سی ہی ہے لیکن قربان جائیں اس رب کریم کے کہ اس نے اس ذرے کو عزت بخشی کہ اسے انسان کے لئے موزوں بنایا اور پھر انسان کو بھی تکریم بخشی کیونکہ پوری کائنات میں ایک انسان ہی ہے جسے رب نے عزت اور توقیر بخشی ہے اللہ کا فرمان ہے بنی اسرائیل کی آیت مبارکہ۔

"اور ہم نے انسان کو کائنات میں عزت والا بنایا"۔

اور اب میں چند خاص خاص باتیں حشرات کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض حشرات کا ذکر فرمایا ہے اور سورتوں کا نام بھی ان ہی حشرات کے نام پر ہے مثلاً نحل، نمل اور عنکبوت۔

اللہ تعالیٰ انسان سے یہ نہیں چاہتے کہ انسان کھائے پیئے اور پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے سو جائے بلکہ وہ خالق ارض وسما کی برابر تخلیق پر غور وفکر کرے اور اس رب کی حمد وثناء بیان کرتے ہوئے اسے عجیب کی قسم لذت محسوس ہوگی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر چیونٹیوں کے بل کے پاس سے گزرتا ہے تو ایک چیونٹی اپنی ساتھی چیونٹیوں کو کہتی ہے۔ "اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمانؑ کا لشکر تمہیں کچل نہ ڈالے" (سورہ نمل: 18)۔

اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم سوچیں کہ یہ معمولی مخلوق جس کو حقیر سمجھتے ہیں کس طرح پیغام اپنی ساتھی چیونٹیوں تک پہنچاتی ہیں۔ یہ بظاہر نظر آنے والی حقیر مخلوق عقل و دانش کی بنا پر حشرات میں ایک خاص مقام رکھتی ہے گھر تعمیر کرنا۔ جماعت کی شکل میں رہنا۔ سپاہ گری اور کاشت کاری کے علاوہ ڈسپلن میں درجہ کمال پر ہے۔

عنکبوت مکڑی کو کہتے ہیں یہ اکثر گھر کے کونوں میں اپنا جالا نما گھر بنا لیتی ہے جسے دیکھتے ہی ہم ملیامیٹ کر دیتے ہیں لیکن کبھی اس جالے پر غور نہیں کرتے۔ مکڑی اپنا گھر یا جالا نہایت باریک تاروں سے بناتی ہے۔ ہر تار 4 باریک تاروں کا مجموعہ ہوتا اور ہر باریک تار ہزاروں کم باریک تاروں سے بنا ہوتا ہے۔ مکڑی کے جسم میں 4 ہزار باریک نلیاں ہیں۔ ہر نالی سے ایک تار نکلتا ہے اور پھر آگے 4 سوراخ ہوتے اور ہر سوراخ میں ایک ہزار تار داخل ہو کر ایک تار بن جاتے ہیں یوں سمجھیں کہ مکڑی کا جسم تار بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ ہوتا ہے۔ پھر مکڑی ان تاروں پر ایک خاص گوند کا لیپ کر دیتی ہے جس کی وجہ سے یہ تار اتنے مضبوط ہو جاتے ہیں کہ کتنی ہی تیز ہوا ہو یہ ٹوٹتے نہیں۔

شہد کی مکھی بھی کوئی کم عجیب چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "تیرے رب نے شہد کی مکھی کو یہ وحی کی پہاڑوں درختوں اور بیلوں پر اپنا گھر بنا تمام پھلوں سے شہد حاصل کر اور اپنے رب کے دیئے ہوئے دستور کو باقاعدگی بنا۔ اس مکھی کے پیٹ سے ایک شربت نکلتا ہے جس میں امراض کے لئے شفا ہے"۔ (سورہ نحل)

"مکھی کے ان اعمال میں لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں"۔

شہد کی مکھی کا نچلا ہونٹ لمبا ہوتا ہے، پھول سے رس نکالتے وقت وہ پھیل جاتا ہے اور یوں وہ پھول کی اندرونی تہہ تک سے رس سمیٹ لیتا ہے۔ اس رس کا کچھ حصہ تو مکھی پی جاتی ہے اور کچھ حصہ غذائی نالی کے قریب موجود ایک تھیلی میں بھر لیتی ہے۔ تھیلی میں اس رس پر کچھ کیمیائی عمل ہوتا ہے اور وہ چھتے پر جا کر رس خانوں میں انڈیل دیتی ہے۔ یوں شہد چھتے میں جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

شہد کی مکھی کے چار پر ہوتے ہیں جب مکھی اڑتی ہے تو وہ پر آپس میں جڑ کر ایک پر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ شہد کی مکھی کی پانچ آنکھیں ہوتی ہیں۔ تین سر کی چوٹی پر اور دو دائیں بائیں۔ آنکھیں حرکت نہیں کر سکتی ہیں اور انہیں حرکت کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ وہ ایک وقت میں ہزاروں چیزوں کو دیکھ سکتی ہے۔ شہد کی مکھی کا ایک خاص طریقہ ہے کہ جب وہ خوراک حاصل کر چکتی ہے تو وہ سیدھی آسمان کی طرف اٹھتی ہے اور پھر خط مستقیم پر اپنے چھتے کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

اب کچھ باتیں نباتات کے متعلق بھی ہو جائیں۔ جس طرح جانور گھاس کو کھاتے ہیں انسان فصل اور سبزیاں اگاتا ہے تاکہ انہیں کھا سکے اسی طرح زمین پر اگنے والی ان نباتات کو بھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے پانی تو یہ اپنی جڑوں کے ذریعہ حاصل کر لیتے ہیں لیکن خوراک کہاں سے آئے گی۔ انسان اپنی فصلوں کو خوراک مہیا کرنے کے لئے ان میں کھاد ڈال دیتا ہے۔ یوں یہ فصلیں اپنے وقت پر پک کر تیار ہو جاتی ہیں لیکن اگر کوئی زمین کمزور ہو اور فصل صحیح طور پر تیار نہ ہو رہی ہو تو کسان کچھ عرصے کے لئے اس زمین کو خالی چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد وہی زمین ایک اچھی فصل دے دیتی ہے۔ اس زمین میں یہ طاقت کیسے پیدا ہو جاتی ہے؟ یہ کسان نہیں جانتا لیکن ہمیں تو جاننا چاہئے۔

دراصل زمین کو شادابی کے لئے نائٹروجن گیس کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ زمین پر بہت کم مقدار میں موجود ہے میرے رب نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ یعنی زمین کے اندر بے شمار ایسے جراثیم پیدا کر دیئے ہیں۔ جو نائٹروجن خارج کرتے رہتے ہیں یوں وہ زمین جو کچھ عرصہ فارغ رہتی ہے۔ وہ فصل پیدا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اگر کبھی موقع ملے تو درختوں پر غور کریں آپ محسوس کریں گے ہر درخت کے ساتھ بے شمار بیج لگے ہیں

جو اس درخت کی نسل کو آگے بڑھانے کا سبب بنتے ہیں پھر ان بیجوں کی حفاظت کا بھی مکمل انتظام موجود کوئی چھلکوں میں بند کر دیے اور کسی کے اوپر موٹا چھلکا چڑھا دیا تا کہ وہ بیج محفوظ رہے۔

اگر کسی دن آپ کا گزر کسی ربڑ پلانٹ کے پاس سے ہو تو ذرا غور فرمایئے گا بہت سے سرخ رنگ کے گول نوک دار غلاف نیچے زمین پر پڑے ہوں گے آپ اوپر درخت کی طرف دیکھئے گا ایک حیران کن صورت حال ہو گی کہ ہر پیدا ہونے والا نیا پتہ ایک ایک غلاف میں لپٹا ہوا ہے جب پتہ مکمل ہو جاتا ہے تو وہ غلاف نیچے گر جاتا ہے اور ایک گلابی رنگ کا نازک سا پتہ مسکراتا ہوا ظاہر ہو جاتا ہے۔ یوں اللہ کی قدرت کا ہر منظر ہی قابل دید ہے لیکن جب آپ اس منظر کو دیکھیں تو اپنے رب کی پاکی ضرورت بیان کیجئے گا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ العظیم!

اب کچھ بیں دور حاضر کی معلومات قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں جو کہ کچھ دن پہلے ہی میرے علم میں آئی ہیں اور یوں بھی ہر انسان پر لازم ہے کہ جن باتوں کا علم اس تک پہنچے اسے دوسروں تک ضرور پہنچائے اسے اپنے دماغ میں جمع نہ کر دے۔

ہمارا سورج توانائی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اربوں سال سے یہ یوں ہی روشن ہے اور اس پر روزانہ دھماکے ہوتے ہیں یہ دھماکے روزانہ 120 ملین ٹن مادے کو ہیلیم گیس میں تبدیل کرتے ہیں اور یہ ہیلیم گیس ایک سیکنڈ میں ہماری زمین کی پانچ لاکھ کی ضرورت کے برابر توانائی پیدا کرتی ہے۔ سورج ہر روز زمین پر روزانہ ایک لاکھ 70 ہزار ٹیرا واٹ توانائی بھیجتا ہے جو ہماری زمین کی کل ضرورت سے پانچ ہزار گنا زیادہ ہے۔ سورج میں یہ توانائی فیوژن کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ فیوژن میں ہائیڈروجن گیس کے دو ایٹم ملتے ہیں اور یہ ایٹم ہیلیم گیس بناتے ہیں اور اس سارے عمل میں ہزار ایٹم بم کے برابر توانائی پیدا ہوتی ہے۔ ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس کے ری ایکشن کو فیوژن کہتے ہیں۔ اگر انسان سورج سے زمین تک پہنچنے والی اس توانائی کا جائزہ لے تو اس عمل کو سمجھ کر انسان کی عقل گم ہو جاتی ہے یا اللہ اتنا بڑا انتظام، یہ سب کچھ تیرے ہی اختیار میں ہے۔

سائنسدان ایک عرصے سے سورج کو فوکس کر رہے ہیں یہ گیس اور پٹرول کی محتاجی سے نکلنے کے لئے زمین پر سورج جیسا لیکن محدود اور کنٹرولڈ فیوژن کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے فیوژن ری ایکٹر بنایا جا رہا ہے یہ ری ایکٹر چین میں زیر تعمیر ہے اور اس ری ایکٹر کو تیار کرنے میں دنیا کے دوسرے ممالک بھی چین کی مدد کر رہے ہیں۔ فیوژن کے لئے ہیلیم گیس درکار ہوگی جو کرۂ ارض پر بہت کم مقدار میں موجود ہے۔ ہمارے قریب ترین ہمسایہ یعنی چاند پر یہ گیس موجود ہے اور اس کی مقدار 50 لاکھ ٹن ہے۔ چین نے چاند سے یہ گیس لانے کے منصوبے پر کام شروع کر دیا ہے۔ جب یہ ری ایکٹر کام شروع کرے گا تو چین کی بجلی کی ضرورت ایک طویل عرصے تک کے لئے اس منصوبے سے پوری ہو جائے گی۔

جاپان بھی پیچھے نہیں۔ جاپان کی ایک کمپنی نے چاند کے خط استوا پر 250 ملین لمبی سولر پینل بیلٹ لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ پینل سورج کی شعاعوں کو بجلی میں تبدیل کرے گا اور بجلی یہ بجلی لہروں کے ذریعہ زمین پر موجود سٹیشن تک پہنچے گی اور یہاں پر ان لہروں کو دوبارہ بجلی میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ یہ اتنا بڑا منصوبہ ہے کہ جاپان اس وقت امریکہ کی کل پیداوار سے تین گنا بجلی حاصل کر سکے گا۔

اللہ کی ان آیات کا کہیں کہیں ذکر ہوگا وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے لیکن ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ذرا سوچئے گا!

***

پٹھان کوٹ سے پسرور تک

سکھوروں کی فوج مجھ پر پل پڑنے کو پر تول رہی ہے۔ مجھے چیر پھاڑ دیں گے۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔ ان سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔ میں پیٹھ کے بل دشمن پر پڑا ہوں۔

☆ مسافر

ڈاک میں کاغذوں کا ایک پلندہ ملا۔ کھولا تو سب سے پہلے ایک خط نظر آیا۔ لکھا تھا۔

"اگست کا مہینہ آ رہا ہے۔ اگست 1947ء کے زخم پھر کھل گئے ہیں۔ میں 1947ء میں پٹھانکوٹ کے ایک گاؤں سے ہجرت کر کے پسرور پہنچا تھا۔ میں نے پاکستان کے لئے اپنی بیوی اور چھوٹے چھوٹے دو بچے پٹھانکوٹ کے قریب ذبح کروائے تھے اور خود جنگلوں اور بیابانوں میں بھٹک بھٹک کر پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا تھا۔ اگر آپ برا نہ منائیں تو میں کہوں گا کہ میں پاکستان میں بھی بھٹک رہا ہوں۔ ہندوستان کے جنگلوں میں میری طرح ہی ایک مسلمان عورت بھی بھٹک رہی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اب وہ میری بیوی ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ پاکستان کہاں ہے جسے قائداعظم نے قرآن کی سرزمین کہا تھا؟ اگر قرآن کا فرمان یہی ہے کہ خدا اور رسول کی سرزمین پر چوری، ڈکیتی، آبروریزی، اغوا، رشوت خوری، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی اخلاقی تباہی اور ہر طرح کی بدکرداری ضروری ہے تو میں دل پر پتھر رکھ کر اس پاکستان کو قبول کرلوں گا۔ میں نے یہ ڈائری 1947ء میں ہجرت کے دوران نہیں لکھی تھی۔ کوئی تین مہینے ہوئے میں پاکستان کی موجودہ اخلاقی اور معاشرتی حالت سے گھبرا کر سرحد کے قریب ایک درخت تلے جا بیٹھا۔ میں اسی سمت سے پاکستان میں داخل ہوا تھا۔ مجھے اگست 1947ء کا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا اور پھر اس طرح محسوس ہونے لگا جیسے میں پھر وہ کٹھن سفر طے کر رہا ہوں۔ میں نے کاغذ قلم لے کر روز بروز ڈائری لکھنی شروع کردی۔ یہ ڈائری آپ کی نذر کرتا ہوں۔ میں اپنی قوم کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مہاجرین کس طرح پاکستان کے ایک بڑے ہی خوبصورت تصور سے کھچے ہوئے کیسی کیسی مصیبتیں جھیلتے ہوئے پاکستان آئے تھے۔ یہ مجھ اکیلے کی بپتا نہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ کتنے ہزار مہاجرین راستے میں ہی بھوک، پیاس، تھکن اور زخموں سے چُور ہو کر شہید ہو گئے تھے۔ اگر آپ اسے شائع کردیں تو شاید کسی کو پاکستان کی قیمت کا اندازہ ہو جائے۔ زمین کا یہ خطہ ہمیں مفت نہیں ملا تھا۔

پاکستان کا شیدائی ۔۔۔۔ مسافر

محترم مسافر! آپ کی ڈائری لفظ بہ لفظ شائع کی جا رہی ہے۔ بہت طویل ہونے کی وجہ سے اسے دو قسطوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ (مدیر)

---

17 اگست 1947ء

آج پاکستان کی عمر تین دن ہوگئی ہے۔ آج کا دن ہماری عمر کا آخری دن ہے۔ ہم پاکستان سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ کوئی ایک سو میل بتاتا ہے۔ ہمارے لئے اب پچاس اور ایک سو میں کوئی فرق نہیں رہا۔ کوئی یقین دلا دے کہ پاکستان صرف دس قدم دور ہے تو بھی ہم نہیں پہنچ سکیں گے۔ گاؤں کو ہندوؤں اور سکھوں نے گھیر لیا ہے۔ ہم سینکڑوں مسلمان، عورتیں اور بچوں سمیت گاؤں میں قید ہو گئے ہیں۔

کافروں کے پاس بندوقیں، برچھیاں اور تلواریں ہیں۔

گاؤں کا نام تھلیال ہے، پٹھانکوٹ سے چند میل دور پہاڑی جنگلوں میں یہ گاؤں اتنا چھوٹا سا ہے کہ ہندوستان کا نقشہ بھی اسے نہیں پہچانتا۔ ہندوستان کے جغرافیے میں تھلیال کی کوئی حیثیت نہیں مگر آج ہندوؤں اور سکھوں کے لیے تھلیال دلی اور آگرہ بن گیا ہے کیونکہ یہاں سینکڑوں مسلمان اور ان کے بیوی بچے محصور ہیں۔

تھلیال کی اپنی کوئی ایسی آبادی نہیں۔ تین سو نہ ہوئی تو ساڑھے تین سو افراد ہوں گی لیکن آج تھلیال کے کچے مکانوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں کیونکہ اردگرد کے دیہات کے مسلمان کنبے بھاگ کر تھلیال میں جمع ہو گئے ہیں۔

میں بھی اپنی بیوی اور چھوٹے چھوٹے دو بچوں کو ساتھ لیے صبح کے وقت تھلیال میں داخل ہوا تھا۔ یہاں سے ہمیں قافلے کی صورت پاکستان کے لیے روانہ ہونا تھا مگر معلوم نہ تھا کہ تھلیال موت کا پنجرہ بن جائے گا۔

دن کے بارہ بج رہے ہیں۔

پاکستان میں نئی زندگی جنم لے چکی ہے۔ ہم بہت تیزی سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔

پاکستان میں مٹھائیاں بٹ رہی ہوں گی۔ دعوتیں اڑ رہی ہوں گی۔ تھلیال میں ہمارے بچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔ خوف سے ماؤں کی چھاتیاں سوکھ گئی ہیں۔

کل سوچا تھا کہ پاکستان کیسا ہوگا؟ پاکستان کے تصور نے روح پر نشہ طاری کر دیا تھا۔ آج سوچ رہا ہوں میری موت کیسی ہوگی؟ میری بیوی اور میرے چھوٹے چھوٹے دو بچے پاکستان سے کوسوں دور کس طرح مریں گے؟ جل کر...... کٹ کر...... تڑپ تڑپ کر؟

ہم باہر سے آئے ہوئے مسلمان تھلیال کے مسلمانوں کے گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں کچھ آدمی چھتوں پر جا چڑھے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد منڈیر سے کسی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔

''خبردار، بھئی اوئے! سکھ قریب آ رہے ہیں''۔

پاکستان کی عمر کے تیسرے دن کی دوپہر ڈھلنے لگی ہے۔ قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ چھتوں پر بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور گاؤں میں دبکے ہوئے مسلمانوں کے واویلے میں ڈوب گئی ہیں۔

آگ...... آگ...... آگ!

جے کارے...... ہر ہر مہادیو...... ست سری اکال

خوفزدہ عورتوں اور بچوں کی چیخیں...... بھگدڑ...... افراتفری۔ نفسانفسی...... ایک شور...... ایک ہی آواز...... کافروں نے گاؤں کو چاروں طرف سے آگ لگا دی ہے۔

شعلے ہر طرف سے بڑھ رہے ہیں...... اگست کی دوپہر جل اٹھی ہے۔ مکانوں کے اندر اتنی تپش کہ جسم جھلس رہے ہیں۔

آگ کے شعلوں کی ڈراؤنی تڑاخ تڑاخ اور ایک بھیانک آواز جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی، اتنی بلند ہو گئی ہے کہ خوف سے جسم کی طاقت سلب ہو گئی ہے۔ اس خوفناک آواز میں گولیاں بھی چل رہی ہیں۔ زندہ جلنے والے مسلمانوں اور ان کے بچوں کی آخری چیخیں بھی سنائی دے رہی ہیں۔ فضا میں بدبو پھیل رہی ہے۔ انسان کا گوشت جل رہا ہے۔

میں جس کمرے میں ہوں وہ کسی کچے مکان کا ہے۔ صرف ایک دروازہ ہے۔ کھڑکی نہ روشندان۔ اس کمرے میں ایک سو سے زیادہ انسان اس طرح کھڑے ہیں جس طرح جھاڑو بندھی ہوئی ہو۔ بچے بلک رہے ہیں۔ سانس نہیں لیا جاتا۔ باہر کے شعلوں نے کمرے کو تنور بنا دیا ہے۔

ایک بوڑھی مریل سی آواز ابھری ہے۔ ''کلمہ شریف پڑھو۔ لا الہ الا اللہ...... اور کمرے کے تنور میں

ایک گونج ابھری ہے۔ سب بیک زبان کلمہ شریف پڑھ رہے ہیں۔ ایک سو انسانوں کی زبان ایک ہو گئی ہے۔ جل کر مرنے سے پہلے کلمہ طیبہ نے کچھ سکون دیا ہے۔

باہر گولیاں چل رہی ہیں۔ لوگ بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ چیخ رہے ہیں، جل رہے ہیں، کٹ رہے ہیں، شعلوں نے بھاگنے کے راستے بند کر دیے ہیں۔

میں نے اپنے ایک بچے کو اٹھا رکھا ہے۔ اس کی عمر چار سال ہے۔ دوسرے بچے کو میری بیوی نے اٹھا رکھا ہے۔ اس کی عمر دو سال ہے۔ دونوں بلک رہے تھے۔ اب کلمہ شریف کی مقدس گونج کو وہ حیرت زدہ ہو کے سن رہے ہیں۔ اتنے سارے انسانوں کو ایک آواز میں گنگناتے انہوں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

میری بیوی میرے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ چھ ہی سال ہوئے میں اسے بیاہ لایا تھا۔ اس رات بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن ہونٹوں پر لطیف اور شرمیلی مسکراہٹ بھی تھی۔ وہ تو زندگی کے آغاز کی مسرت تھی۔ آج اس زندگی کی طرف سے کلہاڑے، کرپانیں، برچھیاں اور شعلے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

میرے معصوم بچوں اور بھولی بھالی بیوی کے چہرے میرے آنسوؤں کے دھندلکے میں دھندلا گئے ہیں۔ میرے ہونٹ کسی غیبی قوت سے ہل رہے ہیں اور میری آواز ایک سو شہیدوں کی آواز بن گئی ہے۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

کیا پاکستان کے آزاد باسیوں کو معلوم ہو گا کہ انہیں آزادی دلانے کے لئے آج ایک سو مسلمان مرد، عورتیں اور بچے ایک تنگ سے کمرے میں زندہ جل رہے ہیں اور جب وہ جل رہے تھے تو ان کی زبان پر اسی نعرہ اللہ کا ورد تھا جو آج پاکستان میں آزادی سے پڑھا جا رہا ہے؟

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ ہم ایک سو ہی نہیں، ایک ہزار، ایک لاکھ، ایک کروڑ، معلوم نہیں آگے کتنے، ہندوستان میں پاکستان کے نام پر کتنے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے جل رہے ہیں، کٹ رہے ہیں، گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہیں اور تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں۔ پاکستان میں رہنے والے تو نہیں دیکھ رہے، خدا دیکھ رہا ہے۔

شعلے قریب آ گئے ہیں۔ تپش کمرے کو تنور بنا رہی ہے۔

اچانک کمرہ خالی ہونے لگا ہے۔ کمرے میں جو بند تھے وہ باہر کو دوڑ پڑے ہیں۔ ذرا سی دیر میں کمرہ خالی ہو گیا ہے۔ میں بھی باہر کو دوڑ پڑا ہوں۔ بیوی میرے ساتھ ہے۔ ہم نے ایک ایک بچہ اٹھا رکھا ہے۔

میں نے دور دور تک دیکھا ہے۔ چھوٹے سے گاؤں کی فضا میں سیاہ دھوئیں کے بادل اور زرد اور سرخ شعلے نظر آ رہے ہیں۔ آگ نے گاؤں کو ہر طرف سے چاٹ لیا ہے۔ صرف ایک طرف ابھی محفوظ ہے۔ دو شعلوں کے درمیان تنگ سا راستہ ہے۔ لوگ ادھر بھاگے جا رہے ہیں۔

اچانک یہ مختصر سا ہجوم ان کے پیچھے دوڑ پڑا ہے۔ ہوا میں مجھے تلواریں اور برچھیاں لہراتی نظر آتی ہیں۔ کچھ لوگ گرتے بھی نظر آئے ہیں۔ میں نے بچے کو سینے سے لگا لیا ہے۔ دوسرا بچہ بیوی کے پاس ہے۔ وہ میری پیٹھ پیچھے چھپ گئی ہے۔ میں نے پیچھے دیکھا ہے۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ پیچھے شعلے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ آگے ہندو اور سکھ بھاگنے والوں کو کاٹ رہے ہیں۔

میں بیوی اور بچوں کو ساتھ لئے ایک مکان میں گھس گیا ہوں۔ دروازہ بند کر لیا ہے۔ جسم کانپ رہا ہے، دل لرز رہا ہے۔ بچے رونے لگے ہیں۔ بیوی سسک رہی ہے۔ یا خدا! کدھر جائیں؟ تیری دنیا میں پناہ ہے کہ

نہیں۔

معلوم نہیں کتنی دیر گزر گئی ہے۔ شعلے ساتھ والے مکان تک پہنچ گئے ہیں۔ میں نے بچے کا چہرہ اپنے سینے سے لگا کر اسے جلسن سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ میں مر جانے کو بے تاب ہوں مگر جل کر نہیں۔

میں کسی غریب مسلمان کسان کے صحن میں کھڑا ہوں۔ کھرلی پر بھینس رسی تڑانے کو زور لگا رہی ہے۔ وہ بھی جانتی ہے کہ بندھی رہی تو جل کر مرے گی۔ مجھے کھرلی کے قریب ٹوٹی ہوئی ایک کھاٹ نظر آئی ہے۔ شعلے جو ساتھ کے مکان تک پہنچ گئے ہیں میرے سینے میں داخل ہو گئے ہیں۔ میں نے بچہ بیوی کے حوالے کر کے کہا ہے۔ "میرے بچوں کی ماں' کہا سنا بخش دینا۔ دونوں بچوں کو سنبھالو۔ انہیں دودھ کی دھاریں بخش دو۔ مرنا ہی ہے تو دو چار کافروں کو ساتھ لے کے مریں گے"۔

میں نے بچے کو کندھے سے اتار کر کھاٹ کا لمبا بازو نکال لیا ہے اور باہر کو چل پڑا ہوں۔ میں دلیر ہو گیا ہوں۔ ہونٹوں پر کلمہ شریف کا ورد خود کر آیا ہے۔

گلی میں بہت سی لاشیں پڑی ہیں۔ ان میں معصوم بچوں کی لاشیں بھی ہیں۔ میں لاشوں میں سے گزرتا بڑھا چلا جا رہا ہوں۔ میری بیوی دونوں بچوں کو اٹھائے میری پیٹھ سے لگی چلی آ رہی ہے۔ گلی لمبی تو نہیں لیکن سو کوس جتنی لمبی لگتی ہے۔ معلوم نہیں یہ فاصلہ جیتے جی طے کر سکوں گا یا نہیں۔

شعلے ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔

اچانک گلی کے موڑ پر چار سکھ آن رکے ہیں۔ سب کے ہاتھوں میں کرپانیں ہیں۔ میں رک گیا ہوں۔ وہ پاکستان کو ننگی گالیاں دے کر مجھ پر ٹوٹ پڑے ہیں۔

میں اتنا دلیر نہیں ہوا کرتا تھا۔ اب شیر ہو گیا ہوں۔

ایک سکھ نے کرپان بلند کی ہے۔ میں نے کھاٹ کا لمبا بازو لاٹھی کی طرح مارنے کی بجائے اس کے منہ پر برچھی کی طرح مارا ہے۔ سکھ اپنے ایک ساتھی سے ٹکرا کر پیچھے کو گرا ہے۔ میں نے کھاٹ کا بازو برچھی کی طرح اس کے پیٹ پر مارا ہے۔ بازو شاید نوکیلا ہے جو اس کے پیٹ میں اتر گیا ہے۔

اب سکھ تین ہیں اور میں اکیلا۔ ایک اور نے مجھ پر کرپان چلائی ہے جو میں نے کھاٹ کے بازو سے روک لی ہے۔ میں نے اسے دوسرا وار نہیں کرنے دیا۔ اسے بازو لاٹھی کی طرح مارا ہے جس سے وہ تیورا کر گرا ہے مگر بیوی کی چیخ نے مجھے چونکا دیا ہے۔ گھوم کے دیکھتا ہوں۔ میرے دونوں معصوم بچوں کے سر تن سے جدا ہو چکے ہیں۔ بچوں کی ماں ان پر گر پڑی ہے۔ وہ چیخ رہی ہے۔ دو سکھ اسے گھسیٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میں نے ایک کی کمر پر کھاٹ کا بازو مارا ہے۔ وہ اچھلا اور پرے جا پڑا ہے مگر دوسرے سکھ نے کرپان کا بھرپور وار کر کے میری بیوی کی گردن دھڑ سے صاف کاٹ دی ہے۔

میں نے کھاٹ کا بازو گھمایا ہے لیکن سکھ بھاگ گئے ہیں۔

میری بیوی اور میرے بچوں کے سر کٹ کر ایک ہی جگہ اکٹھے پڑے ہیں۔ دل کی حالت بیان نہیں ہو سکتی۔ مجھے رونا نہیں آ رہا صرف ایک بات جی میں آتی ہے کہ اپنا سر بھی کاٹ کر ان تین سروں کے پاس رکھ دوں۔

نظر گلی پر پڑی ہے تو مجھے بہت سی لاشیں نظر آتی ہیں۔ کنبوں کے کنبے کٹ گئے ہیں۔ ان میں میرا کنبہ بھی ہے۔

میں نے فاتحہ پڑھی ہے اور چل پڑا ہوں۔

18 اگست 1947ء

پاکستان کی عمر چار دن ہو گئی ہے۔ میری بیوی اور ننھے ننھے بچوں کو پاکستان پر قربان ہوئے آج دوسرا دن

ہے۔ تھلیاں نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ تھلیاں کی جگہ اب جلے ہوئے کھنڈر ہوں گے۔ میری بھولی بھالی بیوی اور ننھے ننھے بچے؟ کیا ان کی لاشیں جل گئی ہوں گی؟

''مت سوچو...... سوچوں کو پیچھے نہ جانے دو''۔ جانے اس کی آواز ہے۔ شاید میری اپنی۔ میں اب اپنی آواز کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ میں اپنے آپ کے لئے اجنبی ہو گیا ہوں۔

رات جو گزر گئی ہے وہ میں نے چلتے چلتے گزاروی ہے۔ سورج نکل آیا ہے۔ میرے چاروں طرف گھنا جنگل اور جنگل میں ڈھکی ہوئی چٹانیں اور اونچی نیچی ٹیکریاں ہیں۔ میں بھٹک گیا ہوں۔ غم اور غصے نے پاگل سا کر دیا تھا۔ تھلیاں سے نکلتے سمت کا خیال نہ رہا۔ پورب پچھم کا ہوش نہ رہا۔ اب یاد آتا ہے کہ مہاجرین کو گھر کر دھرم پورہ کے پل کی طرف بھاگتے دیکھا تھا۔ یہ دریائے راوی کا پل ہے۔ سنا تھا کہ راوی پاکستان میں سے جا گزرتا ہے۔ اتنا بھی خیال نہ رہا کہ دریا میں کود جاتا تو دریا مجھے پاکستان پہنچا دیتا۔ میں کسی اور ہی سمت چل پڑا۔

رات کی باتیں یاد آنے لگی ہیں۔ عجیب سا لگتا ہے کہ کوئی رات کی باتیں صبح تک بھول جائے لیکن جس کے دو بچوں اور بیوی کے سر اس کے سامنے جسموں سے کاٹ کے پھینک دیئے جائیں وہ کٹے ہوئے سروں کو ہی تصوروں میں جوڑتا رہتا ہے، وہ لمحے پہلے کی کوئی اور بات یاد نہیں رکھ سکتا۔ میں رات بھر بچوں سے پیار کرتا رہا ہوں۔ میں نے تصوروں میں ان کے سر ان کے جسموں سے جوڑ لئے تھے۔ اب وہ سر پھر مٹی میں لڑھک گئے ہیں۔

شلوار اور قمیص کو دیکھا ہے۔ دونوں گیلی ہیں اور مٹی سے لتھڑی ہوئی۔ میں نے رات دریائے راوی تیر کر پار کیا تھا۔ کھانڈا بازو معلوم نہیں کہاں پھینکا تھا۔ میں کس طرح تیرا تھا؟ دریا گہرا تھا؟ سیلابی تھا؟ کیسا تھا؟ کچھ یاد نہیں۔ دریا ہے کہاں؟ کس سمت؟ کچھ ہوش نہیں۔ بیوی اور دو بچوں کی موت نے دماغ بیکار کر دیا ہے۔ غصے کی لہر آتی ہے تو ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ دانت بج اٹھتے ہیں۔

سورج سر پر آ گیا ہے۔ میں چلا جا رہا ہوں۔ جنگل ہی جنگل ہے۔ چٹانیں ہی چٹانیں ہیں۔ میں کہاں ہوں؟ پاکستان کہاں ہے؟

آنکھوں کے سامنے پاکستان کی تصویر نکھرتی آ رہی ہے۔ ایک سبز جھنڈا نظر آنے لگا ہے اور اس جھنڈے کے نیچے تین سر کٹے پڑے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلی ہیں، جھنڈے کو دیکھ رہی ہیں۔ یہ منظر دل کو ذرا سکون دیتا ہے۔

سورج ڈھل رہا ہے۔ میں چل رہا ہوں۔

پیٹ میں درد کی ٹیس اٹھی ہے اور منہ کھل گیا ہے۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے ہیں۔ شاید میں بھوکا ہوں۔ شاید حلق پیاس سے خشک ہو گیا ہے۔ آنکھیں بھی حلق کی طرح خشک ہو گئی ہیں۔ دل رونا چاہتا ہے میں رو نہیں سکتا۔ شاید اس لئے کہ مرد روتے اچھے نہیں لگتے۔ پیٹ سے درد کی ایک ٹیس نے جسم کو دوہرا کر دیا ہے۔ کھلے ہوئے منہ کو بند کیا ہے لیکن منہ فوراً کھول دیا ہے۔ حلق میں ایسی چبھن ہوئی تھی جیسے کسی نے باریک کانٹوں کی مٹھی بھر کے میرے حلق میں ڈال دی ہو۔

سورج جنگل کی اوٹ میں چلا گیا ہے۔ جنگل خاموش ہے۔

اچانک جنگل جاگ اٹھا ہے۔ میرے قریب سے کوئی چیز بھاگتی گزر گئی ہے۔ اس کے پیچھے بھیڑیئے بھونکتے اور غراتے بھاگتے آ رہے ہیں۔ میں جنگل کا باسی ہوں، درندوں کی آوازوں کو پہچانتا ہوں۔ دوڑ کر جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ جاتا ہوں۔ بھیڑیئے گزر گئے ہیں۔ رک بھی گئے ہیں۔ جھاڑیوں سے جھانک کر دیکھتا ہوں۔ بھیڑیئے دو ہیں۔ انہوں نے ایک خرگوش کو پکڑ لیا

ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دو حصے کر دیے ہیں۔
یک لخت بھوک کا احساس مجھے بھیڑیا بنا دیتا ہے۔ میرے پیٹ میں کچھ جانا چاہئے ورنہ اٹھ نہیں سکوں گا۔ یہیں بیٹھے بیٹھے مر جاؤں گا۔ بھیڑیے مجھ سے پندرہ بیس قدم دور خرگوش کو کھا رہے ہیں۔
میں پاگل ہو گیا ہوں۔ بھوک نے درندہ بنا دیا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا ہوں۔ ایک پتھر اٹھا کر زور سے بھیڑیوں کی طرف پھینکا ہے۔ پتھر ایک بھیڑیے کی گردن پر لگا ہے۔ میں دوسرا پتھر پھینکتا ہوں۔ وہ دونوں کے درمیان گرا ہے۔ بھیڑیے بدک گئے ہیں۔ خرگوش کے ٹکڑے ان کے سامنے پڑے ہیں۔ میں چپ چاپ کر یکے بعد دیگرے ان پر دو اور پتھر پھینکتا ہوں۔
خدا نے میری مدد کی ہے۔ ذرا ہی دور سے ایک اور خرگوش بھاگتا گزر رہا ہے۔ بھیڑیوں کی نظر اس پر پڑی ہے اور وہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے ہیں۔
میں دوڑ کر خرگوش کے دونوں ٹکڑے اٹھا لایا ہوں اور ایک درخت پر چڑھ گیا ہوں۔ گوشت کو دیکھ کر بھوک اور تیز ہو گئی ہے۔ یاد نہیں رہا کہ روٹی کب کھائی تھی، پانی کب پیا تھا؟ شاید برسوں سے بھوکا ہوں۔
خرگوش کا گوشت نرم ہوتا ہے۔ جہاں بھیڑیوں نے دانت گاڑے تھے وہاں سے میرے دانتوں نے ایک بوٹی کچے گوشت کی نوچ لی ہے۔ خون میرے ہونٹوں سے بہنے لگا ہے۔ ذائقہ برا نہیں۔ میں نے گوشت کا پہلا نوالہ چبا کر حلق سے اتار لیا ہے۔ خون کا ذائقہ اچھا لگنے لگا ہے۔ میں نے خرگوش کے ایک ٹکڑے پر منہ رکھ کر خون چوسنا شروع کر دیا ہے۔
دور سے بھیڑیوں کی آواز آ رہی ہے جس سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ وہ دوسرے خرگوش کو پکڑ کر بھنبھوڑ رہے ہیں۔
ایک خرگوش کو بھیڑیے کھا رہے ہیں۔ ایک خرگوش کو انسان کھا رہا ہے۔
میرے ہاتھوں پر خون ہے۔ کپڑوں پر خون ہے۔ ہونٹوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ میں زبان پھیر پھیر کر خون چاٹ رہا ہوں۔ جسم میں جان آ گئی ہے۔ جسم بیدار ہو گیا ہے۔ مگر دماغ سونے لگا ہے۔ نیند نے دماغ کو شل کر دیا ہے۔ زمین پر سونا ٹھیک نہیں۔ رات کو درندے کھا جائیں گے۔ میں ادھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ جس درخت پر بیٹھا ہوں وہ بہت بڑا ہے۔ ٹہن موٹے ہیں۔ ایک جگہ تین چار ٹہن ملتے ہیں۔ وہاں پیٹھ کے بل ہو کر لیٹا جا سکتا ہے میں اوپر چلا جاتا ہوں۔ ہاں، یہ ٹہن مجھے نیند میں گرنے نہیں دیں گے۔ جنگل تاریک ہو رہا ہے، درندے جاگ اٹھے ہیں۔

19 اگست 1947ء

ہڑبڑا کر جاگ اٹھا ہوں۔ تیز روشنی سے آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ اردگرد اس قدر شور ہے کہ کانوں کے پردے پھٹ رہے ہیں۔ ایسا ہی شور تھلیال میں سنا تھا۔ جب گاؤں جل رہا تھا۔
سامنے نظر گئی تو دس بارہ لنگور مجھے گھورتے نظر آئے۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ ایسے بے شمار لنگور ٹہنیوں پر بیٹھے قیامت کا شور بپا کئے ہوئے تھے۔ سبھی مجھے دیکھ رہے تھے۔
لنگوروں کی فوج مجھ پر پل پڑنے کو پر تول رہی ہے۔ مجھے چیر پھاڑ دیں گے۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔ ان سے بچ نکلنا ناممکن ہے۔ میں پیٹھ کے بل ٹہن پر پڑا ہوں۔ اچانک میری نظر اپنے پیٹ پر پڑتی ہے تو مجھے خرگوش کے جسم کا دوسرا ٹکڑا نظر آ جاتا ہے اور خیال آتا ہے کہ لنگور مجھ سے یہی ٹکڑا چھیننا چاہتے ہیں۔
میں نے یہ ٹکڑا جو اپنے کھانے کے لئے رکھا تھا، اٹھا کر دور پھینک دیا ہے۔ درخت کی ٹہنیوں پر گزرتا ٹکڑا

نیچے جا پڑا ہے اور تمام لنگور بے حد تیزی سے کودتے پھاندتے درخت سے اتر گئے ہیں اور ٹکڑے پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ تین چار لنگور ایک طرف دوڑ پڑے ہیں اور ساری فوج ان کے پیچھے بھاگی جا رہی ہے۔

میں درخت پر اور اوپر چڑھ گیا ہوں۔ ادھر ادھر دیکھ رہا ہوں۔

سوائے درختوں کے کچھ اور نظر نہیں آتا۔ آسمان پر نگاہ ڈالتا ہوں۔ ساون کے بادل اور سورج نظر آتا ہے۔ سورج سے سمت کا اندازہ کرتا ہوں اور درخت سے اتر آتا ہوں۔

تھوڑی ہی دور چلا ہوں کہ حلق میں پھر کانٹے چبھنے لگے ہیں۔ کل خرگوش کے خون نے پیاس بجھا دی تھی، اب جسم کا انگ انگ پانی مانگ رہا ہے۔ اس جنگل میں کہیں چشمہ یا کوئی ندی نالہ تو ضرور ہوگا۔

پانی کی تلاش میں چلتا ہوں تو پیاس بڑھتی ہے۔ پھر بھی چلا جا رہا ہوں۔ ایک چٹان کے سائے میں گھنی گھاس کی پتیوں پر شبنم کے قطرے دکھائی دیتے ہیں۔ میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل شبنم کے ایک ایک قطرے کو چوس رہا ہوں۔

کوئی گھنٹہ بھر پتیاں چوستا رہا ہوں۔ گھاس بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے یہ سارا فاصلہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اس طرح طے کیا ہے جیسے کوئی بھیڑ بکری گھاس کھاتی آگے بڑھ رہی ہو۔ کپڑے بھیگ چکے ہیں۔ شبنم نے حلق کے کانٹے نکال دیئے ہیں۔ اسی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھاس پر چلتے چل جانے کو جی چاہتا ہے۔

آوارہ بھیڑ کی طرح چلا جا رہا ہوں۔ ہونٹ گھاس سے لگے ہوئے ہیں اور شبنم کو چوستا جا رہا ہوں حتیٰ کہ گھاس ختم ہو گئی ہے اور میں گھنے درختوں تلے جا پہنچا ہوں۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے چت لیٹ گیا ہوں۔ نڈھال ہو گیا ہوں۔ نیند ایسی آ رہی ہے جیسے آنکھ لگی تو روز قیامت ہی کھلے گی۔

آنکھ کھل گئی ہے۔ جنگل تاریک ہوا جا رہا ہے۔ اتنی گہری نیند سو کر اٹھا ہوں کہ بتا نہیں سکتا کہ میں کل سویا تھا یا آج۔ اب فرض کر رہا ہوں کہ یہ 19 اگست کی ہی شام ہے۔ میرے لئے اب دن اور تاریخیں بے معنی ہو کے رہ گئی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے جنگل میں پیدا ہوا تھا اور جنگل میں ہی مروں گا۔

خواب میں بیوی اور بچوں کو دیکھا تھا۔ بیوی نے شادی کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ بچے اس سے بھی زیادہ خوبصورت تھے۔ میں باہر سے تھکا ماندہ آتا ہوں۔ پانی پیتا ہوں۔ میں مسرور ہوں۔ بے حد خوش ہوں۔ پھر میری خوشیوں پر دھندی چھا جاتی ہے۔ میں بیوی کو آوازیں دیتا ہوں۔ دھند میں اس کے قدموں کی دبی دبی آہٹ اور بچوں کی کھڑ کھڑ ہنسی سنائی دیتی ہے۔ دل پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔

میں بھی سجائی سیج سے اچھل کر اٹھتا ہوں اور آواز کی سمت ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ننھے کی کلائی آ جاتی ہے۔ میں اسے پیار سے اپنی طرف کھینچتا ہوں اور دھند چھٹ جاتی ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میرے ہاتھ میں اس درخت کی سوکھی ٹہنی ہے جس کے نیچے پتھریلی زمین پر لیٹا ہوا ہوں۔ درخت پر پرندے چہچہا رہے ہیں۔ سورج غروب ہونے کو ہے۔ جنگل خاموش ہے۔ اندھیرا پھیلتے ہی جنگل کی ڈراؤنی آوازیں بیدار ہو جائیں گی۔

میں اٹھ بیٹھا ہوں۔ آنکھیں بار بار بند کر کے خواب کو پلکوں میں دبوچ لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری مٹھی ابھی تک بند ہے اور اپنے بچے کی کلائی کا لمس روح کو بھی مسرور کر رہا ہے۔ میں اپنی مٹھی کی طرف دیکھتا نہیں۔ جانتا ہوں کہ میں نے ٹہنی پکڑ رکھی ہے جو سوکھ کر درخت سے گر پڑی تھی۔ میں اب تصوروں میں اپنے

بچوں کے لمس سے مخمور ہو رہا ہوں۔
وہ تو خواب تھا جس نے ذرا سا سکون دیا تھا۔ حقیقت نے میرے ہاتھ میں ننھے کی کلائی کی جگہ سوکھی ٹہنی دے دی ہے۔ تب خیال آتا ہے کہ میرے دونوں بچے سوکھی ٹہنیوں کی طرح گر پڑے ہیں۔ مٹھی کو اتنی زور سے دباتا ہوں کہ سوکھی ٹہنی ٹخ ٹخ کی آواز سے ٹوٹ گئی ہے۔
میں اب سوکھی ٹہنیاں توڑ سکتا ہوں، کسی کی گردن نہیں مروڑ سکتا۔ اف خدایا! ذرا سا زور لگانے سے کندھے تک بازو میں درد کی لہر دوڑ گئی ہے۔ بازو میں طاقت نہیں رہی۔ اٹھنے کی ہمت نہیں رہی۔ غم نے جسم کو مفلوج کر دیا ہے۔ کچھ یاد نہیں کہ کتنا کچھ چل چکا ہوں۔
بازو میں درد اٹھتے ہی پیٹ میں قیامت بپا ہو گئی ہے۔ پیٹ سے ایک بھوت سا اٹھا ہے۔ منہ کھل گیا ہے۔ حلق سے ویسے ہی شعلے نکلنے لگے ہیں جن سے سارا تھلیال جل گیا تھا۔
بھوک...... پیاس...... تھکن...... خرگوش یاد آ گیا ہے۔ میں خون پینا چاہتا ہوں۔ پیٹ سے بھی جیسے واویلا اٹھ رہا ہے۔ ”خون، خون، میرے اندر خون انڈیلو ورنہ تمہیں جیتا نہیں چھوڑوں گا۔“
میں اب اپنے بس میں نہیں رہا۔ میرے اندر کسی درندے کی روح اتر آئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بھیڑیا سامنے آیا تو اسے بھی کھا جاؤں گا۔ اب کوئی بھیڑیا، کوئی ہندو، کوئی سکھ مجھ سے بچ کر نہیں جائے گا...... میں خون پیوں گا۔
اوپر سے چڑیوں کی چہک سنائی دیتی ہے۔ میں اوپر دیکھتا ہوں۔ ایک گھونسلا نظر آتا ہے جس میں تین بچوں کی چونچیں نظر آ رہی ہیں اور نیلے نیلے رنگ کے دو پرندے جنہیں ہم نیل کنٹھ کہا کرتے تھے، بچوں کے منہ میں کچھ ڈال رہے ہیں۔ بھوک اور بڑھ گئی ہے۔
میں گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل درخت کے تنے تک جاتا ہوں۔ درخت پر چڑھنے لگتا ہوں تو نہ ہاتھوں میں طاقت ہے نہ پاؤں میں سکت کہ تنے پر ہاتھ اور پاؤں جما سکوں۔ جسم کو جھٹکا دیتا ہوں تو میں گز بھر اوپر اٹھ جاتا ہوں۔ جسم کانپنے لگا ہے۔ زمین نیچے کو کھینچ رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو اوپر دھکیل رہا ہوں۔
بڑی ہی مشکل سے میں اس شاخ کے قریب پہنچ گیا ہوں جہاں دو نیل کنٹھ بچوں کے منہ میں دانہ ڈال رہے ہیں۔ میں قریب کے ٹہن پر پیٹ کے بل ٹہن سے چپکا ہوا ناگ کی طرح آگے کو سرک رہا ہوں۔ ایک نیل کنٹھ مجھے دیکھے بغیر اڑ گیا ہے۔ سورج غروب ہو گیا ہے۔ دوسرا نیل کنٹھ میری طرف پیٹھ کیے بچوں میں مگن ہے۔ میں نہایت آہستہ آہستہ آگے کو سرک گیا ہوں۔
میں نے اوپر سے ہاتھ کا جھپٹا مارا ہے۔ نیل کنٹھ اپنے تین بچوں سمیت میرے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ میں نے اسے گھونسلے میں ہی دبا لیا ہے۔ اس کی چیخ و پکار سے درخت میں حشر بپا ہو گیا ہے۔ سینکڑوں پرندے شور و غل کر کے اڑ گئے ہیں۔ ان کے واویلے سے جنگل لرز رہا ہے۔
میرے پاس چاقو نہیں، ناخن ہیں۔ ناخنوں سے نیل کنٹھ کی گردن چیر پھاڑ دی ہے اور منہ پھاڑی ہوئی گردن پر رکھ دیا ہے۔ خون، گرم گرم خون...... ذائقہ بہت اچھا ہے۔ خالی پیٹ بھرنے لگا ہے۔ جسم میں جان آنے لگی ہے۔ نیل کنٹھ ابھی سرا نہیں تڑپ رہا ہے۔
مجھے بیوی بچے یاد آ گئے ہیں...... نیل کنٹھ سکھ بن گیا ہے۔ میں نے اس کی چھوٹی سی گردن پر دانت گاڑ دیئے ہیں اور اس کا خون تیزی سے پینے لگا ہوں۔
خون ختم ہو گیا ہے۔ خدا کا ایک خوبصورت پرندہ سوکھی ٹہنی بن گیا ہے۔ میں نے اسے پھینک دیا ہے۔ اس کے بچے گھونسلے میں بلبلا رہے ہیں۔ میں نے لپک کر

ایک بچے کو اٹھا لیا ہے۔ دوسرے نیل کنٹھ نے اوپر سے آ کر میرے سر پر چونچ بھی ماری ہے اور پنجے بھی اور چیختا چلاتا اڑ گیا ہے۔

ایک بچہ میری مٹھی میں ہے۔ یہ تو بوٹی سی ہے۔ ننھے ننھے دو پر ہیں۔ منہ میں ڈالتے ہی بھنی ہوئی بوٹی کی طرح حلق سے اتر جائے گا۔ بچہ پیاری سی چونچ کھولے "چیں چیں" کر رہا ہے۔

نہیں، نہیں، میں تڑپ اٹھا ہوں جیسے ایک تیر جگر کے پار ہو گیا ہو۔ نیل کنٹھ کا بچہ میرا اپنا بچہ بن گیا ہے۔ میرا بچہ بھی کرپان تلے اسی طرح تڑپا تھا۔ دوسرا بچہ بھی۔ میرے بچوں کی ماں بھی...... میں نے بچے کو گھونسلے میں رکھ دیا ہے اور مجھے سکون سا آنے لگا ہے۔

گرد و پیش کو دیکھتا ہوں۔ جنگل کی ہریالی نکھری نکھری لگتی ہے۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا ہے۔ تھوڑی ہی دور زمین پر چمک سی نظر آتی ہے۔ آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا ہوں۔ پانی لگتا ہے۔ پانی کے خیال سے انگ انگ جل اٹھتا ہے۔

جلدی جلدی درخت سے اتر کر چل پڑا ہوں۔ جا کے دیکھتا ہوں، یہ واقعی پانی ہے۔ شاید چشمہ ہے۔ پانی آگے کو بہتا جا رہا ہے اور غائب ہو رہا ہے۔ میں بے صبری سے چشمے کے کنارے دو زانو بیٹھ جاتا ہوں اور دونوں ہاتھوں سے پانی پینے لگتا ہوں۔

اپنے آپ میں آ گیا ہوں۔ پیٹ کا جہنم سرد پڑ گیا ہے۔ جسم کی آگ بجھ گئی ہے۔ درندہ مر گیا ہے۔ انسان بیدار ہو رہا ہے۔ میں کہ جو ابھی بھیڑیوں کو کھا جانے کو بے تاب تھا، اب ڈر رہا ہوں کہ شام گہری ہو رہی ہے۔ کہاں چھپوں گا، بھیڑیے مجھے کھا جائیں گے۔

اور اب میں بچوں کی طرح رو رہا ہوں۔ اتنی اونچی آواز سے رو رہا ہوں کہ سارا جنگل سن رہا ہے۔ روتا ہی رہوں گا۔ آنسو اور فریادیں روحانی سکون دے رہی ہیں۔

میں انسان ہوں، میری بیوی کی گردن کٹ گئی ہے۔ میرے بچوں کی گردنیں کٹ گئی ہیں۔ میں انہیں دفن نہیں کر سکا تھا۔ ان کا جنازہ نہیں پڑھ سکا تھا۔ ہچکیاں تھمنے کو نہیں آتیں۔ روئے چلا جا رہا ہوں۔

روتے روتے خیال آتا ہے کہ آج ہندوستان میں کتنے باپ اور کتنی مائیں میری طرح رو رہی ہوں گی۔ کتنے بچوں اور کتنی بچیوں کی گردنیں کٹ گئی ہوں گی؟ سینکڑوں ہزاروں کی؟ لاکھوں کی؟ ڈھارس سی بندھتی ہے کہ چلو لاکھوں میں دو بچے میرے بھی سہی۔ تب یاد آتا ہے کہ وہ ہمارے ہی پیغمبر تھے جنہوں نے خدا کی خوشنودی کی خاطر اپنے بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دی تھی۔

مگر انہیں تو بیٹا واپس مل گیا تھا۔ کیا مجھے میرے بچے واپس مل جائیں گے؟ کہاں ملیں گے؟ پاکستان میں یا اگلے جہان؟

"مت سوچ"...... میری ذات سے ایک آواز اٹھی ہے۔ "ایسی باتیں مت سوچ...... خدا کی قربان گاہ پر دی ہوئی قربانی واپس نہیں مانگی جاتی"۔

میں نے اپنے بچوں کو اور ان کی ماں کو قربان کر دیا ہے۔

مگر قرآن کی سرزمین کہاں ہے؟ کس طرف ہے؟ میں وہاں تک کس طرح پہنچوں گا؟...... سوچتا ہوں، کیا اس مقدس سرزمین کے رہنے والوں کو معلوم ہوگا کہ ان سے آ ملنے کے لئے ایک مسلمان بھٹکتا پھر رہا ہے؟ درندہ بن گیا ہے؟ خون دے کر خون پی رہا ہے؟ خون پی کر پاگل ہو رہا ہے؟

کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ میں اکیلا نہیں، نہ جانے آج کتنے قافلے خون کے دریاؤں میں ڈوبتے، تیرتے، تپتے ہوئے میدانوں میں بھوکے پیاسے پاکستان کی سمت چلے جا رہے ہوں گے۔

ان سوچوں نے اور ان خیالوں نے دل کو تسلی سی

دے دی ہے...... مگر میں سر کو بار بار زور زور سے جھٹکتا ہوں کیوں کہ جسموں سے کٹے ہوئے تین سر آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ ماں کی لاش ننھے ننھے بچوں کی لاشوں کے اوپر پڑی ہے۔

سوچوں اور خیالوں کی دنیا ساکت اور جامد ہو گئی ہے۔ ایک دھاڑ سنائی دی ہے۔ میں اس آواز کو پہچانتا ہوں۔ پہاڑی شیر کی آواز ہے۔ یہ بڑے کتے جتنا بڑا شیر ہوتا ہے۔ دھاری دار نہیں ہوتا۔ ببر شیر کی طرح بھی نہیں ہوتا۔ بادامی رنگ کا بڑا ظالم درندہ ہوتا ہے اور یہ درخت پر بھی چڑھ جاتا ہے۔ میں جنگل کا باشندہ ہوں۔ جانتا ہوں کہ میں پانی کے کنارے بیٹھا ہوں اور شیر پانی پینے ضرور آئے گا۔

رات تاریک ہو گئی ہے۔ میں درندہ نہیں انسان ہوں اور یہ بھی یاد آ جاتا ہے کہ مسلمان ہوں......! اپنے آپ زبان پر کلمہ شریف کا ورد آ جاتا ہے۔ میں بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھ رہا ہوں۔ آنکھیں بند ہو گئی ہیں۔ ہاتھ آسمان کی جانب اٹھ گئے ہیں۔

آہستہ آہستہ میری آواز ایک سو انسانوں کی آواز بن جاتی ہے اور یہ آواز ایسی گونج بن جاتی ہے جیسے ایک سو شہیدوں کا کارواں گنگناتا ہوا کہکشاں پر خدا کے حضور چلا جا رہا ہو۔ اس کارواں میں میری بیوی بھی ہے اور دو بچے بھی۔

میری آواز دبنے لگتی ہے۔ پھر ہچکی نکل جاتی ہے۔ ایک سو شہیدوں کی آواز خاموش ہو جاتی ہے اور میں ہچکیاں لے لے کے رونے لگتا ہوں۔ میں نے ہاتھ بلند کر کے بہت ہی بلند آواز سے خدا کو پکارا ہے۔ "میرے خدا، کہاں ہے تُو، کہاں ہے تیری وہ سرزمین جس کی خاطر میں نے اپنے بچے ذبح کروائے ہیں۔ مجھے راہ دکھاؤ۔ ستاروں کو روشنی دینے والے خدا مجھے روشنی دکھاؤ...... مجھے پاکستان دکھا دو...... مجھے اپنے قرآن کے پاکستان میں پہنچا دو"۔ شیر کی گرج پھر سنائی دی ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ آسمان پر تارے چمک رہے ہیں۔ مجھے درختوں کے بھوت میری طرف بڑھ رہے ہیں۔

اب کے شیر جو غرایا ہے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ قریب آ گیا ہے۔ اگر وہ پیاسا ہے تو پانی پر ضرور آئے گا۔ سوچتا ہوں کہ کسی درخت پر چڑھ جاؤں لیکن یاد آ جاتا ہے کہ اس نسل کا شیر بھی درخت پر چڑھ سکتا ہے...... بھاگ اٹھوں؟...... نہیں، شیر بھی میرے پیچھے دوڑ پڑے گا۔

آسمان پر چمک سی نظر آتی ہے جیسے افق پر بجلی چمکی ہو۔ پھر ہلکی ہلکی گڑگڑ سنائی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ شیر کی دھاڑ بھی ایک بار پھر سنائی دی ہے۔ اب کے اور قریب۔ پھر اور قریب میں آہستہ آہستہ ایک طرف سرکنے لگتا ہوں۔

اوہ خدا! یہ کیا؟ دس بارہ قدم دور ہیرے سے چمک رہے ہیں۔ میں گنتا ہوں...... دو...... چار...... چھ...... آٹھ...... ہیرے سے سجے ہیں۔ میرا جسم سن ہو جاتا ہے۔ یہ چار بھیڑیوں یا چار شیروں یا چار تیندوؤں کی آنکھیں ہیں...... کیا میں انہیں نظر آ رہا ہوں؟ کیا وہ اندھیرے میں دیکھ سکتے ہیں؟

شیر کی دھاڑ قریب آ گئی ہے...... مجھے کون کھائے گا؟ مجھ سے نیل کنٹھ کے خون کا انتقام کون لے گا؟...... چار بھیڑیے یا ایک شیر؟ اب مجھے بھی ضرور ہی مرنا ہے۔ چمکتی ہوئی آٹھ آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں اور میں سن ہو گیا ہوں۔

مجھے یاد آ گیا کہ مرنے سے پہلے خدا کو یاد کرنا چاہئے۔ میں نے کلمہ شہادت کا ورد شروع کر دیا ہے۔

اچانک ستارے بجھ گئے ہیں اور جنگل یکبارگی روشن ہو کر تاریک ہو گیا ہے...... مجھے ایک ٹاپے کی اس

چمک میں چار بھیڑیے صاف نظر آ رہے ہیں۔ چمک کے ساتھ ہی بہت سی توپیں گرجتی ہیں...... یہ ساون کی گھٹا کی طرح گرج تھی ... گھٹا ایک بار پھر چمکتی اور گرجتی ہے اور آنکھ چمکتی ہوئی آنکھیں بجھ جاتی ہیں پھر مجھے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جو دور ہی دور ہوتی جا رہی ہیں۔

اچانک آسمان پھٹ پڑا ہے۔ موسلا دھار بارش برسنے لگی ہے۔ بجلیاں چمکتی اور کڑکتی ہیں۔ کوئی درندہ بجلی کی چمک میں باہر نہیں نکل سکتا۔ جا کے کچھاروں میں دبک جاتے ہیں۔

میری کوئی کچھار نہیں، میں درندہ نہیں۔ بھٹکا ہوا خوفزدہ انسان ہوں۔ میں دوڑ پڑتا ہوں۔ بارش طوفانی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بجلی چمکتی ہے تو اس چمک میں جھاڑیوں، درختوں اور کھڈوں سے بچتا دوڑا چلا جا رہا ہوں۔

معلوم نہیں کتنا فاصلہ طے کر آیا ہوں۔ ایسے لگتا ہے جیسے رات گزرنے والی ہے۔ ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ اب میں زمین پر نہیں پانی میں دوڑ رہا ہوں۔ ہر طرف جل تھل ہے۔ اوپر سے بھی پانی برس رہا ہے۔ نیچے سے میرے پاؤں بھی پانی اچھال کر مجھ پر برسا رہے ہیں۔ دم پھول گیا ہے۔ ٹانگوں میں سکت نہیں رہی۔ اتنی بھی طاقت نہیں رہی کہ رک جاؤں۔ ٹانگیں اپنے آپ آگے پیچھے ہو رہی ہیں۔ سر ڈول رہا ہے۔ جسم شل ہو گیا ہے۔ قدم رک نہیں رہے۔ کہیں نہ کہیں گر پڑوں گا اور بے ہوش ہو جاؤں گا۔ شاید پہلے بے ہوش ہوں گا پھر گروں گا۔

ذہن میں ایک سوال اٹھتا ہے...... کیا میں پاکستان میں جا گروں گا؟

سیلاب نے روک لیا ہے۔ معلوم نہیں دریا ہے یا کوئی برساتی ندی۔ دوڑتے دوڑتے اس میں آن گرا ہوں۔ بارش برس رہی ہے۔ گھپ اندھیرا ہے۔ بجلی تو کئی بار چمکی تھی مگر ندی کی سیلابی موجیں نظر نہیں آ رہیں۔ پانی بہت تیز ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تیرنا جانتا ہوں۔ اپنے آپ کو سیلاب کے حوالے کر دیا ہے۔ بازوؤں اور ٹانگوں میں اتنی سکت نہیں رہی کہ طوفانی موجوں کا مقابلہ کر کے پار جا سکوں نہ ہی مجھے پار جانے کی ضرورت ہے۔ ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ سیلاب مجھے پاکستان پہنچا دے گا۔ اب تو احساس پر زندہ ہوں۔ اپنی کوئی سوچ نہیں رہی، کوئی فیصلہ نہیں رہا۔

اٹھتی گرتی لہریں جھولا جھلا رہی ہیں۔ نیند آنے لگی ہے لیکن سوؤں گا نہیں ورنہ ڈوب جاؤں گا۔

سیلاب کے شور میں ترنم پیدا ہو چلا ہے...... کسی کی معصوم سی ہنسی سنائی دی ہے۔ اوہ، یہ تو میرے بچوں کی ہنسی ہے۔ کہاں ہیں میرے بچے؟

انہیں بلاتا ہوں ...ساجد...... ماجد...... آوازیں دیتا ہوں۔ وہ دوڑ کر آتے ہیں۔ مجھ سے لپٹ جاتے ہیں۔ ان کی ہنسی میں گھنٹیوں کا ترنم ہے۔ میں ایک چکر میں آہستہ آہستہ دوڑنے لگتا ہوں اور میرے بچے مجھے پکڑنے کو دوڑتے ہیں۔

میں آہستہ آہستہ دوڑ رہا ہوں...... پھولوں کے جھرمٹ میں مجھے ایک مسکراتا چہرہ نظر آتا ہے...... میں رک جاتا ہوں۔ دیکھتا ہوں...... وہ میرے بچوں کی ماں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ میں اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ پھول دھواں بن جاتے ہیں۔ بچوں کی ہنسی دور، بہت دور کی آواز بن جاتی ہے۔

میں چت پڑا ہوں، جسم جل رہا ہے۔ یوں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں جیسے میں جلتے ہوئے تھلیال کی گلی میں کھڑا ہوں۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ بیوی نظر آتی ہے نہ بچے۔ زمین اور آسمان جل رہے ہیں۔ میں تو سیلاب میں بہہ رہا تھا۔ آگ میں کیسے آن پڑا؟

بیوی اور بچوں کو تو خواب میں دیکھا تھا؟ کیا بارش اور سیلاب بھی خواب تھا؟ دماغ مفلوج ہو گیا ہے۔ ذرا سا سوچتا ہوں تو سر پر ہتھوڑے کی ضربیں پڑنے لگتی ہیں۔ کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو کھوپڑی آرے سے کٹنے لگتی ہے۔ مگر دماغ سوچے بغیر رہ نہیں سکتا۔ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سر پر ہتھوڑے اور آرے چل رہے ہیں۔ دانت سنسنا اٹھتے ہیں۔ گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوں۔ کوئی ندی نظر نہیں آتی۔ رات کی بارش کا کہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ گھنا جنگل بھی دکھائی نہیں دیتا جہاں چار بھیڑیے مجھے گھور رہے تھے اور ایک پہاڑی شیر بڑھتا چلا آ رہا تھا اور ان درندوں کو بجلی نے چمک اور گرج کر بھگایا تھا۔

میں جہاں کھڑا ہوں وہاں ہر سو پتھریلی ٹھیکریاں اور چٹانیں ہیں۔ کہیں کہیں درخت یا درختوں کے جھنڈ نظر آتے ہیں۔ سورج سر پر تپ رہا ہے۔ ٹھیکریاں اور چٹانیں چمک رہی ہیں۔ زمین جیسے شعلے اگل رہی ہو۔ میں درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف چل پڑتا ہوں۔ سائے میں بیٹھ کر سوچوں گا کہ میں کہاں ہوں۔ اب تو یہ سوال بھی پیدا ہونے لگا ہے کہ میں ہوں کون؟ میں وہ تو نہیں جو کل رات سیلاب میں بہہ رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا ڈوب گیا ہوگا... پھر میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟

چلتا ہوں تو قدم اٹھتے نہیں، ٹانگیں اکڑ گئی ہیں، جھک کر ران پر ہاتھ مارتا ہوں، ٹانگیں مصنوعی تو نہیں؟ ٹانگوں کو جھٹکا دے کر آگے دھکیلتا ہوں اور اس طرح اپنے آپ کو دھکے دے دے کر درختوں کے جھنڈ تک جا پہنچتا ہوں۔ سایہ ٹھنڈا ہے، ہوا بھی ٹھنڈی لگ رہی ہے۔ غیر ارادی طور پر منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوں تو چہرے پر لمبے لمبے بال محسوس ہوتے ہیں۔ پھر دونوں ہاتھوں سے چہرے کا جائزہ لیتا ہوں۔ داڑھی بہت بڑھ آئی ہے۔ کل تک تو ذرا ذرا سے بال تھے۔

رات ہی رات میں داڑھی اتنی کیونکر بڑھ آئی ہے؟

اوپر نگاہ جاتی ہے تو درخت کے ساتھ سیاہ کالے جامن دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھتے ہی پیٹ میں درد کی لہر بگولے کی طرح چکر میں دوڑ جاتی ہے۔ بھوک کا انتہائی تلخ احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ میں اٹھتا ہوں، درخت پر چڑھنے لگتا ہوں تو دو گز اوپر جا کر رہ جاتا ہوں۔ بازوؤں میں جسم کو سنبھالنے کی طاقت نہیں رہتی۔ بے بس ہو کر نیچے آ جاتا ہوں اور پتھر اٹھا لیتا ہوں۔

پتھر اوپر پھینکتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے بازو کندھے سے نکل آیا ہے۔ پتھر شاخوں تک پہنچتا ہی نہیں۔ اس قدر کمزوری؟ ... یا خدا! کیا میں بھوکا مر جاؤں گا؟

بھوک... بھوک... بھوک... وہ کوئی اور تھا جس کے بچے ذبح ہو گئے ہیں... مجھے وہ جامن چاہئیں۔ میرے پیدا ہونے کا مقصد یہی تھا کہ اس درخت سے جامن گرانے ہیں۔ نہیں گراؤں گا تو مر جاؤں گا۔ میری لاش گدھ اور گیدڑ کھائیں گے۔

موت کا خوف تھوڑی سی طاقت بیدار کر دیتا ہے۔ میں نے ایک اور پتھر اٹھا کر پھینکا ہے۔ شاخوں تک پہنچ گیا ہے اور تین جامن گرے ہیں۔ میں ان پر جھپٹ پڑتا ہوں اور مٹی صاف کئے بغیر تینوں جامن منہ میں ڈال لیتا ہوں۔ پیٹ میں جاتے ہی ان جامنوں نے آگ لگا دی ہے۔ بھوک اور تیز ہو گئی ہے۔ میں نے پتھر پہ پتھر پھینکے ہیں۔ کوئی جامن نہیں گرا۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ دوڑ کر درخت کے تنے سے لپٹ گیا ہوں۔

ایک ایک انچ اوپر چڑھ رہا ہوں۔ ہاتھ مضبوطی سے تھام نہیں سکتے۔ پاؤں جم نہیں رہے۔ ٹانگوں میں سکت نہیں مگر میں آٹھ دس گز اوپر چڑھ گیا ہوں۔ اگر اوپر سے جا گرا تو گر کر کمر توڑ لوں گا۔ اب مجھے اوپر ہی جانا ہے۔ جسم سے پسینہ پھوٹ کر بہہ رہا ہے۔ ہمت ختم، طاقت مفقود۔

آدھا انچ اور اوپر کو سرک گیا ہوں اور پھر شاید ساری عمر گزر گئی ہے اور میں اوپر چڑھ گیا ہوں۔

اس قدر تیزی سے جامن توڑے اور کھائے ہیں کہ بعض جامن تو گٹھلیوں سمیت نگل گیا ہوں۔ پیٹ بھر لیا ہے اور دماغ سوچنے کے قابل ہو گیا ہے۔ نیچے اترنے لگتا ہوں تو بازو جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نظر آتے ہیں۔

جس درخت نے پیٹ بھرا ہے اسی کی چھاؤں تلے لیٹ گیا ہوں۔ دماغ اپنے آپ سوچنے لگا ہے۔ ذہن پیچھے کو چل پڑا ہے۔ داڑھی جو اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے، ایک رات میں یا دو تین دنوں میں نہیں بڑھی۔ میں تو شاید مہینے بھر سے بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ اگر مہینہ نہیں تو پندرہ بیس دن تو ضرور ہی گزر گئے ہیں۔ کبھی تو ایسے لگتا ہے جیسے ساری عمر اس ویرانے سے بھٹکتے گزر گئی ہے۔

ذہن کی حالت ایسی ہے جیسے کالے کالے بادل آتے ہیں۔ چمکتی دھوپ بجھ جاتی ہے۔ بادل گزر جاتے ہیں تو دھوپ پھر چمکنے لگتی ہے۔ بالکل اسی طرح ذہن تاریک اور روشن ہو رہا ہے۔ ایک یاد سی آتی ہے اور ذہن پھر تاریک ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے سے تصویریں سی گزرنے لگتی ہیں اور دھندلا جاتی ہیں۔ قافلے سے گزرتے ہیں۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کے قافلے جو دھند میں غائب ہو جاتے ہیں۔

اب تو میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اگست کی کون سی تاریخ ہے نہ یہ معلوم ہے کہ یہ مہینہ اگست کا ہے یا اگلا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔

اداسی، مایوسی، ناامیدی اور تنہائی کے سوا اور کوئی احساس زندہ نہیں رہا۔ اب تو اٹھنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ کیا میں اس درخت تلے مر جاؤں گا؟ اگر تھلیاں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مر جاتا تو اچھا تھا۔ ہندو اور سکھ بھی کہتے کہ یہ شخص بھی پاکستان کے نام پر مرا ہے۔

آنسو بہنے لگے ہیں۔ ہچکی بندھ گئی ہے۔

ذہن سے پھر ایک آواز اٹھی ہے جیسے کوئی قریب سے گزر رہا ہو۔ میں اب چونکتا نہیں کیونکہ اب ہر آواز جو سنائی دیتی ہے، میری اپنی ذات کی آواز ہوتی ہے۔

زرد پیلے اور کانپتے ہاتھوں سے آنسو پونچھ ڈالے ہیں۔ ادھر اُدھر دیکھا ہے۔ میں ایک ٹیکری پر بیٹھا ہوں جس پر جامن کا درخت ہے۔ اچانک سامنے نظر جاتی ہے تو خوف سے سکڑ جاتا ہوں۔ پچیس تیس گز دور ٹیکری سے نیچے درختوں کا ایک جھنڈ ہے۔ اس کے نیچے ایک عورت کھڑی ہے جو عورت نہیں ہو سکتی...... یا تو ان تصویروں میں ایک تصویر ہے جو مجھے نظر آتی اور دھندلا جاتی ہیں یا چڑیل ہے۔ اس کے بال ڈراؤنے طریقے سے کھلے اور بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرے کے کئی رنگ ہیں۔ کپڑے اس طرح پہنے ہوئے کہ وہ کپڑوں کے باوجود ننگی ہے۔ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے اور میں انتظار کر رہا ہوں کہ یہ تصور دھندلا جائے اور میں سوچ سکوں کہ یہیں لیٹ جاؤں اور خدا کے حضور جا پہنچوں یا پاکستان کی سمت روانہ ہونے کی ایک آخری کوشش کر دیکھوں۔

درختوں تلے کھڑا عورت کا تصور دھندلاتا نہیں۔ عورت آہستہ سے سرک کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئی ہے اور مجھے جھانک رہی ہے۔ پھر وہ اس تنے سے ہٹ کر ایک اور درخت کی اوٹ میں ہو گئی ہے...... مجھ پر خوف طاری ہو گیا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ ایک اور درخت کے تنے سے جا لگی ہے۔ اب یقین ہو گیا ہے کہ وہ تصور یا میرے ذہن کی تصویر نہیں۔ وہ شاید چڑیل بھی نہیں...... اس کا انداز بتا رہا ہے کہ وہ مجھ سے ڈر رہی ہے۔

وہ میری طرح پاکستان کے راستے کی بھٹکی ہوئی عورت نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرے اندر ایک جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ میں کہ جو ہڈیوں کا کھڑکھڑ کرتا ڈھانچہ بن چکا ہوں، وہ مرد بن جاتا ہوں جس نے پاکستان کے

نام پر اپنی بیوی اور ننھے منے دو بچے ذبح کرائے ہیں۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ نزع کا عالم شروع ہو چکا ہے اور کوئی دم کا مہمان ہوں مگر میں اٹھ کھڑا ہوا ہوں...... تب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ ہو تو لاشیں بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔

میں عورت کی طرف چل پڑا ہوں۔ میری ٹانگوں میں طاقت آ گئی ہے۔ وہ جو ایسی بدحال ہے مسلمان عورت ہی ہو سکتی ہے۔ مگر مجھے چلتا دیکھ کر وہ دوسری طرف چل پڑی ہے۔ گھوم کے دیکھتی ہے اور تیز چل پڑتی ہے۔ مجھ سے بھاگ رہی ہے۔ میں ٹیکری سے اتر گیا ہوں اور وہ دوڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ دوڑ نہیں سکتی۔ دوڑ تو میں بھی نہیں سکتا مگر یہ نہ دوڑ سکنے کا احساس ہے۔ ٹانگوں کو زور سے آگے کرتا ہوں تو ان میں دوڑنے کی قوت آ جاتی ہے۔

میں اسے بلانے کی کوشش کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میری زبان بے جان ہے۔ تھلیال سے نکلنے سے اب تک میں نے صرف خدا سے ایک بار باتیں کی تھیں۔ بھوک، پیاس، تھکن اور جسم میں خون ختم ہو جانے سے زبان سوکھ گئی ہے۔

خیال آتا ہے کہ یہ خواب تو نہیں؟...... نہیں، خواب میں تو میں اپنی بھولی بھالی بیوی اور بچوں سے کھیلا کرتا ہوں۔ خواب میں ان کے کٹے ہوئے سر جڑ جاتے ہیں۔ ہم چاروں تھلیال سے دور اپنے خوبصورت گاؤں میں چلے جاتے ہیں۔ میں نے ابھی تک کوئی ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا۔ صرف ایک بار خواب میں پاکستان کے جھنڈے تلے اپنی بیوی اور بچوں کے کٹے ہوئے سر پڑے دیکھے تھے لیکن میں ڈرا نہیں تھا۔ میں نے مسرت سے بھرپور لہجے میں جانے کس سے کہا تھا۔ ''اس جھنڈے کی ہریالی میں میرے جگر کا خون شامل ہے''۔

بھاگی جا رہی ہے۔ ایک حقیقت ہے...... اسی حقیقت نے اور ایسی کئی حقیقتوں نے جنہیں ہندوؤں اور سکھوں نے ہندوستان کے بازاروں میں ننگا کر کے گھمایا تھا، پاکستان کو حقیقت کا روپ دیا ہے۔ پاکستان اس عورت نے بنایا ہے جو ہندوستان کے ویرانے میں ننگی بھٹک رہی ہے۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ ایک ٹیکری کی اوٹ میں چلی گئی ہے۔ ٹیکریاں بلند ہو گئی ہیں۔ زمین پتھریلی ہے۔ ہم دونوں ننگے پاؤں دوڑ رہے ہیں۔ اسے نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھ کر میں اور تیز دوڑ پڑا ہوں۔ ٹیکری کا موڑ مڑتا ہوں تو آگے ایک اور ٹیکری کا موڑ آ جاتا ہے۔ میں ادھر کو مڑ جاتا ہوں۔ دور سے پتھروں پر دوڑنے کی دبی دبی آہٹ سنائی دے رہی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تیز نہیں دوڑ سکتی، پاؤں گھسیٹ رہی ہے۔

میں ادھر کو مڑتا ہوں۔ آگے ذرا کھلی جگہ نظر آتی ہے جو ٹیکریوں میں گھری ہوئی ہے۔ عورت رک گئی ہے اور میری طرف دیکھ رہی ہے میں اس تک پہنچ جاتا ہوں۔ عورت مٹی کی تین ڈھیریوں کے پاس کھڑی ہے۔ یہ ڈھیریاں قبروں کی شکل کی ہیں۔ ایک بڑی، دو چھوٹی چھوٹی۔

میں اس سے پانچ چھ قدم دور رک گیا ہوں۔ دونوں کی سانسیں پھولی ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف ہے۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی ہے تو میرے منہ سے آواز نکلتی ہے...... ''کون ہو تم انسان ہو؟ مسلمان ہو؟''...... اچانک اس کی ایسی چیخ نکل جاتی ہے کہ میرا دل دہل جاتا ہے۔

وہ پھر دوڑنے لگتی ہے مگر ایک ڈھیری سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتی ہے۔ میں شکار پر جھپٹتے بھیڑیے کی طرح اس پر جا پڑتا ہوں اور اٹھنے سے پہلے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دبا لیتا ہوں۔

اس نے میرے منہ پر تھوک دیا ہے اور ناخنوں

[illegible] میرے آگے

سے میرے اس بازو کو چھیل کر لہولہان کر دیا ہے جس سے میں نے اسے دبا رکھا ہے۔ اس میں اتنی طاقت نہیں کہ میرے بازو کے دباؤ کے نیچے سے نکل سکے۔ ذبح ہوتے بکرے کی طرح تڑپ رہی ہے۔

میں سمجھ جاتا ہوں۔ میری داڑھی سے وہ مجھے سکھ سمجھ رہی ہے۔ میں اسے یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں مگر وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ دھوپ تیز ہے۔ میں اسے بازوؤں پر اٹھا کر قریب ایک درخت کی چھاؤں میں جا لٹاتا ہوں۔ وہ میری بیوی کی طرح جوان لڑکی ہے۔ ناک نقش بڑے اچھے ہیں۔ گلے میں تعویذ ہے۔ وہ یقیناً مسلمان ہے۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ پانی کا کہیں نشان نہیں، وہ بے ہوش ہے۔

ایک بڑی اور دو چھوٹی قبروں کو دیکھ کر ساری بات سمجھ جاتا ہوں۔ یہ تین ڈھیریاں وہی آپ بیتی سنا رہی ہیں جو مجھ پر بیتی ہے۔

اس کی آنکھیں ذرا سی کھلی ہیں اور جسم ایک بار پھر تڑپا ہے۔ وہ پھر چیخنے لگی ہے۔ میں بول پڑتا ہوں۔ ''میں مسلمان ہوں، پاکستان کے راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی منزل کے بھٹکے ہوئے مسافر ہیں''۔ میں کلمہ شریف پڑھتا ہوں۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہے۔ اچانک چپ ہو کر میری طرف دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔ ''اگر مسلمان ہو تو ایک کرم کرو۔ ان قبروں کے قریب ایک اور قبر کھود کر مجھے دفن کر دو اور اگر تم پاکستان پہنچ گئے تو پاکستان والوں کو بتا دینا کہ ایک عورت نے اپنا خاوند اور چھوٹے چھوٹے بچے ...'' اور وہ بلبلا اٹھی ہے۔

یا خدا، مدد عطا فرما ... وہ ایسے درد ناک طریقے سے رو رہی ہے کہ میری مردانگی ریزہ ریزہ ہونے لگی ہے۔

میں اسے ... لگا لیتا ہوں۔

وہ نڈھال ہو کر اپنا آپ میرے سینے پر ڈال دیتی ہے۔ اس کے وجود سے مجھے اپنے بچوں کی ماں کی بوباس آنے لگی ہے۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے میرے بچے اسی جوان لڑکی کا دودھ پیتے رہے ہیں۔

سورج ٹیکریوں کی اوٹ میں چلا گیا ہے۔ ہم دونوں ایک درخت تلے بیٹھے ہیں۔ رو دھو کر اسے کچھ سکون نصیب ہوا ہے اور اس نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا ہے جس میں اب غم ہے، دکھ ہے لیکن خوف اور وحشت نہیں ... اور میں سوچ رہا ہوں کہ یہ رات جو اپنے اندھیروں کو لئے بڑھی چلی آ رہی ہے، کیسے گزرے گی، کہاں گزرے گی؟

میں نے اس سے پوچھا ہے ''چل سکو گی؟''... اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا ہے جس میں ہاں بھی ہے نہیں بھی۔

ہم تین قبروں کے پاس کھڑے ہیں۔ فاتحہ پڑھ رہے ہیں الوداعی فاتحہ ... پھر ہم دونوں بچوں کی طرح روتے ہیں اور چل پڑے ہیں وہ گھوم گھوم کر قبروں کو دیکھ رہی ہے اور میں اسے کہہ رہا ہوں ''پیچھے مت دیکھو، آؤ جلدی جلدی۔ اس ٹیکری کی اوٹ میں ہو جائیں تاکہ ہمیں پیچھے رہنے والی کوئی چیز نظر نہ آئے''۔

ہم چلے جا رہے ہیں ... شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔

(مسافر اکیلا تھا تو بھوکا بھی رہ سکتا تھا، پیاسا بھی۔ اب اس کے ساتھ ایک جوان سال عورت ہے۔ اسے پتہ معلوم نہیں کہ وہ جس طرف جا رہا ہے پاکستان اسی طرف ہے۔ عورت اس کے لئے نیا مسئلہ بن گئی ہے۔ اس کی داستان کا بقایا ... میں پڑھئے!)

◆✱◆

☆ محمد نذیر ملک

اصل

نام تو اس کا محمد بوٹا تھا لیکن کمزور شناخت کی بنا پر وہ فقط بوٹا ہی رہ گیا۔

بوٹا چھوٹی مکھیوں کے شہد کا بیوپاری تھا۔ وہ ٹیلکوں پہاڑیوں والے جنگل "گندھالہ" میں بیری، پھلاہی، کیکر اور کہو کے درختوں پر لگا شہد اتارا کرتا تھا۔ بوٹے کی نظر لوہے کی تھی۔ ایک بار جو شہد کی مکھی اس کے سامنے سے اڑتی ہوئی گزر جاتی تو پھر وہ بوٹے کی عقابی نگاہوں سے کبھی غائب نہیں ہوسکتی تھی۔ بوٹا اس کے تعاقب میں اس کے چھتے تک پہنچ کر ہی دم لیتا تھا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ شہد کی مکھیاں اس کی دوست معاون اور مددگار ہوتی ہیں، وہ خود اسے راستہ دکھاتی ہوئی اپنے گھر تک لے جاتی ہیں۔

گاؤں میں جب کہیں بھی شہد دستیاب نہ ہوتا تو لوگ بے دھڑک بوٹا کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور وہ وہاں سے کبھی مایوس نہیں لوٹتے تھے۔

بوٹا روزانہ صبح سویرے مٹی سے بنی کنویں سے پانی نکالنے والی خالی ٹنڈ (مٹی کا بنا ایک کھلے منہ والا چھوٹے گھڑے جیسا برتن) کے گلے میں رسی ڈالے اسے بغل میں لٹکائے ہاتھ میں درانتی پکڑے گھر سے گندھالہ کے لئے نکل پڑتا تھا اور اکثر مغرب کے بعد جب وہ گھر لوٹتا تو ٹنڈ شہد سے بھری ہوتی اور اس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوتا۔ بوٹا کے چہرے، ہاتھوں اور بازوؤں پر مکھیوں کے کاٹنے کے بے شمار نشانات موجود رہتے۔ تاہم بوٹا اپنے کام میں ماہر تھا۔ وہ نہایت سلیقے اور ماہرانہ انداز سے شہد اتارا کرتا تھا۔

شہد کے چھتے کو ایک نظر دیکھتے ہی وہ پہچان لیتا کہ چھتہ کچا ہے یا پکا۔ اگر کچا ہے تو اب مزید کتنے دنوں میں پک جائے گا۔ یوں بوٹے نے جنگل میں مختلف جگہوں پر لگے کئی ایک شہد کے چھتے گویا اپنے تئیں پال رکھے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے اتارنے کی اپنے ہاں باری لگا رکھی تھی کہ کون سا شہد کا چھتہ کب اتارنا ہے۔ شہد اتارنے کا بوٹے کا مخصوص طریقہ کار تھا۔

وہ مکھیوں کے چھتے کے نیچے اکثر آگ جلا کر اس کا دھواں ڈال دیتا جس سے چھتے کی زیادہ تر مکھیاں اڑ جاتیں اور بوٹا بڑے آرام سے درانتی کی نوک چھتے میں چبھو کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ وہ چھتے سے شہد کی دھار کے نیچے زمین یا درخت پر جما کر ٹنڈ رکھ دیا کرتا تھا۔ شہد ٹنڈ میں ٹپکنے لگتا۔ موسم کی خرابی کے باعث اگر آگ نہ بھی جلتی تو بوٹے کو اس کی پروا نہ ہوتی۔ ایسے میں وہ چھتے کے بالکل قریب جا کر نہایت محتاط طریقہ سے درانتی سے مکھیوں کو ادھر ادھر کر کے چھتے کے اندر درانتی کی نوک چبھو دیتا۔ وہ مکھیوں کو بھی اشتعال نہ دلاتا۔ وہ انہیں یہ احساس تک نہ ہونے دیتا کہ ان کے چھتے پر کسی طرح کا کوئی حملہ ہوا ہے۔ بوٹا کا رویہ مکھیوں کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہوا کرتا اور مکھیاں بھی بوٹا سے دوستی کی بظاہر لاج رکھتے ہوئے نہایت آرام سے بوٹا کی درانتی کو اپنا کام کرنے کے لئے راستہ دے دیتیں۔

بوٹا گندھالہ کی جنگلی حیات کے بارے میں بھی کافی معلومات اور تجربہ رکھتا تھا۔ وہ گندھالہ کے جنگل میں بسنے والے درندوں، جنگلی جانوروں، پرندوں اور ہر طرح کے حشرات الارض کے متعلق معلومات رکھتا تھا۔ گندھالہ کے جنگل میں خرگوش، سیہہ، لومڑ، گیدڑ، لکڑبگا، بھیڑیا، جنگلی بلا، ہرن اور پہاڑی بکرا پایا جاتا تھا لیکن ریچھ نام کا کوئی جانور وہاں نہیں تھا۔ تاہم ایک بار بوٹا کی ایک ریچھ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ دراصل یہ کسی مداری کا بھاگا ہوا ریچھ تھا جو گندھالہ کے پہاڑی جنگل میں گم ہوگیا تھا۔

یہ ہمارے بچپن کا دور تھا، سردیوں میں بالخصوص جس روز دھیمی جھڑی (ہلکی بارش) لگتی اور ہمیں اور بوٹا کو کوئی کام نہ ہوتا تو ہم دو تین ہمجولی مل کر بوٹا کے گھر پہنچ جاتے اور اس سے گندھالہ کے جنگل کی کوئی نہ کوئی کہانی

سنانے کی فرمائش کر ڈالتے۔

ایسے ہی ایک ساون کی جھڑی والے دن جب ہم تین دوست بوٹا کے گرد بیٹھے تھے تو ہم نے اس سے ریچھ والی کہانی سنانے کو کہا۔ یہاں تک تو ہمیں بوٹا کی کہانی اکثر یاد تھی کہ وہ ریچھ کس طرح مداری سے خفا ہو کر جنگل میں غائب ہو گیا تھا۔ اس سے آگے بوٹا نے بات یوں سنائی۔

ریچھ چھوٹی مکھیوں کے شہد کا رسیا ہوتا ہے۔ ایک بار جو یہ شہد کا میٹھا ذائقہ چکھ لے تو پھر بنا شہد کھائے اسے چین نہیں آتا۔ پھر وہ شہد کھانے کو ہر وقت بے چین رہتا ہے۔

ریچھ چونکہ شہد کے چھتے پر نہایت والہانہ انداز سے حملہ آور ہوتا ہے اور سیدھا جا کر مکھیوں بھرے چھتے میں اپنا منہ اور پنجہ گاڑ دیتا ہے تو یہ بات مکھیوں کو کسی طور پر گوارا نہیں ہوتی۔ وہ اس جارحیت کا بھرپور جواب دیتی ہیں اور حملہ آور پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ مکھیوں کا آسان شکار تو ریچھ کی تھوتھنی ہوتی ہے اور پھر کسی حد تک ہاتھ اور پاؤں کے پنجے ہوتے ہیں جو نیچے سے بالوں سے خالی ہوتے ہیں جبکہ ریچھ کا باقی کا تمام جسم لمبے لمبے گھنے بالوں سے اٹا ہوتا ہے جہاں پر ڈنک چلانا مکھیوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

ورنہ شہد کی مکھیاں تو چھتے پر حملہ کرنے والے پر زوردار طریقے سے بھرپور حملہ کرتی ہیں اور حملہ آور کے پاس بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں ہوتی۔ شہد کی مکھیاں دور دور تک حملہ آور کا پیچھا کرتی ہیں بلکہ ہم نے یہاں تک دیکھا ہے کہ اکثر لوگ مکھیوں سے بچنے کے لئے کسی تالاب یا جوہڑ میں ڈبکی لگا لیتے ہیں تو بھی مکھیاں پانی کے اوپر بھنبھناتی رہتی ہیں اور جونہی وہ سانس لینے کے لئے پانی سے اپنا منہ نکالتے ہیں مکھیاں فوراً اسے ڈنک مار دیتی ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک دن جنگل میں بچپن میں ہی ایک بھولی ان مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ بیٹھا۔ مکھیوں نے غول کی شکل میں اس لڑکے پر حملہ کر دیا۔ اس بے چارے کے پاس اپنے بچاؤ کا کوئی سامان نہ تھا۔ نہ ہی وہاں کوئی قریب میں کوئی جوہڑ یا تالاب تھا کہ وہ اس میں ڈبکی لگا لیتا۔ نہ چادر نہ کپڑا جس سے وہ اپنا چہرہ اور ہاتھ وغیرہ ڈھانپ لیتا۔

مکھیوں نے اس پر یلغار کر دی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے ایک کانٹے دار جھاڑی میں اپنا سر دے دیا تا کہ وہ چہرہ بچا سکے۔ اتفاق سے میں اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اس نے مجھے آواز دی۔ میں نے سوچا یہ وہاں جھاڑی میں کیا کر رہا ہے۔ ابھی میرا دھیان مکھیوں کے غول کی جانب نہیں گیا تھا۔ اس لڑکے نے دیکھتے ہی مجھے آواز دی کہ خدارا اپنی چادر میری طرف پھینکو۔

میں وہ خوفناک منظر آج تک نہیں بھول سکا کہ مکھیاں جھنڈ کی صورت میں اس پر حملہ آور تھیں اور وہ جھاڑی کے اوپر اس بھاری تعداد میں موجود تھیں کہ وہاں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ وہ اس جھاڑی اور اس لڑکے پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ میں صورت حال سمجھ گیا تھا۔ اب مجھے یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر میں اس لڑکے کے قریب گیا تو مکھیاں مجھ پر بھی حملہ آور ہو جائیں گی۔ پھر میرے لئے بھی کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔ میں زمین پر لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے اپنی چادر کا گولہ سا بنایا اور رینگ کر اس جھاڑی کے قدرے قریب ہوا تا کہ میں چادر اگر اس کی جانب پھینکوں تو وہ اس تک پہنچ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم کیا میری تدبیر کامیاب رہی اور چادر اس لڑکے تک پہنچ گئی اس نے ہاتھ بڑھا کر چادر پکڑ لی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ سر اور اپنا چہرہ مکمل طور پر چادر میں ڈھانپ لیا۔ ادھر مجھے اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی

کہ بپھری ہوئی مکھیاں ممکن ہے اسے چھوڑ کر مجھے ہی نہ اپنے نرغے میں لے لیں۔ ایسی صورت میں میرے پاس تو بچاؤ کے لئے اپنی چادر بھی نہیں تھی۔ میں اس لڑکے کو اس کے حال پر چھوڑتا رینگتے ہوئے مکھیوں کے حصار سے باہر نکل آیا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مکھیاں مجھ پر بالکل بھی حملہ آور نہیں ہوئیں اور میں نے گھر کی راہ لی۔ میں دل میں یہ شرم بھی محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اس لڑکے کی سوائے چادر دینے کے کوئی مدد نہیں کی اور فقط اپنی جان بچا کر وہاں سے نکل آیا۔

دوسرے روز اس لڑکے کی نانی ہمارے گھر آئیں۔ میں سمجھا یہ شکایت لے کر آئی ہوں گی کہ میں اس کے نواسے کو اکیلا چھوڑ کر گھر آ گیا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کی نانی کے ہاتھوں میں میری چادر تھی اور وہ میرا اور میری والدہ کا شکریہ ادا کرنے آئی تھیں کہ میں نے اس کے نواسے کی جان بچائی ہے۔ اگر میں بروقت وہاں نہ پہنچتا اور اسے چادر نہ دیتا تو نہ جانے اس کا نواسہ زندہ بھی بچ پاتا یا نہیں۔ اس کی نانی کی یہ بات سن کر میری جان میں جان آئی۔ اس نے بتایا کہ اس کا نواسہ ابھی تک بخار میں تپ رہا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ جان سے بچ گیا ہے۔

مجھے یوں لگا کہ مکھیاں بھی اپنے حملہ آور کی پہچان رکھتی ہیں۔ جوابی حملہ کی صورت میں وہ اپنے مخصوص ٹارگٹ سے ہٹ کر اِدھر اُدھر ڈنک نہیں مارتی پھرتیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں خواہ مخواہ فساد برپا نہیں کرتیں۔

یہ تو میرے سامنے رونما ہونے والے واقعہ کا ذکر تھا۔ اب آیئے بوتا کی کہانی کی طرف چلتے ہیں۔ ایک دفعہ میں ایک شہد کے پیچھے گیا جو میں نے کچھ دنوں سے دیکھ رکھا تھا۔ یہ ذرا کچا تھا اور اس کے پکنے میں ابھی چند دن باقی تھے۔ لہٰذا میں نے اسے دانستہ چھوڑ رکھا تھا۔ یہ شہد کیکر کے ایک درخت کی درمیانی شاخ پر لگا ہوا تھا۔

میں نے جب نگاہ اٹھائی تو ایک منظر نے میرے پاؤں جکڑ لئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کالے رنگ کا ایک بہت بڑا ریچھ جس کے نتھنوں میں لوہے کی مندری ہے اور ساتھ ذرا سی رسی ہے۔ ایک ٹہنی پر کھڑا ہو کر اپنا منہ شہد کے چھتے میں ڈالے چھتے اور مکھیوں سمیت شہد کھا رہا ہے۔ چھتے کی مکھیاں جتھوں کی صورت میں اس کے منہ سر اور جسم پر چپکی ہوئی ہیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ ریچھ اپنے مالک سے بھاگا ہوا ہے۔ مکھیوں کے جھرمٹ نے گویا ریچھ کو چھپا رکھا ہے۔ ریچھ کا منہ مکھیوں سے بھرا ہوا تھا جو اسے بے طرح کاٹ رہی تھیں لیکن ریچھ شہد بھرے چھتے کو مکھیوں سمیت کھائے چلا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اسے مکھیوں کے کاٹنے کی اذیت سے زیادہ شہد مزا دے رہا تھا۔ وہ جب شہد چاٹنے کے لئے زبان باہر نکالتا تو مکھیوں کا ایک جھنڈ اس کی زبان سے چمٹ جاتا پھر بھی وہ شہد کی مٹھاس کے نشہ میں بدمست تھا۔ وہ کسی طور بھی شہد سے دستبردار نہیں ہو رہا تھا۔

میں ذرا فاصلہ پر کھڑا یہ تمام منظر دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ ریچھ میرے حصہ کا موجودہ اور آئندہ حاصل ہونے والا شہد بھی کھا رہا ہے کیونکہ ریچھ شہد کے ساتھ شہد کی مکھیاں اور ان کے نوزائیدہ بچے بھی کھا رہا تھا۔ بالآخر ریچھ تمام تر چھتہ کھا گیا اور باقی صرف بپھری ہوئی بھنبھناتی مکھیاں رہ گئی تھیں۔

تب ریچھ جو یہ سارا عمل کیکر کے ایک کانٹے دار ٹہن پر دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر کر رہا تھا نیچے آیا اور آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ مکھیاں اب بھی اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھیں لیکن اب خالی ریچھ ان کے کسی کام کا نہ تھا۔ آخر ایک زبردست شور کے ساتھ مکھیوں کا غول دوسری جانب پرواز کر گیا۔ تاہم کچھ مکھیاں اب بھی ریچھ کے منہ پر چپکی دکھائی دیتی تھیں۔ مکھیوں کے زہر سے ریچھ کے نتھنے سوج چکے تھے اور آنکھیں ابھر آئی تھیں پھر آہستہ آہستہ اکا دکا

مکھی بھی اس کا پیچھا چھوڑ گئی کیونکہ انہیں اپنے غول میں شامل ہونے کی جلدی تھی۔

ریچھ جب شہد کھا چکا تو اس کے جسم میں مکھیوں کے کاٹنے کا درد سوا ہو گیا اور وہ درد سے ہلکا ہلکا غرانے لگا پھر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔ اس کے نتھنے، منہ اور آنکھیں بری طرح سوج چکی تھیں۔ اس نے جب اپنی زبان باہر نکالی تو اس کا بھی برا حال تھا۔ اس نے اپنی زبان پر مکھیوں سے بے شمار ڈنک کھائے تھے۔ بہر حال وہ اذیت سے بے حال ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں کے تلوے بھی ابھر آئے تھے۔ کہتے ہیں مصیبت سے زیادہ مصیبت کا احساس تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ حیوان تھا اسے اس مصیبت کا مکمل ادراک نہ تھا۔ اس لئے وہ برداشت کر گیا۔ اگر اس میں شعور ہوتا تو وہ کبھی اٹھ نہ پاتا۔ اسے اس کا شعور مار ڈالتا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے قریب گیا۔ وہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھنے لگا اور پھر لیٹ گیا۔ اس میں اٹھنے کی ہمت نہ تھی۔ میں اس کے اور قریب ہو گیا اور اس کے ہاتھ اور پاؤں کے تلوے پکڑ کر دبانے لگا۔ وہ انسانوں کے ساتھ رہنے کا عادی پالتو ریچھ تھا اگر اس کی جگہ جنگلی ریچھ ہوتا تو فوراً حملہ آور ہو جاتا لیکن اس ریچھ نے لیٹے لیٹے اپنے بازو پھیلا دیئے شاید اسے سکون آنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں کو سہلانے سے اسے راحت پہنچ رہی تھی۔ میں اس کے منہ اور نتھنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ زبان نکال کر میرے ہاتھوں کو چاٹنے لگا۔ وہ درد سے آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ میرے پاس معجون کی شکل میں مکھیوں کے کاٹے کی ایک دوا تھی جو میں نے علاقہ کے مشہور حکیم اور سنیاسی شاہ ولی سے حاصل کر رکھی تھی۔ میں نے یہ مرہم (معجون) ریچھ کے تمام تر منہ اور ہاتھ پاؤں کے تلوؤں پر لگا دی۔ یہ زود اثر معجون تھی۔ ریچھ کو درد سے فوری افاقہ ہوا تو وہ اٹھ بیٹھا [illegible] نوں سے

مانوس تھا، اس لئے مجھے دیکھ کر غضب ناک نہیں ہوا۔

اس نے میری بغل میں لٹکی شہد والی ٹنڈ دیکھ لی اور اس پر اپنی زبان پھیرنے لگا۔ میں نے ریچھ سے دوستی پکی کرنے کے لئے ٹنڈ میں سے کچھ شہد اس کے سامنے گھاس والی زمین پر انڈیل دیا۔ وہ نہایت رغبت سے شہد چاٹنے لگا اور لمحوں میں اس نے زمین پر گرا شہد چاٹ لیا۔ گو کہ اس کی زبان کی حالت کافی ناگفتہ بہ تھی۔ میں اس کی زبان پر معجون لگانے سے کترا رہا تھا کہ مبادا یہ اسے فائدہ کی بجائے الٹا کوئی نقصان نہ پہنچا ڈالے۔ تاہم شہد کی مٹھاس کے سامنے اس نے اپنی تکلیف کی پروا نہ کی، وہ اور شہد مانگنے لگا اور حریص نظروں سے دوبارہ ٹنڈ کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے دوبارہ کچھ شہد انڈیلا جو اس نے چٹخاروں میں اڑا دیا۔ پھر وہ میرے درپے ہو گیا اور ٹنڈ پر اپنے پنجے مارنے لگا۔ میں ٹنڈ کو بمشکل بچائے ہوئے تھا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے ٹنڈ چھین لے گا۔ یا پکڑ کر توڑ دے گا آخر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے پورے زور سے دونوں بازوؤں سے ٹنڈ پکڑ لی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ریچھ سے شہد والی اپنی ٹنڈ بچاؤں لیکن ظالم تھا بہت طاقتور۔ حتیٰ کہ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ تب میں بھی جوان تھا۔ میں نے بھی شہد کھایا پیا ہوا تھا۔ کبھی میں اوپر اور کبھی وہ میرے اوپر۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا زیادہ دھیان ٹنڈ کی طرف تھا۔ میں ٹنڈ بچانا چاہتا تھا اور وہ اسے توڑنے کے درپے تھا۔ جو مجھے گوارا نہ تھا۔

آخر اس دھینگا مشتی میں ٹنڈ گر کر ٹوٹ گئی اور اب ریچھ کے لئے باقی ماندہ شہد حاصل کرنا آسان ہو گیا۔ وہ بڑے اشتیاق سے شہد چاٹنے لگا حتیٰ کہ اس نے بچا کھچا تمام تر شہد بھی چاٹ ڈالا۔ اب وہ خوب سیر ہو چکا تھا۔ میں بھی الگ سے ایک جگہ بیٹھ کر ہانپنے لگا اور اس کا رویہ دیکھنے لگا۔

وہ اب زمین پر لیٹ کر کروٹیں لینے لگا جو غالباً اس

بات کی نشاندہی تھی کہ اب تک اس نے جو کھایا پیا تھا ہضم کر رہا ہے۔ میرا کافی وقت برباد ہوا تھا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ چونکہ ریچھ نے میری ضد بھی توڑ دی تھی لہٰذا مزید شہد کی تلاش فضول تھی میں نے سوچا اب واپس گھر کی راہ لینا چاہئے۔ میں گھر جانے والے راستہ پر پڑا ہی تھا کہ ریچھ بھی میرے تعاقب میں چل پڑا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اپنے ساتھ رکھوں کیونکہ وہ میری روزی روٹی کے درپے تھا۔ اس کا اور میرا ساتھ نہیں بن سکتا تھا۔ وہ جس کسی کا تھا اس کا تھا اس نے اپنے مالک مداری سے وفا نہیں کی تھی میرا کب وفادار ہو سکتا تھا۔ الغرض وہ میرے کسی کام کا نہ تھا۔ میں نے اس کا کیا کرنا کیا تھا۔ میرے باپ دادا میں سے کسی نے ریچھ نہیں رکھا تھا اور میں بھی اپنا پیشہ بدلنے کو تیار نہ تھا۔

میں اس کے نہ لوٹ جانے سے کترا رہا تھا لیکن وہ برابر میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ میں دوڑتا تو وہ بھی میرے پیچھے دوڑ لگا دیتا۔ میں آہستہ ہو جاتا تو وہ میرے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگتا۔ ”عجیب ضدی ریچھ ہے“ میں نے بیزاری سے سوچا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے ایک جگہ میں زمین پر چاروں شانے چت لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ فوراً میرے منہ کی طرف پلٹا اور اپنا منہ میرے منہ پر رکھ کر مجھے سونگھنے لگا۔ میں نے اپنا سانس چڑھا لیا اور مردہ بن کر لیٹا رہا۔ وہ کبھی میرے منہ، گالوں اور کبھی ہاتھ اور پاؤں کے تلوے چاٹنے لگتا اور پھر میرے منہ کی طرف آ جاتا۔ وہ بے حد پریشان لگتا تھا۔ میں بھی دم سادھے پڑا رہا۔

آخر وہ سوگوار سا ہو کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے لیکن وہ مجھے چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں بھی آنکھوں کے کناروں سے اس کا بغور جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں ہی پڑے پڑے کافی وقت گزر گیا، مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری یہ ترکیب بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی اور یہ کہ ریچھ مجھ سے ٹلنے والا نہیں ہے۔ میں آنکھیں موندے چاروں شانے چت زمین پر پڑا تھا کہ مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ مجھے یوں لگا کہ ریچھ کی بھی جان میں جان آ گئی ہے۔ وہ پھر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس اثنا میں کہیں سے ادھیڑ عمر کا ایک شخص نمودار ہوا اور اس نے ریچھ کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس شخص کے ہاتھ میں رسی اور لاٹھی تھی۔ جونہی وہ آدمی ریچھ کے قریب پہنچا اس نے رسی کا پھندہ جو اس نے پہلے سے بنا رکھا تھا ریچھ کی طرف پھینکا۔ ریچھ اپنے پاؤں پر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رسی کا پھندہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اسے دور پھینک دیا۔

اب اس آدمی نے ریچھ کو پچکارنا شروع کر دیا اور وہ بڑے شفقت بھرے انداز میں ریچھ کے قریب ہونے لگا۔ اچانک ریچھ نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس شخص کے رسید کیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا۔ اس شخص نے جو چالباز مداری تھا اور ریچھ کا مالک تھا۔ اپنی لاٹھی تھام لی۔ وہ لاٹھی تول کر ریچھ کی جانب بڑھا۔ ریچھ پہلے بھی کافی چوکنا تھا۔ مداری نے ریچھ پر لاٹھی برسانے کے لئے جونہی اسے ہوا میں لہرایا ریچھ نے جست لگا کر اس سے لاٹھی چھین لی اور اسے اپنے دونوں پاؤں کے نیچے رکھ کر بازوؤں کی قوت سے دو ٹکڑے کر دیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ مداری کی جانب بڑھنے لگا مداری نے ریچھ کے تیور بھانپ لئے تھے۔ وہ خوف سے کانپنے لگا۔ اب مداری نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کچھ معاملہ سمجھ گیا تھا کہ ریچھ کا مجھ سے یارانہ قائم ہو چکا ہے لیکن یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یہ دوستی کس بنا پر قائم ہوئی ہے۔ مداری شہد والی کہانی سے ناواقف تھا۔ مداری بے چارے نے تو زندگی بھر بھی ریچھ کو شہد نہیں کھلایا تھا۔ اتنی اس کی اوقات ہی نہ تھی۔ یہاں

شہد کی ندیاں بہہ گئی تھیں جو زیادہ تر ریچھ کی اپنی محنت تھی اس نے مار کھا کھا کر شہد کھایا اور جو کسر رہ گئی تھی وہ اس نے میری ٹنڈ تڑوا کر پوری کر ڈالی۔

"خدارا! مجھے اس ظالم درندے سے بچا لو"۔ مداری نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "یہ میری ہڈیاں توڑ ڈالے گا۔ میں اس کو لاٹھی کیا مار بیٹھا کہ اس نے برسوں کی وفاداری بھلا ڈالی"۔

ادھر ریچھ اس پر حملہ آور ہونے کے لئے دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر اپنے آپ کو تول رہا تھا۔ ادھر مداری میرے قدموں میں بیٹھا میری منتیں کر رہا تھا کہ میں اسے اس موذی جانور اور درندے سے بچا لوں۔ لاٹھی ٹوٹ جانے سے مداری نہتا ہو چکا تھا۔ ریچھ غصہ سے پھنکار رہا تھا اور منہ سے عجیب طرح کی آوازیں نکال رہا تھا۔ جو میری سمجھ سے بالا تھیں لیکن مداری انہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔

میں اپنے قدموں پر اٹھا اور ریچھ تک گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ریچھ کے منہ پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ میرے ہاتھ پھیرنے پر ریچھ نے اپنا سر گرا دیا اور وہ آہستہ آہستہ میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اسے مداری کے حوالے کرنا چاہا لیکن وہ پھر بپھر گیا اور اس پر پھر وہی پہلے والی کیفیت طاری ہو گئی۔

"بھائی مداری یہ ریچھ تیرے پاس رہنا نہیں چاہتا"۔ میں نے اس سے کہا۔

"آپ کوشش کریں مہاراج!" مداری نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میری اور میرے بچوں کی روزی روٹی کا ٹھیکرا ہے۔ یہ ریچھ آپ کی بات مانتا ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے آپ اسے میرے ساتھ بھیج دیں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی اس پر لاٹھی نہیں برساؤں گا"۔

"لیکن یہ تمہارے پاس جائے تب ناں!"

"اس سالے کا باپ بھی جائے گا۔ میں اس کی......" یہ کہتے کہتے مداری رک گیا۔ "نہ مہاراج! میں وعدہ کر چکا ہوں کہ میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ آپ ایک دفعہ اس کو میرے ساتھ بھیج تو دیں"۔

میں نے بہتیری کوشش کر ڈالی لیکن ریچھ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ مداری کے ساتھ واپس جانے کے لئے بالکل بھی تیار نہ ہوا۔ مداری بہت ڈھیٹ ہڈی کا بنا ہوا تھا۔ وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔

"سرکار! میں اس دن سے اس جنگل کی خاک چھان رہا ہوں جس دن سے یہ میرے ہاتھ سے رسی توڑ کر بھاگا تھا"۔ مداری نے روتی آواز میں کہا۔ "اب مجھے ملا تو میں خالی ہاتھ کیسے جاؤں۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ آپ اسے میرے ساتھ کر دیں مہاراج!"

مداری کو مجھ سے کام تھا اور وہ بچھا جاتا تھا۔

"مہاراج! آپ راجہ ہیں، ہم پرجا، آپ ہم پہ دیا کیجئے۔ مجھے میرا ریچھ واپس کر دیجئے"۔

"تو کیا میں نے اسے روکا ہوا ہے، تمہارے پاس جانے سے؟"

"نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں لیکن یہ آپ کے ساتھ اس قدر مانوس ہو چکا ہے کہ آپ اسے جو کہیں گے وہ مانے گا"۔

"عام حالت میں تو یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا"۔ میں نے اس کو سمجھایا۔ "تم مداری ہو جنتر منتر جانتے ہو، کوئی ایسا منتر پڑھو کہ یہ رام ہو جائے اور تمہارے ساتھ چلا جائے"۔

"نہیں بابو جی! ایسا کوئی منتر میرے علم میں نہیں جو اسے رام کر سکے"۔ مداری ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ایک ترکیب ہے اگر آپ بھی اس پر دو تین لاٹھیاں برسائیں تو ممکن ہے یہ بھاگ کر میرے پاس آ جائے"۔

"یہ ناممکن ہے، مجھ سے نہیں ہو سکے گا"۔ میں نے

کہا۔ ''یہ مجھ سے پیار کرنے لگا ہے اور میں اس پر لاٹھیاں برساؤں۔ پیار کا بدلہ تو پیار ہے لاٹھی نہیں''۔

''پھر تو یہ میرے ساتھ آنے سے رہا''۔ مداری مایوس سا ہو چلا۔ ''اصل میں تو میں خود بھی اس بلا سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ میں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ جس کا کام تھا اس کو ساجھے والی بات تھی۔ بھلا میں نے ریچھ کو پال کر کیا کرنا تھا؟ لیکن میرے ذہن میں اس کا کوئی حل نہیں آ رہا تھا۔ سوچ سوچ کر میری کنپٹیاں دکھنے لگیں۔ اس ادھیڑ بُن میں شام ہو چلی تھی اور موسم کے تیور بھی اچانک ناراض ہو جانے والے محبوب کی طرح بدلنے لگے۔

ریچھ مداری کا تھا اور مداری ریچھ کا۔ ریچھ کا اصل مقام تو مداری کا گھر تھا۔ جہاں اب تک وہ رہتا چلا آیا تھا۔ میرے ساتھ تو طویلے کی بلا بندر کے سر ہونے والی بات ہو رہی تھی۔

''مداری! تم کس شہر یا گاؤں کے رہنے والے ہو؟'' میں نے مداری سے پوچھا۔

''سرکار! ہم جیسے لوگوں کا کوئی شہر یا گھر نہیں ہوتا۔ آج یہاں کل وہاں ہم۔ نگری نگری بستی بستی پھرنے والے بنجارے لوگ ہیں''۔

''اس وقت تمہارا باقی قبیلہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟'' میں دریافت کیا۔

''اس سامنے والی پہاڑی کے پیچھے ایک گاؤں ہے ڈھولہ''۔ مداری نے کہا۔ ''وہاں ایک جوہڑ کے کنارے، جسے گاؤں والے بن کی منڈیر کہتے ہیں۔ وہاں کھلی جگہ پر ہمارے قبیلہ نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے''۔

''تو پھر آؤ دیکھتے کیا ہو؟'' میں نے کہا۔ ''ڈھولہ تو میرا ہی گاؤں ہے، میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔ محمد بوٹا میرا نام ہے اور میں گندھالہ کے اس جنگل سے شہد اتارا کرتا ہوں''۔

نوٹ: میں جب یہ سطور لکھ رہا ہوں تو میرے ایک عزیز نے مجھے ڈھولہ سے فون پہ بتایا کہ مرحوم محمد بوٹا جی کے خاندان کا ایک لڑکا آج کل گندھالہ کے اس جنگل سے شہد اتارا کرتا ہے آج علی الصبح جب وہ گندھالہ جا رہا تھا تو اس کے ہاتھ میں نٹڈ کی جگہ خالی بوتل تھی اور شام کو جب اس کی واپسی پر اس سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس سے پوچھا کہ کیا کوئی شہد وغیرہ ملا تو اس نے بتایا کہ ہاں گزارا ہو گیا ہے۔ میرے عزیز نے جب ایک بوتل گندھالہ کے جنگل کے خالص شہد کی اس سے قیمت پوچھی تو اس نے کہا کہ تین نوٹ۔ میں بوٹا کے زمانہ کا بھاؤ سمجھ بیٹھا میں نے پوچھا کیا اس کا مطلب تین سو روپیہ ہے تھا۔ کہا نہیں وہ تین ہزار روپیہ کہہ رہا تھا۔ بوٹا کے شہد اتارنے کا زمانہ تو گیا، موجودہ وقت کی بات کریں''۔

میں اور مداری ساتھ ساتھ گاؤں کی جانب چل دیئے۔ ریچھ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ میں نے جو گھوم کر دیکھا تو ریچھ ہمارے نہیں بلکہ صرف میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ مجال ہے کہ وہ مداری کے قدم پر قدم رکھ رہا ہو بلکہ میرے قدم ماپتا ہوا چلا آ رہا تھا اور میں اس سوچ میں غرق تھا کہ گھر پہنچ کر میں اس ریچھ کا کیا کروں گا۔ مداری اس بات سے خوش نظر آتا تھا کہ اس کا کھویا ہوا ریچھ اسے واپس مل گیا ہے لیکن مجال ہے کہ ریچھ نے ایک نظر اٹھا کر مداری کی طرف دیکھا ہو۔۔۔

مطلع ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی ساون کے دن تھے اور کچھ ہی دیر میں باقاعدہ بارش نے ہمیں آ لیا۔ رات سے پہلے ہی یہ رات اتر آئی۔ ہم نے راستہ میں پڑنے والے لعل سائیں کے کنوئیں کا رخ کر لیا تاکہ وہاں پر بارش گزاری جائے۔ اس کنوئیں پر دو کمرے تھے۔ ہم جلدی جلدی جا کر ایک کمرے کا دروازہ دھکیل کر بمع ریچھ اندر گھس گئے۔ اندر دیا جل رہا تھا اور وہاں کے مکین اکٹھے بیٹھ کر رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ کمرہ نیم روشن تھا کچھ ہی دیر میں کمرے کے مکینوں کے چہرے

واضح ہونے لگے انہوں نے ہمیں اور ہم نے انہیں دیکھا۔ ہمارے ساتھ ساتھ ریچھ بھی اندر آ گیا۔ آناً فاناً ریچھ نے دو ایک قلانچیں بھریں اور جا کر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک آدمی کے ساتھ لپٹ گیا۔

''واہ رے میرے مولا..... میرا بخوں مجھے مل گیا۔''

اس آدمی نے جیسے نعرہ لگایا ہو۔ اور وہ ریچھ کا منہ چومنے لگا۔ ادھر ریچھ بھی والہانہ انداز سے اس معمر سے آدمی کی بلائیں لیتا نظر آیا۔

میرے ساتھ آئے مداری نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ بیٹھے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا کمرے سے باہر کی طرف بھاگا۔ مجھے اس پر کچھ شک ہو گیا۔ اس لئے میں بھی فوراً اس کی طرف لپکا اور برستی بارش میں اس کے پیچھے باہر نکل آیا اور تھوڑی دیر میں اسے جالیا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اسے زور کا دھکا دیا، وہ منہ کے بل گرا۔ وہ میری منتیں کرنے لگا کہنے لگا مجھے جانے دو۔

''سچ سچ بتاؤ اصل معاملہ کیا ہے؟'' میں نے اس سے کہا۔''بھاگے کیوں تھے؟''

''میں آپ کو سچ سچ بتاتا ہوں''۔ اس نے کہا۔''یہ ریچھ میرا نہیں ہے بلکہ یہ اس دوسرے مداری کا ہے جو میرا استاد بھی رہا ہے۔ میں نے یہ ریچھ جسے اس کا مالک بخوں کہہ کر بلاتا تھا، اس کے گھر سے چوری کر لیا اور اسے لے کر گندھالہ کے جنگل سے گزر رہا تھا کہ یہ مجھ پہچان گیا اور اس نے میرے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اس پر لاٹھی برسائی۔ اس نے ناک میں پڑی رسی جو کہ ناک کے قریب سے ذرا زیادہ کسی ہوئی تھی توڑ کر بھاگتا ہوا گندھالہ کے جنگل میں گم ہو گیا۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا حتیٰ کہ یہ آپ کے پاس جا کر مجھے ملا۔ اب اللہ کا کرنا کہ یہ اپنے اصل مالک تک خود پہنچ گیا۔ خدا کے لئے مجھے مالک کے حوالے نہ کیجئے وہ مجھے مار دے گا۔ مجھے جانے دیجئے''۔

''میں ایسے کیسے تمہیں جانے دوں؟'' میں نے کہا۔''اگر تم چلے گئے تو پیچھے میں اور ریچھ کا مالک رہ جائیں گے۔ یہ تو حیوان ہے لیکن مالک مجھ پر شک کرے گا کہ ریچھ میں نے چرایا تھا۔ ایک بار تو تجھے ضرور مالک کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ بہرحال تمہارے سچ بولنے کی وجہ سے میں تمہارے مالک کے سامنے سفارش کروں گا کہ وہ تجھے جانے دے اور معاف کر دے''۔

بہرحال میں اسے پکڑ کر اندر لے گیا۔ ہم بارش میں نہا گئے تھے۔ کپڑے کیا ہمارے جوتوں میں سے بھی پانی نکل رہا تھا۔ اندر پہنچے تو مالک نے مداری کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔

''دینو! تم اپنی اوچھی حرکتوں سے ابھی تک باز نہیں آئے''۔ اس نے کہا۔''اب ہم تجھے اپنے قبیلے کے جرگہ کے فیصلے کے مطابق سزا دیں گے''۔ مداری گڑگڑایا۔

''مالک! رحم کریں۔ میں مارا جاؤں گا۔ مجھے معاف کر دیں''۔

بہرحال میں نے بھی حسب وعدہ اس کی معافی کی اس کے استاد کے سامنے پرزور سفارش کی جو کہ اس نے قبول کر لی اور دینو مداری کو جانے کے لئے راستہ دے دیا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے دیکھا مالک کا چہیتا ''بخوں'' اس کی گود میں سر رکھ کر اس کے ہاتھ چاٹ رہا تھا''۔

◆✱◆

تصحیح

شمارہ جون کہانی ''اتنی سی بات'' کے صفحہ 102 کے پہلے کالم میں گاؤں کا نام ''دلومہ'' لکھا گیا ہے جو دراصل ''دلونہ'' ہے۔ براہ کرم درستگی فرمالیں۔

(ادارہ)

0336-5938583

ملک یمن کا حاکم تبع حمیری اپنی بھرپور عسکری قوت کے بل بوتے پر کئی ملکوں کو فتح کر چکا تو مشیروں نے اسے خانہ کعبہ کا حال بتایا کہ وہاں دور دور سے لوگ آتے ہیں، کعبہ کا طواف کرتے ہیں، قربانیاں کرتے ہیں اور وہاں بڑا زر و جواہر کا چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے لہٰذا اس پر حملہ کیا جائے اور وہاں کے لوگوں کو محکوم بنایا جائے اور دولت بھی سمیٹی جائے۔ حاکم یمن کو مشورہ بہت پسند آیا اور حکم دیا کہ فوج تیار کی جائے چنانچہ ایک بہت بڑا لشکر جس میں ہاتھی، اونٹ اور گھوڑے شامل تھے تیار کیا گیا۔ اس کے لشکر کے ساتھ چار سو علماء اور چار سو طبیب بھی تیار کیے گئے۔ یہ واقعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے کا ہے۔

لشکر بڑی آب و تاب کے ساتھ حاکم یمن تبع حمیری کی سربراہی میں ملک کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہو گیا۔ حاکم کا خیال تھا کہ مکہ کے لوگ میرا دبدبہ اور جاہ و جلال دیکھ کر مکہ سے باہر آئیں گے اور میرا بھرپور استقبال کریں گے لیکن مکہ شہر کا ایک فرد بھی باہر نہ آیا۔ اس وقت بھی نسل جناب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد امجد ہی خانہ کعبہ کے متولی تھے گو کہ کفر و شرک کا زور تھا بت پرستی عروج پر تھی لیکن آل ابراہیمؑ کا احترام لوگوں کے دلوں میں موجود تھا اور لوگ اُن کی باتوں کو تسلیم کرتے تھے اور ان کے فیصلوں کو حتمی سمجھا جاتا تھا۔ ان سرداروں کے کہنے پر کوئی بندہ استقبال کے لئے باہر نہ گیا۔

جب حاکم یمن کو اطلاع ملی کہ کوئی ایک آدمی بھی اس کے استقبال کے لئے نہیں آیا تو اس نے اپنے مشیروں کو طلب کیا اور مکہ کے لوگوں کا تعظیم و تکریم کے لئے مکہ سے باہر نہ آنے کا سبب پوچھا تو ایک مشیر نے کہا بادشاہ سلامت مکہ میں پتھروں کا گھر ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے تعمیر کیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا گھر ہے۔ یہ لوگ اس گھر کی بہت زیادہ عزت و تکریم کرتے ہیں اور اس بارے میں مکمل تفصیلات تو ہمارے ساتھ آئے ہوئے علماء ہی بیان کر سکتے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو ان چار سو علماء میں سے جو ان کا سربراہ ہے اس کو بلا کر تمام تفصیل پوچھ لیتے ہیں۔

حاکم یمن نے یہ بات سنی تو غصہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا کسی عالم وغیرہ کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے لشکر کو تیاری کا حکم دو میں یہ پتھروں کا بنا ہوا گھر گرا دوں گا، مردوں کو قتل کروں گا اور عورتوں کو قیدی بناؤں گا تاکہ یہاں دودھ پیتا ہوا بچہ بھی زندہ نہ رہے گا۔ یہ کہہ کر غصے سے پھنکارتا ہوا مسند پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کی نکسیر پھوٹ پڑی، ناک کے نتھنوں پر ہاتھ رکھا تو منہ سے بھی خون آنا شروع ہو گیا۔ وزیر دوڑتا ہوا باہر گیا اور شاہی طبیب کو ساتھ لئے اندر خیمے میں داخل ہوا۔ طبیب نے حاکم کی نبض پر ہاتھ رکھا اپنی سمجھ کے مطابق مرض کی تشخیص کی اور دوا تجویز کی اور حاکم کے منہ میں ڈالی۔ دوائی کا حلق میں جانا تھا کہ حاکم کی حالت مزید خراب ہو گئی۔ اس کے منہ، ناک، کان، آنکھوں، پیشاب اور پاخانہ کی جگہ سے بھی خون جاری ہو گیا۔ وزیر بھی پریشان ہو گیا اور طبیب بھی۔ چنانچہ وزیر نے تمام طبیبوں کو جمع کیا اور کہا کہ مرض کی صحیح تشخیص کر کے ایسی دوا تجویز کی جائے جو فوری اثر کرے اور اس بات کو صیغہ راز میں رکھنا ہے۔ ورنہ فوج کا مورال گر جائے گا اور بادشاہ سلامت کے بارے میں مختلف چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی۔

چنانچہ حکماء کا پندرہ رکنی بورڈ بیٹھا اور انہوں نے حاکم کو چیک کرنے کے بعد دوائیں تجویز کیں اور کھلائی گئیں اس کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ چند گھنٹوں میں حاکم کی طبیعت غیر ہو

چکی تھی۔ حکماء مایوس ہو چکے تھے سب سے بڑے حکیم نے وزیر کو مشورہ دیا کہ علماء سے مشورہ لے لیا جائے تو بہتر ہوگا کیونکہ یہ کام ہمارے بس کا نہیں رہا۔ چنانچہ وزیر نے سب سے بڑے عالم کو طلب کیا اور تمام تفصیل سے آگاہ کیا اور اس کو اپنے ساتھ بادشاہ کے خیمے میں لے گیا۔ عالم نے جب بادشاہ کی حالت دیکھی تو پاس بیٹھ گیا کچھ دیر بادشاہ کے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔

"مرض آسمانی ہے اور علاج زمینی ہو رہا ہے"۔ اس نے وزیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر بادشاہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "عالی جاہ! اگر اجازت ہو تو چند گزارشات آپ کے گوش گزار کرنے کی جسارت کروں؟" بادشاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"عالی جاہ! یہ ایک مقدس سرزمین ہے"۔ عالم بادشاہ کی اجازت سے گویا ہوا۔ "اس میں جو پتھروں کا گھر بنا ہوا ہے یہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر بنایا ہے۔ یہاں کے لوگ اس کی بے حد عزت و تعظیم کرتے ہیں۔ یہ اللہ کا گھر ہے۔ عالی جاہ! ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ اس سرزمین پر ایک نبی کا ظہور ہوگا یہی وہ کھجوروں والی سرزمین ہے اور وہ آنے والا نبی انتہائی مہربان اور شفیق ہوگا۔ وہ لوگوں کو نیکی اور محبت کا پیغام دینے والا ہوگا پھر کچھ عرصہ بعد وہ نبی یثرب کی طرف ہجرت کرے گا۔ عالی جاہ! مجھے یقین ہے کہ آپ سے اس سرزمین اور لوگوں کے بارے میں ضرور کوئی گستاخی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے آپ کی جان پر یہ عذاب آیا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور ناپاک ارادہ جو بھی کیا ہے ترک کر دیں"۔

حاکم یمن کو فوراً اپنے ناپاک ارادے کا خیال آیا۔ وزراء، علماء اور حکماء کو حکم دیا کہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دیا جائے، جب میں بلاؤں تو اندر آنا۔ تمام افراد باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی حاکم یمن فوراً سجدے میں گر گیا اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں توبہ کی اپنے ارادے کو ترک کیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی۔

"اے پروردگار! تجھے اس گھر کا واسطہ اس کے تعمیر کرنے والے باپ بیٹے کا واسطہ اور ان کی نسل پاک سے آنے والے آخری نبیؐ کے واسطہ سے میرے اس گناہ کو بخش دے"۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سجدے سے سر اٹھایا تو اس کا مرض ٹھیک ہو چکا تھا۔ وزراء کو اندر بلوایا اور وزیر خاص کو حکم دیا کہ مکہ کے اندر جاؤ اور متولی کعبہ سے گزارش کرو کہ بندہ حقیر پر تقصیر خانہ کعبہ کی زیارت اور آپ سے ملاقات کا مشتاق ہے، اگر وہ بخوشی اجازت دے دیں تو مجھے اطلاع کرنا ورنہ ان سے کوئی تعرض نہ کرنا۔

وزیر خاص کی سربراہی میں چند وزراء مکہ شہر میں داخل ہوئے اور متولی کعبہ سے ملاقات کی اور حاکم یمن کی معروضات اُن تک پہنچائیں۔

"اگر حاکم یمن اچھی نیت سے آ رہا ہے تو ہم اُسے خوش آمدید کہیں گے"۔ متولی کعبہ نے کہا۔ "اگر اس کی نیت بُری ہے تو ہم یہ معاملہ اس ذات کے حوالے کرتے ہیں جو نیتوں اور دلوں کا بھید جاننے والا ہے"۔

پھر آنے والے وفد کو مشروبات اور کھجوریں پیش کیں، تناول کرنے کے بعد وہاں سے وزراء کا وفد حاکم کے پاس آیا اور واپسی جواب سے اُسے مطلع کیا۔ حاکم یمن اپنے چند وزراء کے ہمراہ داخل مکہ ہوا۔ خانہ کعبہ کے پاس گیا خدا کے حضور سر بسجود ہو گیا۔ کعبہ کی تعظیم و تکریم بجا لایا اور متولی کعبہ سے ملاقات کی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

"کل کے دن مکہ کے تمام افراد کو میری طرف سے کھانے کی دعوت ہے"۔ حاکم یمن نے کہا۔ "آپ یہ منادی کرا دیں اور شہر بھر کے جتنے جوان بے روزگار ہیں ان کو کاروبار کے لئے میری طرف سے مالی معاونت کی

پیشکش فرمائیں اور میری طرف سے منادی کرائیں کہ
آئندہ کوئی بندہ قربانی کرنے کے بعد جانوروں کا خون
کعبہ کی دیواروں کے ساتھ نہ ملے اور مجھے یہ اجازت بھی
مرحمت فرمائیں کہ میں ایک غلاف تیار کروالوں جو خانہ
کعبہ پر چڑھا دیا جائے"۔

(نوٹ:۔ اس زمانے میں لوگ قربانی کر کے
جانوروں کا خون کعبۃ اللہ کی دیواروں پر مل دیتے تھے۔
کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے خانہ کعبہ پر غلاف نہیں تھا۔)

متولی کعبہ اور معززین مکہ تبع حمیری کی یہ باتیں اور
پیشکش سن کر حیران رہ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے
لگے کہ کل تک تو یہ شخص نعوذ باللہ خانہ خدا کو گرانے اور
یہاں کے باشندوں کو نیست و نابود کرنے کا ارادہ رکھتا۔
یکا یک اس کو کیا ہو گیا ہے۔

"اے سرداران مکہ اور متولیان کعبہ!" سب کو
حیران دیکھ کر تبع حمیری خود ہی بول اٹھا۔" آپ حیران و
پریشان نہ ہوں میرا پہلا اقدام نا سمجھی کا نتیجہ تھا۔ جب
مجھے خانہ کعبہ کی حرمت و عزت اور آنے والے نبیؐ کے
بارے میں اپنی ہی کتابوں سے پتہ چلا ہے جس سے پہلے
میں لاعلم تھا تو مجھے اس گھر سے اس کے بنانے والوں سے
اس کے مالک سے اور جس نے اس مقدس زمین پر آنا
ہے اس سے قلبی محبت میرے اندر موج زن ہو گئی ہے۔
میں اپنے ناپاک ارادوں کو توڑ کر توبہ کر چکا ہوں۔ اب
آپ سے ملتمس ہوں کہ میری گذارشات کو مدنظر رکھتے
ہوئے مجھے عملی اقدامات کی اجازت دے دی جائے"۔

چنانچہ اس کو اجازت مل گئی۔ مقدم تواریخ کے
حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے دن ستر اونٹ ذبح
کیے گئے اور اہلیان مکہ کی ضیافت کی گئی۔ بیوہ عورتوں اور
غرباء میں نقد رقم اور تحائف تقسیم کیے گئے۔ جوانوں کو
مختلف کاموں کے لیے مالی معاونت کی گئی۔ خانہ کعبہ کی
دیواروں کو دھلوایا گیا اور منادی کرائی گئی کہ آئندہ
جانوروں کا خون کعبہ کی دیواروں پر نہ ملا جائے۔ خانہ
کعبہ کے سائز کا ایک غلاف تیار کروایا گیا اور خانہ کعبہ پر
چڑھا دیا گیا۔

تاریخی حوالوں سے یہی ثابت ہے کہ خانہ خدا پر
پہلا غلاف تبع حمیری نے چڑھایا تھا۔ ان تمام امور سے
فارغ ہو جانے کے بعد بادشاہ نے حکم نامہ جاری کیا کہ
پرسوں لشکر واپس ہو گا، واپسی کی تیاری شروع کر دی
جائے۔ لشکر کی تیاری کا سن کر چند علماء نے بادشاہ سے
شرف باریابی کی درخواست پیش کی، بادشاہ نے علماء کو بلوا
لیا۔ ان میں سے سب سے بڑے عالم نے بادشاہ سے
اپنی گزارشات پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ بادشاہ
نے خوشی سے اجازت دے دی۔

"بادشاہ سلامت! ہم آپ کے لشکر کے ساتھ
واپس یمن نہیں جانا چاہتے"۔ علماء کے سربراہ نے مؤدبانہ
گزارش کرتے ہوئے کہا۔" ہمیں اجازت دیں ہم چند
افراد یثرب جانے کے خواہش مند ہیں۔ عالی جاہ!
جیسا کہ پہلے ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ آخری نبی کا ظہور
اسی سرزمین پر ہو گا اور پھر وہ یثرب کی طرف ہجرت
فرمائے گا، اس کا نام احمد ہو گا۔ ہماری کتابوں توریت،
زبور اور انجیل میں بڑی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ ہم
چاہتے ہیں اس کا ظہور جو عنقریب ہونے والا ہے، ہو تو ہم
اس کی زیارت کریں اور اس پر ایمان لائیں، اس کے
ساتھ مل کر جہاد کریں تو پھر دنیا میں ہزار بادشاہوں کی
نیابت میں رہنے سے لمحہ بھر کی اُن کی قربت دنیا اور
آخرت کے لئے بہتر ہے۔ ہم اُس کے ظہور کا انتظار
کریں گے اور اگر ہم اس کی زیارت سے شرف یاب نہ
ہو سکے تو ہماری اولادوں میں سے کوئی نہ کوئی تو ہو گا جو
ہماری بخشش کا ذریعہ بن جائے گا۔ عالی جاہ! اگر اور کچھ
بھی نہ ہوا تو ہو سکتا ہے اس نبی کا گزر ہماری قبروں کے
پاس سے ہو اور اس کا پاک نعلین مبارک کا تلوا ہماری قبری

مٹی کو چھو جائے تو ہماری شفاعت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہو سکتی ہے"۔ بادشاہ یہ سن رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بھی لگی ہوئی تھی۔

بادشاہ نے علماء پر حسرت بھری نگاہ دوڑائی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ٹھیک آپ کو اجازت ہے، آپ یثرب چلے جائیں۔ میں ابھی تجربہ کار افراد کا ایک جتھہ روانہ کر رہا ہوں جو زمین خرید کر وہاں آپ کے لئے مکان تعمیر کرے گا اور آپ کے خورد ونوش کا اہتمام کرے گا۔ آپ یثرب جانے کی تیاری کریں"۔ پھر سب سے بڑے عالم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جب یثرب کو جانے لگو تو میرے پاس آنا ایک امانت آپ کے حوالے کروں گا"۔

علماء کے لئے مکانوں کی تعمیر کے لئے ایک وزیر کی سرپرستی میں مزدوروں اور کاریگروں کو یثرب روانہ کر دیا گیا۔ دوسرے دن علماء نے بھی رخت سفر باندھ کر یثرب روانہ ہونے کی تیاری کی تو بڑے عالم نے دیگر علماء سے کہا تھوڑا انتظار کریں میں بادشاہ سلامت سے مل کر آتا ہوں۔ بڑا عالم جب بادشاہ کے سامنے پہنچا تو بادشاہ نے خیمے میں موجود وزراء کو باہر نکال دیا۔ بادشاہ نے ایک چھوٹی سی ڈبیہ اپنی جیب سے نکالی اور عالم کے حوالے کر دی۔

"اس میں ایک خط میرے آقا و مولا آخری نبیؐ کے نام ہے"۔ تبع حمیری نے کہا۔ "یہ خط تمہارے پاس ایک امانت ہے۔ اپنی جان و مال سے بڑھ کر اس کی حفاظت کرنا اگر تمہاری زندگی میں حضور نبی اکرمؐ یثرب تشریف لائے تو یہ خط اُن تک پہنچانا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو اپنی اولاد کو وصیت کرنا کہ نسل در نسل یہ خط آخری نبیؐ کی خدمت میں پہنچ جائے"۔

عالم نے خط والی ڈبیہ لی اس کو چوم کر اپنی جیب میں ڈال کر بادشاہ سے اجازت لی اور عازم سفر یثرب ہوئے۔ حضور نبی کریمؐ کی خدمت اقدس میں تبع حمیری کے خط کا متن کچھ یوں تھا۔

"بندہ حقیر پر تقصیر تبع حمیری کی طرف سے
سلام اُس نبی پر جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔

اے میرے آقا! میں اللہ تعالیٰ اور آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ آپ کی شریعت میں تمام حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام جانتا ہوں۔ اگر میری زندگی میں مجھے شرف باریابی نصیب ہو گیا تو گویا میں نے دنیا بھر کی نعمتیں پالیں اور اگر شرف ملاقات نہ ہو سکا قیامت کے دن میری شفاعت ضرور فرمانا"۔

عالم نے بادشاہ سے مصافحہ کیا اور دیگر علماء جن کی تعداد دس، چودہ یا بیس تک ملتی ہے یثرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کو سرکاری سواریاں مہیا کی گئیں اور بادشاہ نے لشکر کو واپس یمن چلنے کا حکم دیا اور لشکر یمن واپس چلا گیا۔

وقت گزرتا گیا، بادشاہتیں تبدیل ہوتی رہیں اور پھر وہ بابرکت گھڑی بھی آن پہنچی جس کا ذکر گزشتہ الہامی کتب میں کیا جاتا رہا اور انبیائے کرام اس ہستی کی آمد کی خبریں وقتاً فوقتاً دیتے چلے آ رہے تھے چنانچہ رحمت للعالمینؐ دنیا میں تشریف لائے۔ مکہ مکرمہ میں آئے روز ہر قسم کی تکالیف برداشت کیں اور پھر مدینے کی طرف ہجرت فرمائی اور قباء کے مقام پر قیام فرمایا۔ یثرب میں آمد کی مسلسل خبریں آ رہی تھیں۔ آپ کے استقبال کے لئے مرد و خواتین اور بچے بھی بے قرار تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو بھی خبر مل چکی تھی، انہوں نے ایک صندوق کھولا اس میں سے ایک ریشمی تھیلی نکالی۔ تھیلی کا منہ کھولا اور اس میں سے ایک ڈبیہ نکالی اس کو چوما اور اپنے غلام عبداللہ بن ہلال لیلیٰ کو آواز دی اور فرمایا کہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آنے والے میرے سردار آقا و مولا محمد مصطفیٰؐ مقام قبا پر تشریف فرما ہیں، تم جاؤ ان کی

خدمت میں حاضر ہو کر میرا سلام عرض کرنا اور یہ امانت آپ کو دے دینا۔

عبداللہ نے ڈبیہ لی اور قباء کی طرف چل پڑے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حضور نبی کریمؐ اپنے صحابہ کرامؓ کے جھرمٹ کے درمیان میں تشریف فرما ہیں۔ جب عبداللہ قریب پہنچے سلام عرض کیا حضور نبی کریمؐ نے سلام کا جواب دیا اور ساتھ ہی مسکرا کر فرمایا جو امانت تمہارے پاس ہے ہمیں دے دیجئے۔ عبداللہ نے ہاتھ بڑھایا اور ڈبیہ حضور نبی کریمؐ کے حوالے کر دی۔ آپؐ نے اپنے دست مبارک سے ڈبیہ کو کھولا خط نکالا اس کو چوما اور تین بار فرمایا۔ ''مرحبا میرے بھائی...... مرحبا میرے بھائی...... مرحبا میرے بھائی! اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر عطا فرمائے اور تیرا حشر نیک و پاک لوگوں کے ساتھ ہو''۔

سبحان اللہ جس کے لئے محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سلامتی کی دعا فرما دیں اس کے مقدر کا کیا کہنا۔ روایات میں ملتا ہے تبع حمیری کو برا نہ کہا جائے وہ نیک لوگوں میں شامل ہے۔

قباء میں قیام کے بعد حضور نبی کریمؐ نے یثرب کی طرف جانے کی تیاری کی۔ یثرب شہر کے بچے، جوان، بوڑھے اور عورتیں گھروں سے نکل آئے۔ جب پیغمبر آخرالزماں کا قافلہ یثرب میں داخل ہوا تو پورا یثرب ہی استقبال کے لئے اُمڈ آیا تھا ہر طرف تکبیر کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ اس یثرب کے لوگوں کی خوشی قابل دید تھی۔ عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے ایک دوسرے کو مبارک دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے ''رسول آ گئے ..... رسولؐ آ گئے''۔ جس دن آپ داخل مدینہ ہوئے جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ آپ جدھر سے گزرتے لوگ جس ناقہ پر آپ سوار تھے اس کی رسی پکڑتے اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہؐ یہاں قیام فرمایئے۔

مجسم خلق عظیم کو کسی کی بھی دل شکنی گوارا نہ تھی، ہر ایک کو دعا خیر دیتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ چھوڑ دو، اس کی رسی کو جہاں قدرت کی جانب سے حکم ہو گا یہ مجھے پہنچا دے گا۔ یہ سن کر ہر کوئی خاموش ہو جاتا اور ناقہ آگے بڑھ جاتا۔ اثنائے راہ جب زوال آفتاب کا وقت آیا آپ اس وقت قبیلہ بنی سالم کے درمیان پہنچ چکے تھے، دوسرے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی حضرتؐ کو قیام کی پیشکش کی لیکن آپؐ خاموش رہے مگر آپ کا ناقہ مسجد کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ مسجد حضور نبی کریمؐ کے تشریف لانے سے پہلے تعمیر ہو چکی تھی جب کہ مؤرخ طبری کہتے ہیں کہ مسجد پہلے موجود نہ تھی بعد میں اسی جگہ تعمیر کی گئی۔ مستشرقے کے حید لکھتے ہیں کہ بارہ ربیع الاول کم ہجری کو حضور نبی کریمؐ نے ایک سو مسلمانوں کے ساتھ جمعہ کی نماز اسی جگہ ادا فرمائی۔

نماز جمعہ کے بعد حضرتؐ ناقہ پر سوار ہوئے اور پھر لوگوں کی طرف سے جب قیام کرنے پر اصرار ہوا تو آپ نے فرمایا کہ یہ اس ناقہ پر چھوڑ دو یہ جہاں جا کے رکے گا وہیں میرا قیام ہو گا اور میں ناقہ سے اتر پڑوں گا۔ ناقہ چلتا رہا۔ دائیں بائیں لوگوں کا جم غفیر تھا۔ فضا نعرہ تکبیر کی صداؤں سے معطر تھی کہ ایک جگہ ناقہ اک دم بیٹھ گیا۔ حضور نبی کریمؐ ناقہ سے اتر آئے۔ خوش نصیبی سے یہ جگہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر کے ساتھ اور دروازے کے سامنے تھی۔ حضرت ابو ایوب انصاری خوش خوش آئے اور آپ کا سامان اٹھا کر اپنے مکان کے اندر لے گئے۔ اُن کی والدہ بھی سامان اٹھانے میں ان کی مدد کر رہی تھیں۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اس عالم کی اٹھارویں پشت سے تھے جسے تبع حمیری نے خط بطور امانت حضور اکرمؐ تک پہنچانے کے لئے دیا تھا۔

ہر کسی کی خواہش تھی کہ حضورؐ میرے ہاں قیام فرمائیں تو جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو آپ نے بطور

ضرب المثل یہ جملہ فرمایا۔ "جہاں آدمی کا سامان وہیں آدمی"۔ (طبقات ابن سعد جلد 1)

حاکم یمن تبع حمیری کے بعد اسی خاندان کے بادشاہوں کے کئی دور گزر گئے یہاں تک کہ کچھ انقلاب کے بعد ذونواس نامی شخص نے یمن پر قبضہ کرلیا اس طرح حمیری خاندان کی حکومت ختم ہوگئی۔ اس نے اہل یمن کو یہودی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ جب لوگوں نے انکار کیا تو اس نے قتل عام کروایا۔ ابونواس کے خلاف قیصر روم سے امداد طلب کی گئی۔ عیسائیت کی حمایت کے لئے نجاشی بادشاہ نے ستر ہزار کا لشکر ارباط کی قیادت میں یمن روانہ کیا۔ اس لشکر کا سردار ابرہہ اشرم تھا۔ لشکر نے ابو نواس کو شکست دی وہ قتل ہوگیا لیکن ارباط اور ابرہہ میں جنگ ہوگئی۔ ارباط قتل ہوگیا اور ابرہہ یمن کا حاکم بن گیا۔

ابرہہ نے صنعا میں ایک گرجا تعمیر کرایا اس کا خیال تھا کہ دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہوگی اور لوگ دور دور سے یہاں آئیں گے۔ اس کا منصوبہ تھا کہ تمام عرب کو اس کا مرکز قرار دوں گا لیکن خانہ کعبہ جس کی مرکزیت صدیوں سے قائم تھی اس کے مقصد میں سد راہ تھی۔ چنانچہ اس نے ایک بہت بڑی فوج تیار کی اور حکم دیا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کرنا ہے۔ فوج یمن سے نکل پڑی۔ فوج میں دیگر سامان حرب کے ہاتھی بھی تھے۔ اس خبر سے عرب میں تہلکہ پڑ گیا راستے میں کچھ قبائل نے راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن ہر کسی کو شکست کھانا پڑی اور وہ لشکر سمیت مکہ مکرمہ کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ مکہ معظمہ میں کوئی فوجی طاقت نہ تھی۔ مکہ مکرمہ کے لوگ مضطرب اور انتہائی پریشان تھے مگر متولی کعبہ حضرت عبدالمطلب انتہائی مطمئن نظر آرہے تھے۔ ابرہہ نے پیغام بھیجا کہ ہمیں لوگوں سے کوئی سروکار نہیں ہم تو صرف اس پتھروں کے گھر کو منہدم کرنے آئے ہیں۔ اسی دوران اس کے فوجیوں نے حضرت عبدالمطلب کے اونٹوں پر قبضہ کرلیا جو باہر چر رہے تھے۔ حضرت عبدالمطلب وہاں پہنچے اور اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تو ابرہہ نے کہا۔ تعجب ہے آپ اپنے مویشیوں کے لئے تو فکر مند ہیں لیکن اس خانہ مقدس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے جس سے آپ کی قومی عزت وابستہ ہے۔ ابن ہشام اپنی تاریخ کے صفحہ 31-32 جلد 1 پر حضرت عبدالمطلب کے اعتماد بھرے تاریخی الفاظ کو یوں تحریر کرتے ہیں۔

"ان اونٹوں کا مالک تو میں ہوں، اس لئے ان کے بارے میں کہا ہے اور جو اس گھر کا مالک ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت کرنا جانتا ہے"۔

حضرت عبدالمطلب کے الفاظ میں حقانیت کا وہ وزن ہے جس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ الفاظ کہنے کا حق صرف اسی کو ہے جو منشائے قدرت کو دل کی آنکھوں اور روحانیت کے دل آویز پردوں سے دیکھ رہا ہو۔ ابرہہ اپنے ارادے پر جما ہوا تھا۔

حضرت عبدالمطلب مکہ میں واپس آئے اور اہل مکہ کو کہا کہ وہ مکہ سے نکل جائیں اور پہاڑوں اور گھاٹیوں میں رہ کر آنے والے اچھے وقت کا انتظار کریں۔ خود حضرت چند مخصوص افراد کو لے کر خانہ کعبہ کے پاس گئے۔ دیوار پر ہاتھ رکھا اور مناجات کیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر کوئی اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے اب تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ یہ مناجات کر کے خاموش ہو گئے اور نتیجہ کا انتظار کرنے لگے اور پھر وہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو سورہ فیل کی صورت میں ناقابل انکار واقعہ بنادیا۔

ماخذ: تاریخ ابن ہشام، تاریخ طبری، تاریخ اسلام، طبقات ابن سعد وغیرہ)

◆◆◆

اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے آزمائش کی بھٹی میں ڈال دیتا ہے۔

گرہ

☆☆ فرزانہ نگہت

شہر کے مضافاتی علاقے میں واقع اس نئی کالونی میں اپنے نو تعمیر شدہ مکان میں منتقل ہونے کے بعد جب اس کی سجاوٹ اور آرائش سے فرصت ملی تو آس پڑوس کے لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کا خیال آیا اور یہ قدرتی بات تھی۔ اس نئی کالونی کے مکینوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ وہاں زیادہ تر مکانات زیر تعمیر تھے۔ جو بن چکے تھے وہ ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ ہمارے گھر سے جو قریب ترین گھر تھا وہ بھی وہاں سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر تھا۔ باقی اطراف میں ویران پلاٹوں کا سلسلہ تھا۔ وہ مکان خاصے بڑے رقبے کا تھا اور نہایت شاندار تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے اندر چاروں طرف ہرا بھرا لان تھا۔ چار دیواری کے ساتھ اونچے اونچے درختوں کی قطاریں لہرایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھار اس کا شاندار پھاٹک کھلتا تو اندر رنگا رنگ پھولوں کی کیاریاں، مرمریں قدمچے اور ستونوں والا برآمدہ اور شاندار پورٹیکو دکھائی دے جاتے۔ اس کی چار دیواری خاصی اونچی تھی جس پر بوگین ویلیا کی بیلیں لہرایا کرتی تھیں۔ اس کے پورٹیکو میں کبھی ایک کبھی دو چمچماتی کاریں کھڑی دکھائی دے جاتیں۔ اس گھر کے مکین بہت کم دکھائی دیتے۔ یہ نوجوان باریش لڑکے ہوتے تھے جو زیادہ تر شلوار قمیص میں ملبوس دکھائی دیتے تھے۔ یا برقعہ پوش خواتین جن کی صرف آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اکثر کار میں بیٹھی کہیں آتی جاتی دکھائی دیتیں۔ ایک گھنی داڑھی والے پاکیزہ رو، نمونہ شرافت مولانا ٹائپ صاحب سر پہ قراقلی اور سیاہ اچکن میں ملبوس ڈرائیور کے ساتھ کار میں بیٹھے صبح وشام ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا کرتے تھے۔ شاید وہ اس گھر کے سربراہ تھے۔

میرے شوہر نے ان کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ شہر کے بڑے مشہور تاجر تھے۔ جن کا کاروبار کئی شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ کاروباری حلقوں میں ان کی بڑی ساکھ تھی، وہ بڑے ایماندار، قابل اعتماد، متقی اور شریف انسان تھے۔

ایک دن مجھے گھر کے کاموں سے فرصت ملی تو میں ان لوگوں کے گھر جا پہنچی۔ میرے گھنٹی بجانے پر ایک ملازم نے پھاٹک کھولا اور میں اس کی راہنمائی میں چلتی ہوئی شاندار پورٹیکو اور مرمریں ٹائلیں لگے برآمدے سے گزر کر انتہائی قیمتی، لکڑی کے نفیس کام کئے دروازے سے گزر کر ایک روشن راہداری میں داخل ہو گئی۔ اس شاہانہ طرز سے آراستہ ڈرائنگ روم میں اس نے مجھے بٹھایا اور خود اہل خانہ کو خبر دینے چلا گیا۔ اس ڈرائنگ روم میں آرائش و زیبائش پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ میں دل ہی دل میں مرعوب سی ہو گئی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ دروازے کا پردہ ہٹا کر ادھیڑ عمری کو پہنچتی ہوئی ایک خوبصورت اور پُروقار خاتون اندر داخل ہو گئیں۔

"السلام علیکم!" وہ گرمجوش مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف چلی آئیں۔

میں صوفے سے اٹھ گئی، انہوں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"تشریف رکھئے۔"

صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے میں نے ان خاتون پر بھرپور نظر ڈالی۔ وہ بڑے عمدہ اور قیمتی لباس میں ملبوس تھیں۔ انہوں نے ہلکے پھلکے مگر قیمتی اور نفیس زیورات پہن رکھے تھے۔ ان کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز اور قدرتی چمک لئے ہوئے تھا۔ اس پر پاکیزگی تھی، تقدس تھا۔

تعارفی مرحلہ طے ہونے کے بعد ہمارے درمیان گھریلو مصروفیات کی اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس دوران ایک صاف ستھری ملازمہ چائے کے لوازم سے سجی ٹرالی ہمارے سامنے کھڑی کر کے چلی گئی۔

میری میزبان جنہوں نے اپنا نام رضیہ بتایا تھا، اپنی باتوں سے بے حد سلجھی ہوئی، شائستہ، تعلیم یافتہ اور مہذب

خاتون معلوم ہوتی تھیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ بی اے تک تعلیم یافتہ تھیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ ایک سکول میں پڑھایا بھی تھا۔ ان کے پانچ بچے تھے۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں، بڑے بیٹے کامرس کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد والد کے ساتھ شریک کاروبار تھے جبکہ چھوٹا بیٹا اور بیٹیاں ابھی کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ ان کے گھر کا ماحول مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ سب صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند اور دینی تعلیمات پر سختی سے کاربند تھے۔

ہماری باتیں جاری تھیں کہ دروازے کا پردہ ہٹا کر ایک قدرے فربہ اندام لیکن بے حد حسین، پُر وقار ادھیڑ عمر خاتون اندر چلی آئیں۔ انہوں نے کھلا برقع پہن رکھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مسکراتی ہوئی میری طرف چلی آئیں۔

"السلام علیکم!"

میں نے کھڑے ہو کر ان سے مصافحہ کیا۔

"آپا! یہ بیگم صدیلہ رفیع ہیں۔ وہ سرخ کھپریل کی چھت والا بنگلہ نہیں جو یہاں سے کچھ دور سڑک کے کنارے واقع ہے، یہ اس کی مکین ہیں۔ یہ لوگ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا وہاں آباد ہوئے ہیں"۔ میری میزبان آپا رضیہ نے ان خاتون کو بتایا۔ میں نے محسوس کیا آپا رضیہ کے لہجے میں ان خاتون کے لئے ادب اور احترام کا رنگ تھا۔

"اچھا...... بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اللہ کا شکر ہے کوئی تو ہمسائے میں آباد ہو گیا۔ یہ جگہ تو طویل عرصہ سے ویران اور غیر آباد ہی چلی آ رہی ہے"۔ وہ خاتون اپنائیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"آپ کیا کہیں جا رہی ہیں آپا؟" آپا رضیہ نے ان سے پوچھا۔

"ناظم آباد...... وہاں درس قرآن کی محفل ہے، شاید مجھے وہاں دیر ہو جائے۔ تم پریشان نہ ہونا"۔ انہوں نے کہا۔ پھر وہ میری طرف مڑیں۔ "عزیزہ بہن! معذرت خواہ ہوں، مجھے جانا نہ ہوتا تو مجھے آپ کے پاس بیٹھ کر آپ سے باتیں کر کے بے حد خوشی ہوتی"۔

"معذرت کی ضرورت نہیں، آپ اطمینان سے جائیے ہمارے درمیان آئندہ ملاقاتیں تو اب ہوتی ہی رہیں گی"۔ میں نے کہا۔

"ان شاء اللہ تعالیٰ...... چند دنوں بعد ہم خود آپ سے ملنے آ جائیں گے"۔ انہوں نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔

"یہ شاید آپ کی بڑی بہن تھیں؟" میں نے آپا رضیہ سے کہا۔

وہ مسکرائیں۔

"نہیں! انہیں میری سوکن، آپا بلقیس"۔

مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

"آپ کی سوکن؟"

آپا رضیہ مسکرائیں۔

"جی ہاں...... شیخ صاحب کی پہلی بیوی۔ یہ کوئی عجیب بات تو نہیں بہن صدیلہ! اکثر عورتوں کی سوکنیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ کسی کی ایک تو کسی کی دو یا تین"۔

"ہاں، یہ کوئی حیرت ناک یا انوکھی بات نہیں، ان کے کیا بچے بھی ہیں؟"

"نہیں ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن میرے بچے میری بجائے انہیں ہی اپنی حقیقی ماں سمجھتے ہیں"۔

"تو گویا شیخ صاحب نے اولاد کی خاطر آپ سے دوسری شادی کی؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوئی"۔ وہ مسکرا کر بولیں۔ "یہ ایک کہانی ہے، کوئی انوکھی نرالی سی نہیں۔ کیونکہ ایسی کہانیاں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں، جس کا ایک پہلو شاید آپ کو کچھ نیا اور عجیب سا لگے"۔

میرے ذہن میں تجسس سر ابھارنے لگا لیکن یہ پہلی ملاقات تھی اس لئے اس موقع پر کھوج کرید کچھ اچھی نہ معلوم ہوئی۔ اس لئے کچھ دیر اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے ہوئے ان سے رخصت ہو کر گھر آ گئی۔

اس ایک ملاقات نے ہمارے درمیان آئندہ ملاقاتوں کا دروازہ کھول دیا۔ ان ملاقاتوں نے ہمارے درمیان بے تکلفی اور اپنائیت پیدا کر دی۔ میں نے ہر لحاظ سے شیخ صاحب کی دونوں بیگمات کو بے حد سلجھی سنوری، شائستہ اور مہذب خواتین پایا۔ ان کی صاحب زادیاں بھی ان کے رنگ میں رنگی پردہ دار، باحیا اور دین دار دوشیزائیں تھیں۔ حسین صورت کے ساتھ ہی حسن سیرت سے بھی مزین۔

اتنی میل ملاقاتوں کے باوجود مجھے اب تک آپا رضیہ کی زبانی ان کی سوکن آپا بلقیس کی کہانی جاننے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس بارے میں میری دلچسپی اشتیاق اور تجسس بدستور برقرار تھے۔ پھر بالآخر ایک دن مجھے ان سے اس بارے میں دریافت کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ اس وقت میں ان سے ملنے ان کے گھر پہنچی ہوئی تھی۔ اتفاق سے وہ اس وقت گھر پر اکیلی تھیں۔ چائے کے دوران ہمارے درمیان پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں پھر میں نے ان سے پوچھ ڈالا۔

"آپ نے اس دن آپا بلقیس کی شیخ صاحب سے شادی کا ذکر کیا تھا کہ اس کی کہانی کچھ عجیب سی ہے۔ آپ کیا یہ بتانا پسند کریں گی کہ کیسے، کس پہلو سے؟"

وہ مسکرائیں۔

"آپ کو یہ بات خوب یاد رہ گئی۔ خیر.... میں آج آپ کو یہ کہانی سنا دیتی ہوں"۔ وہ صوفے پر آرام سے پھیل کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔ "اپنی پہلی شادی کے وقت شیخ صاحب بھارت میں رہتے تھے۔ یعنی ان کا تمام خاندان وہاں آباد تھا۔ دہلی کے نواحی علاقے مہرولی میں، وہاں ان کی کچھ زمینیں، کچھ جائیدادیں تھیں۔ شیخ عبدالرحمن صاحب اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ گھر کے مالی حالات چونکہ خاصے تسلی بخش تھے اس لئے یہ سب بہن بھائی اچھی تعلیم پا گئے۔ شیخ صاحب نے اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کیا اور ایک کالج میں پروفیسر لگ گئے۔ اس وقت تک ان کے تمام بہن بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اب ان کی شادی کے لئے لڑکی کی تلاش شروع ہوئی۔ گھر والے اور خود شیخ صاحب چاہتے تھے کہ ان کی بیوی بھی ان کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ سلجھی ہوئی اور مہذب اطوار ہو۔ ان کے زمین دار خاندان میں ایسی کوئی لڑکی نہیں تھی اس لئے ان کے لئے خاندان سے باہر لڑکی کی تلاش شروع ہوئی۔

تلاش بسیار کے بعد بالآخر انہیں وہ لڑکی مل ہی گئی۔ یہ بلقیس آپا تھیں۔ ان کا گھرانہ تاجروں کا گھرانہ تھا۔ خوشحال تعلیم یافتہ لوگوں کا گھرانہ۔ یہ مذہبی رجحان رکھنے والے شریف، مہذب اور شائستہ اطوار لوگ تھے۔ بلقیس آپا تین بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ انہوں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ امور خانہ داری میں خوب طاق۔ حسن صورت کے ساتھ ہی وہ حسن سیرت سے بھی مزین تھیں۔ شیخ صاحب کو یہ رشتہ بے حد پسند آیا۔ یوں ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے شیخ صاحب سے ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان بننے کے اعلان کے ساتھ ہی ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ مسلمان مہاجروں کے قافلے پاکستان جانا شروع ہو گئے۔ بلقیس آپا اس وقت 'میکے' فتح پور گئی ہوئی تھیں۔ فسادات بڑھتے بڑھتے تمام ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ سیکڑوں سالوں سے ساتھ رہنے والے ہمسائے اب ایک دوسرے کے دشمن بن چکے تھے۔ شیخ

صاحب کا محلّہ اب تک فسادات سے محفوظ چلا آ رہا تھا لیکن وہ اپنے ہندو ہمسایوں پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے چپکے چپکے پاکستان جانے کی تیاریاں کرنی شروع کر دیں۔ شیخ صاحب بلقیس آپا کو لانے فتح پور چلے گئے۔ ان کا وہاں جانا ان کے حق میں اس لئے بہتر ثابت ہوا کہ ان کے جانے کے اگلے ہی دن باہر سے بڑی بھاری تعداد میں بلوائی مہرولی میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے وہاں بے تحاشہ قتل و غارت اور تباہی و بربادی مچانی شروع کر دی۔ نتیجے مسلمانوں کی تمام آبادی شہید ہو گئی۔ شیخ صاحب کے خاندان کا بھی کوئی فرو زندہ نہ بچا۔

"ادھر شیخ صاحب جب فتح پور جانے کے لئے ٹرین میں سوار ہوئے تو راستے میں ایسے مسلح سکھوں کے ایک دستے نے آن لیا انہوں نے ٹرین رکوا کر مسافروں کو اس پر سے اتارنا اور گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔ شیخ صاحب ٹرین کے رکتے ہی چھلانگ لگا کر اس سے اتر کر جھاڑیوں میں چھپ گئے تھے۔ اس لئے بچ گئے۔ پھر جب سکھ حملہ آور وہاں سے چلے گئے اور ٹرین آگے روانہ ہونے لگی تو وہ اس پر سوار ہو گئے۔ جب وہ فتح پور پہنچے تو اسے بالکل پُرامن پایا۔ آپا بلقیس کا خاندان اور وہاں کی مسلمان آبادی محفوظ تھے۔ یہ دیکھ کر شیخ صاحب کو تسلی ہوئی لیکن انہوں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ پاکستان ہجرت کر جانے کی بجائے وہیں آباد رہنا چاہتے تھے۔ شیخ صاحب کے سسرال والے بھی اسی حق میں تھے۔ شیخ صاحب نے انہیں ہجرت پر آمادہ کرنے کی بے حد کوشش کی بہتیرا سمجھایا بجھایا لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے بلقیس آپا کو بھی ان کے ساتھ بھیجنے سے انکار کر دیا اور انہیں کہہ دیا کہ پہلے وہ پاکستان جا کر اپنی روزی روٹی کا انتظام کریں پھر اپنے پاس بلوالیں۔

چاروناچار شیخ صاحب مہرولی واپس چلے آئے جہاں اپنے خاندان سمیت تمام مسلمان آبادی کو دیکھ کر

حدیث نبویؐ

جو شخص صبر کرے گا اللہ اس کو صبر دے گا اور صبر سے زیادہ بہتر اور زیادہ بھلائیوں کو سمیٹنے والی بخشش اور کوئی نہیں۔ (بخاری)

انہیں جو دکھ اور صدمہ پہنچا تھا سو پہنچا لیکن چونکہ وہ ہجرت کا تہیہ کر چکے تھے اس لئے ایک مہاجر قافلے میں شامل ہو کر بچتے بچاتے ہزار صعوبتیں اور مصائب جھیلتے بالآخر پاکستان پہنچ ہی گئے۔ وہ پہلے کچھ عرصہ لاہور میں رہے پھر حیدرآباد چلے آئے۔ ان کے پاس تعلیمی اسناد تھیں اور جائیداد کا کلیم بھی۔ انہیں وہاں کچھ زرعی زمین الاٹ ہو گئی اور ایک سکول میں ملازمت بھی مل گئی۔ رہائش کے لئے انہوں نے ایک بڑا سا مکان بھی خرید لیا۔ یوں معاش اور رہائش کی فکروں سے آزاد ہو کر انہوں نے اب آپا بلقیس کو اپنے پاس بلوانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک دونوں ملکوں میں الگ الگ حکومتیں قائم ہو کر امن قائم ہو چکا تھا اور اطراف کے باشندوں کی ہجرت پُرامن طریقے سے عمل میں آنے لگی تھی۔ چنانچہ شیخ صاحب نے آپا بلقیس کو اپنے پاس آنے کا خط لکھا اور انہیں خاصی رقم بھی بھجوا دی لیکن دو تین ماہ گزر گئے انہیں آپا بلقیس یا ان کے گھر والوں کی طرف سے کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ اس پر انہوں نے اپنے سسر کے نام خط لکھا اور آپا بلقیس کے سفر خرچ کے لئے مزید رقم بھیج دی لیکن اس مرتبہ بھی کئی مہینے گزر گئے ان کی طرف سے خاموشی ہی رہی۔

اب شیخ صاحب کو حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی ہونے لگی لیکن وہ ابھی مایوس نہ ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر آپا بلقیس کو خط کے ساتھ پاکستان آنے کے لئے معقول رقم بھیج دی لیکن اس مرتبہ بھی وہی ہوا جو پہلے ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اس پر انہیں یہ خیال آنے لگا کہ

شاید ان کا سسرالی خاندان فسادات کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور اس کا کوئی فرد زندہ نہ بچا تھا۔ اس خیال سے وہ بے حد دکھی بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ اسی حالت میں کافی عرصہ گزر گیا۔ پھر جب انہیں صبر وقرار آنے لگا تو انہوں نے گھر بسانے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ میرے ابا جان انہی کے سکول میں ماسٹر تھے۔ وہ ان کے حالات اور ان کے دکھ سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے ان سے ہر ممکن ہمدردی کی اور ان سے کہا کہ وہ ان کی دختر سے یعنی مجھ سے شادی کرلیں۔ میں اس وقت ایک مڈل سکول میں استانی تھی۔ گھرداری کا سلیقہ بھی رکھتی تھی۔ ان کے خیال میں میں ان کے لئے اچھی رفیقہ حیات ثابت ہو سکتی تھی۔ شیخ صاحب مان گئے۔ یوں بڑی سادگی سے ہماری شادی ہوگئی۔

ہماری شادی کے مہینہ بھر بعد ابا جان کو دل کا شدید دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے انتقال کے بعد والدہ جو اب تنہا رہ گئی تھیں، میرے پاس چلی آئیں۔ شیخ صاحب ان کا حقیقی والدہ کی طرح احترام وعزت کرتے تھے۔ اس وقت تک پاکستان کو بنے یا شیخ صاحب کو اپنی پہلی بیوی آپا بلقیس سے بچھڑے چودہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا......" وہ ماضی کے ورق پلٹتے پلٹتے ذرا دم لینے کو رکیں۔

"کیا یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آپا بلقیس اور ان کے خاندان پر کیا گزری تھی؟" میں نے پوچھ ڈالا۔

"میں اسی طرف آرہی ہوں"۔ وہ داستان کا سرا اٹھاتے ہوئے بولیں۔ "شیخ صاحب میرے لئے ایک بے حد اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ انہوں نے مجھے محبت، تحفظ اور احترام سب کچھ دیا۔ ان جیسا شوہر پا کر مجھے اپنے اوپر رشک آیا کرتا تھا لیکن کبھی کبھار مجھے یہ خیال انتہائی بے چین اور پریشان کردیتا تھا کہ اگر آپا بلقیس کی کوئی خبر آگئی تو کیا ہوگا؟ اگر وہ یہاں آن پہنچیں تو میری کیا حیثیت رہ جائے گی؟ میں جب اس بارے میں اپنی والدہ سے بات کرتی تو وہ مجھے تسلی دیتیں کہ اتنے طویل عرصہ کے بعد اب آپا بلقیس کے پاکستان چلے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ شاید زندہ بھی نہیں تھیں۔ فتح پور کے تمام مسلمانوں اور اپنے خاندان سمیت وہ بھی مرکھپ چکی تھیں۔ اگر بالفرض وہ زندہ ہوتیں اور پاکستان آن بھی پہنچیں تو شیخ صاحب ہرگز ان کی آمد کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھیں گے نہ ان کی طرف ملتفت ہوں گے۔ پھر ہوا یہ کہ میری شیخ صاحب سے شادی کو چار پانچ ماہ ہی گزرے تھے کہ آپا بلقیس اچانک ہی ہمارے گھر آن پہنچیں۔

"اس شام میں اور شیخ صاحب گھر کے باہر صحن میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ والدہ باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ صحن کا دروازہ یونہی بند تھا یعنی اسے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ جب اسے کھول کر ایک برقعہ پوش خاتون ایک معمولی سا سوٹ کیس اٹھائے کچھ ہچکچاتی گھبراتی اندر چلی آئیں۔ وہ بے حد ہی حسین خاتون تھیں، خوب سرخ وسپید پاکیزہ رو۔ انہیں دیکھتے ہی شیخ صاحب کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ وہ ایک دم کرسی سے اٹھ گئے اور ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "بلقیس!"

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میری سوکن آپا بلقیس نہ صرف زندہ تھیں بلکہ وہاں آن بھی پہنچی تھیں۔ اب میں آپ کو اس کی تفصیل نہیں سناؤں گی کہ انہیں دیکھ کر میرا کیا حال ہوا۔ میں کیسی حیران وپریشان بے چین وبے سکون ہوئی۔ مجھے کتنا دکھ اور صدمہ پہنچا لیکن اس سے مجھے جو حسد اور رقابت محسوس ہوئی اس کے شرارے مجھے اپنے وجود کو جھلساتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس وقت مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ سوکناپے کی جلن کیا ہوتی ہے۔ یہ ایک عورت کو کس ذہنی عذاب اور اذیت میں مبتلا رکھتی

ہے۔ اپنے خاوند میں کسی دوسری عورت کا ساجھا ایک ایسا زخم ہوتا ہے جس پر مسلسل نمک پاشی کی جاتی ہے۔ میرا بس نہ چل رہا تھا کہ میں اس عورت کا گلا دبا دیتی۔ اسے قتل کر ڈالتی۔ میرا رواں رواں آگ بنا ہوا تھا۔ اسی وقت میری والدہ بھی وہاں آن پہنچیں۔ صورت حال سے آگاہ ہوتے ہی وہ بری طرح سے چیخ چلاتی آپا بلقیس پر چڑھ دوڑیں کہ اتنا طویل عرصہ گزارنے کے بعد وہ اب کیوں ان کی بیٹی کی زندگی خراب کرنے آ گئی تھیں جبکہ سب انہیں مردہ فرض کر چکے تھے۔ وہ اتنے غیظ و غضب میں تھیں کہ اگر شیخ صاحب بیچ بچاؤ نہ کرتے تو وہ انہیں بُری طرح سے مار پیٹ ڈالتیں۔ شیخ صاحب خود ان کے آنے پر کچھ خوش نہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ کہہ رہے تھے لیکن ان کے چہرے پر شدید برہمی اور تکدر کے تاثرات بکھرے ہوئے تھے۔

”خیر...... جب یہ ناخوشگوار جذباتی ریلا گزر گیا تو شیخ صاحب نے آپا بلقیس سے کل حالات کی تفصیل پوچھی۔ انہوں نے انہیں بتایا کہ انہیں کبھی پتہ نہ چل سکا تھا کہ وہ انہیں خط لکھتے رہے تھے اور رقومات بھیجتے رہے تھے۔ وہ ان کی طرف سے بلاوے کے انتظار میں ہی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کے ماں باپ فوت ہو گئے۔ بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ان کی بیویاں بہت فسادی اور جھگڑالو عورتیں تھیں۔ انہوں نے آپا بلقیس کو کوئی عزت و احترام دینے کی بجائے اپنی نوکرانی بنا لیا اور ان کی ہر ممکن تذلیل و تحقیر کی جانے لگی۔ آپا بلقیس تنہا بے سہارا بے یار و مددگار مجبوراً اس زندگی پر شاکر ہو رہی ہیں۔ اپنے طور پر وہ یہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ شیخ صاحب پاکستان جا کر انہیں بھلا چکے تھے۔ یا شاید بلوائیوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے لیکن پھر ایسا ہوا کہ ایک دن سٹور کی صفائی کرتے ہوئے کاغذات کا ایک پلندہ ان کے ہاتھ لگا۔ انہوں نے یونہی وہ کاغذات دیکھنے شروع کیے تو

حیرت ناک طور پر ان میں وہ لفافے بھی موجود پائے جن پر ان کا نام لکھا ہوا تھا۔ ان کے اندر شیخ صاحب کے ان کے نام لکھے ہوئے خطوط بھی موجود تھے۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ ان کے بھائی شیخ صاحب کے خطوط ان تک پہنچنے نہ دیتے تھے اور ان کی بھیجی ہوئی رقوم بھی خود بانٹ کھاتے تھے۔ انہیں اس پر جتنا صدمہ ہونا تھا سو ہوا۔ غصہ بھی بے حد آیا لیکن انہیں اس کی بے حد خوشی ہوئی کہ شیخ صاحب نہ صرف زندہ تھے بلکہ برسر روزگار اور خوشحال بھی تھے۔ انہوں نے اپنے بھائیوں اور بھابیوں سے کچھ نہ کہا اور خود ہی پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت ان کے پاس اپنا کافی زیور موجود تھا جسے انہوں نے سب سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اس میں سے کچھ فروخت کیا اور ایک نیک دل پڑوسی کو اعتماد میں لیتے ہوئے اس کی مدد سے پاکستان جانے کا انتظام کیا۔ پھر ایک دن چپ چپاتے جہاز میں بیٹھ کر کراچی پہنچ گئیں۔ شیخ صاحب کا پتہ ان کے پاس تھا، کراچی سے وہ بس میں سوار ہوئیں اور حیدرآباد پہنچ گئیں۔

"ان کی اس کہانی پر میری والدہ نے بے حد ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ انہیں وہیں بھارت میں اپنے بھائیوں کے پاس رہنا چاہئے تھا۔ اس گھر میں اب ان کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اب وہ یہاں آن ہی پہنچی تھیں تو وہ اپنے خاوند اور اس کی دوسری بیوی کی نوکرانی بن کر رہیں ورنہ گھر سے نکل جائیں۔ میں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور آپا بلقیس کی خوب بے عزتی کی۔ شیخ صاحب البتہ خاموش ہی رہے۔

"آپا بلقیس کچھ نہ بولیں انہوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ اس گھر میں رہتے ہوئے سب کی خدمت کریں گی اور کسی کو کسی شکایت کا موقع نہ دیں گی۔ میری والدہ نے انہیں رہنے کے لئے سامان رکھنے والی تنگ و تاریک سی کوٹھری دے دی۔ آپا بلقیس کی اس ذلت و خواری پر اور شیخ صاحب کی ان سے لاتعلقی پر میں بے حد خوش تھی۔ مجھے فتح مندی کا احساس بھی تھا اور شیخ صاحب کی بلا شرکت غیرے بیوی ہونے کا فخر و غرور بھی۔

آپا بلقیس نے اگلے ہی دن گھر کے تمام کام اپنے ذمہ لے لئے۔ گھر کی صفائی ستھرائی، برتنوں کپڑوں کی دھلائی، ناشتے کھانے کی تیاری۔ وہ ہر کام بے حد عمدگی مہارت اور صفائی سے کرتیں۔ ہر ایک کی ضروریات کا خیال رکھتیں۔ بلاضرورت کوئی بات نہ کرتیں۔ اپنے کام سے کام رکھتیں۔ گھر آئے مہمانوں کی بہترین خاطر تواضع کرتیں۔ میں نے انہیں شروع دن ہی سے نماز پنجگانہ کی سختی سے پابندی کرتے پایا تھا۔ نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن ان کا معمول تھا۔ ان کی قرأت بڑی حسین اور متاثر کن تھی جسے سن کر دل پر عجیب سا اثر ہوتا تھا"۔

طویل سلسلہ کلام کے بعد آپا رضیہ دم لینے کے لئے رکیں۔ انہوں نے پانی کے چند گھونٹ پئے پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہنے لگیں۔

"دن اسی طرح گزرتے گئے۔ میرے بڑے بھائی جو اب تک عرب میں رہتے آرہے تھے اب پاکستان آچکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ والدہ اب ان کے پاس آکر رہیں لیکن وہ انہیں ٹال رہی تھیں۔ دراصل وہ بلقیس آپا پر کڑی نظر رکھنے کے لئے وہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ انہیں ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں شیخ صاحب کے دل میں آپا بلقیس کے لئے کوئی نرم گوشہ نہ پیدا ہو جائے۔ ایک تو وہ مجھ سے زیادہ حسین تھیں پھر ان کے حالات بھی دل میں ان کے لئے رحم و ہمدردی کے جذبات ابھارنے والے تھے۔ پھر ان کی بے پناہ خدمت گزاری تھیں اور صبر و تحمل جو بے اثر ثابت نہ ہو سکتے تھے لیکن جب کئی ماہ گزر گئے اور ایسے کوئی خدشات سامنے نہ آئے تو والدہ کچھ مطمئن سی ہوگئیں اور بڑے بھائی کے ساتھ چلی گئیں۔ جانے سے پہلے وہ مجھے بے شمار نصیحتیں

اور ہدایات دینا نہ بھولی تھیں۔

"والدہ کے جانے کے بعد بھی آپا بلقیس کا وہی معمول رہا۔ گھر کے کام کاج اور ہماری خدمتیں، فارغ وقت میں وہ دینی کتابوں کا مطالعہ کرتیں۔ باتیں بھی اچھی اچھی کرتیں۔ میں اب کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کوئی نامعلوم خلش سی ہر دم پریشان کرنے لگی تھی۔ جسے میں باوجود کوشش کے سمجھ نہ پا رہی تھی۔ کوئی گرہ سی تھی جو میرے ذہن میں پڑی ہوئی تھی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ مجھے بخار ہو گیا۔ معمولی سا بخار تھا لیکن آپا بلقیس اس پر بے حد پریشان ہو اٹھیں۔ انہوں نے میری ایسی خدمت ایسی خبر گیری کی کہ مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پڑی ہوئی گرہ بھی کھلتی چلی گئی۔ عرصۂ دراز سے مجھے بے چین و بے سکون رکھنے والی خلش بھی دور ہوتی چلی گئی۔ یہ میرا احساسِ ندامت تھا جسے میں نے سختی سے کچل رکھا تھا۔ آپا بلقیس کی حق تلفی پر.... ان کے ساتھ اپنے ناروا سلوک اور ظلم پر...... شدید قسم کا احساسِ ندامت...... یہ مجھ پر اس شدت سے حملہ آور ہوا کہ میں مغلوب ہو کر ان کے قدموں میں جھک گئی اور بے تحاشا اشکِ ندامت بہاتے ہوئے ان سے معافی اور درگزر کی بھیک مانگنے لگی۔ اس فرشتہ سیرت عظیم خاتون نے مجھے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور ایسی تسلیاں دلاسے دیئے، ایسی اچھی اچھی باتیں کیں کہ میری روح ان کی عظمتِ کردار اور پاکیزگی اخلاق کے سامنے سجدہ ریز ہوتی چلی گئی۔

اب میں نے انہیں بڑی بہن کا درجہ دیتے ہوئے ان پر سے گھر کے کاموں کا بوجھ ہٹا دیا۔ ان کی عزت، احترام اور خدمت اپنا شعار بنا لیا۔ شیخ صاحب بھی اس پر بے حد خوش ہوئے۔ وہ مذہبی رجحان رکھنے والے شخص تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ آپا بلقیس کی حق تلفی نہ ہو۔ وہ اپنا اصل مقام حاصل کریں۔ وہ ان کی بیوی تھیں اور

ان سے انہیں محبت تھی اور بے پناہ ہمدردی بھی لیکن وہ میری وجہ سے اب تک خاموش چلے آ رہے تھے۔ اب آپا بلقیس باقاعدہ ان کی پہلی بیوی بن گئیں۔ گھر میں ان کی حکومت قائم ہو گئی لیکن مجھ سے ان کا رویہ وہی پہلے جیسا ہی رہا۔ شیخ صاحب کی خدمت گزاریوں میں بھی انہوں نے کوئی کمی نہ آنے دی۔ پھر جب میرا پہلا بیٹا منیر پیدا ہوا تو آپا بلقیس کو ایسی خوشی ہوئی جیسے اس بچے نے ان کے ہاں جنم لیا ہو۔ انہوں نے میری بے حد خدمت کی۔ بچے کی دیکھ بھال اور ذمہ داریاں بھی خوب پوری کیں۔ میری والدہ جو ان دنوں وہاں پہنچی ہوئی تھیں انہوں نے بدلے ہوئے حالات پر پہلے تو بے حد احتجاج اور اظہار ناپسندیدگی کیا لیکن پھر وہ بھی مطمئن ہو گئی تھیں۔

"اب ایک اور بات سنئے! اب تک شیخ صاحب ایک معمولی سے سکول ماسٹر چلے آ رہے تھے۔ انہیں جو زرعی اراضی الاٹ ہوئی تھی وہ بالکل بنجر زمین تھی جس پر کوئی فصل نہ اُگ سکتی تھی۔ انہوں نے وہ زمین فروخت کر دی اور ملازمت چھوڑ کر ایک چھوٹی سی دُکان کھول لی۔ اللہ تعالیٰ کو شاید ہماری آپا بلقیس سے کی جانے والی نیکی پسند آ گئی تھی کہ وہ دُکان دیکھتے ہی دیکھتے ایسی چلی کہ شیخ صاحب نے اسے فروخت کر کے شہر کے بڑے بازار میں ایک بڑی سی دُکان لے لی۔ اللہ کی مہربانی سے وہ بھی دن رات دوگنا چوگنا منافع دینے لگی۔ اب شیخ صاحب نے دو تین دکانیں اور کھول لیں وہ بھی ہن برسانے لگیں۔ اب شیخ صاحب نے باسمتی چاولوں کا کاروبار شروع کر دیا جو جلد ہی ملک بھر میں پھیل گیا۔ اب ہم نے اس جگہ زمین خرید لی۔ یہاں گھر بنوایا اور یہاں شفٹ ہو گئے۔ اس کے بعد شیخ صاحب نے کئی شاپنگ پلازے اور دکانیں بھی خرید لیں۔ اس وقت تک میرے ہاں دو بیٹے اور دو بیٹیاں اور پیدا ہو چکے تھے۔ ان کی پرورش تعلیم و تربیت سب آپا بلقیس نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ وہ خود اولاد سے محروم تھیں اور یہ بچے گویا ان کے جگر کے ٹکڑے تھے۔ وہ بھی انہیں ہی اپنی حقیقی ماں سمجھتے تھے۔ یہ ان کی تعلیم و تربیت کا اعجاز ہی تھا کہ بڑے ہونے پر سب بچے نہ صرف بہترین ادب آداب سے آراستہ نیک اطوار تعلیم میں خوب لائق فائق بلکہ دینی رجحان کے حامل بھی نکلے۔ دولت مندی اور بلند معاشرتی مقام کے باوجود ہمارے گھر کا ماحول نیکی تقویٰ باہمی احترام و عزت وعجز و انکسار اور اللہ کی ہر دم شکر گزاری کی بدولت بڑے امن و سکون کا ماحول ہے۔ ذہنی و قلبی سکون کا ماحول اور یہ سب آپا بلقیس ہی کی بدولت ہے۔

"بہن عدیلہ! میں اکثر سوچتی ہوں کہ میں اگر آپا بلقیس کے ساتھ روا اپنے ناروا سلوک اور ظلم کا احساس نہ کرتی، ان سے معافی نہ مانگتی اور انہیں ان کا جائز حق اور مقام نہ دیتی تو کیا ہوتا؟ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس کی سزا ملتی۔ میری اولاد سرکش اور نافرمان نکلتی، گھر کا ماحول جہنم بن جاتا، خوشحالی فارغ البالی ہمیں کبھی نصیب نہ ہوتی۔ معاشرے میں ہمیں ایسی عزت، ایسا محترم مقام حاصل نہ ہوتا۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے مجھے ہدایت دی، سیدھی راہ دکھائی۔

اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے آزمائشوں کی بھٹی سے گزارا کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ میرا یہ بندہ ان حالات میں بھی میرا شکر گزار بن کر رہتا ہے یا نہیں۔ آپا بلقیس بھی اللہ کا ایسا ہی بندہ تھیں جو اس کی ڈالی ہوئی اس کڑی آزمائش میں پڑیں اور پوری اتریں، اس کی شکر گزار بن کر رہیں۔ اللہ کو ان کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ اس نے ان کی بے رحم سوکن کے دل میں اپنا خوف اور نیکی بھلائی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا لیکن بہت کم لوگ اسے سمجھتے ہیں۔

◆◆◆

اپنی اپنی انا کے قیدی میاں بیوی کی المناک سرگزشت۔
انا کی دیوار گرانے کے لئے انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

انا کی دیوار

ڈاکٹر مبشر حسن ملک

سلام مصری نوجوان تھا۔ وہ عمومی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ نقش و نگار بھی عام مصریوں جیسے تھے مگر دیکھنے میں خوش وضع دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا سفید تھا جبکہ قد پستہ، صحت خاصی اچھی تھی۔ وجود میں کچھ اور بڑھتا تو فربہ کہلانے لگتا۔ ایک روز اپنے ڈاکٹر سے الجھ پڑا۔ اسے باور کراتا رہا کہ میں اوور ویٹ نہیں بلکہ انڈر ہائیٹ ہوں۔ یہ نوجوان اسی ہسپتال میں کام کیا کرتا تھا جس میں میں بطور معالج ملازم تھا۔ اس ملک کے بڑے اداروں میں کئی اقوام کے کارکن یکجائی میں فرائض انجام دیا کرتے تھے۔

سلام ایک روز صبح ہی صبح میرے دفتر پہنچ گیا۔ اس دم اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف بغور دیکھا تو وہ جھینپ گیا۔ پھر اس نے جیب سے ایک ورق نکالا اور میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ میں نے ورق سنبھالا تو وہ اشتیاق سے میرا چہرہ پڑھنے لگا۔ چھٹی کی درخواست تھی، وہ ماہ بھر کے لئے مصر جانا چاہتا تھا چونکہ ادارے کے اکثر لوگ پردیسی تھے اس لئے اس نوع کی استدعا میں آ جانا اچنبھے کی بات نہیں تھی مگر اس لمحے سلام کا پُر تحیر چہرہ اندرونی مدوجذر کی کہانی سنا رہا تھا۔

"میں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے"۔ اس نے انکشاف کیا تو میرے اشتیاق کی پیاس بڑھ گئی۔

"تو گویا محبت بازی جیت گئی؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک لیا۔

"ہاں۔" اس نے پُرمسرت لہجے میں جواب دیا۔

پھر لمحہ بھر توقف کے بعد کہنے لگا۔ "سر! ہم مصری بھلا کب بار بار شادیاں رچاتے ہیں؟ سوچا، پسند سے ساتھی اپناؤں تو کوئی پہلو تشنہ نہیں رہے گا۔" اس کی بات پر میں خاموش رہا جبکہ وہ تواتر سے بولنے لگا۔ "میں اسے بعد وقت حاصل کر پایا ہوں۔ سر! وہ حور ہے، آسمانی حور، صرف نام کی نہیں وہ حقیقی بھی اصلی حور ہے، بالکل پاک صاف۔ میری آنکھیں اس سے ہٹتے نہیں ہٹتی تھیں۔"

سلام کی نوا میں نوخیز کی چہکار تھی۔ میں معاملہ سمجھ گیا۔ اس وقت بھی بیرون ملک کام کرنا مصر میں احسن سمجھا جاتا تھا۔ اس کی درخواست پر میں نے اپنی سفارش کی مہر ثبت کر دی۔

"ایک اور عقل مند کام سے گیا۔" نزدیک کھڑے تہامی نے شگفتہ بیانی کی۔ تہامی کا تعلق تیونس سے تھا اور وہ اپنی شوخ سرشتی کے باعث مشہور تھا۔

"کیوں؟" میں نے قدرے بے خیالی میں پوچھا۔

"سر! یہ کسی زن سے شادی کر رہا ہے، جو مصری نژاد ہے۔" تہامی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ سے آخری بار چھٹی مانگ رہا ہے۔ شادی کے بعد یہ خود پس پردہ چلا جائے گا اور چھٹی کی استدعا اس کی بیوی لے کر آیا کرے گی جو اسی ہسپتال میں ملازمت کرے گی۔" اپنی بات ختم کر کے تہامی نے شرارت بھرا قہقہہ لگایا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فاطمہ سلام کی زندگی میں آئی تو میرے شعبے میں تعینات ہو گئی۔ نووارد نے خاوند کا گھر سنبھالا تو ساتھ ہی اسے نوکری کی باریکیاں بھی سکھا دیں۔ بعد میں وہ سلام کے معاملات پر پوری طرح حاوی ہو گئی۔

میاں بیوی سفر حیات میں آگے چل پڑے۔ باہم اکٹھا رہے تو پیار بھی بڑھتا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کا دم بھرتے تھے۔ قدرت نے انہیں چاند سا بیٹا بھی عطا کر دیا۔ اب خوشیاں ان کے سنبھالے نہ سنبھلتی تھیں۔ پھر یکدم ان کے گھرانے کو نظر بد کھا گئی۔

ایک صبح فاطمہ نوکری پر آئی تو پریشان دکھی۔ اس کی آنکھوں سے شب بیداری پوری طرح جھلکتی تھی اور چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔ میں نے ماجرا پوچھا تو وہ ٹال گئی۔ اپنی پریشانی کا سبب نہ بتا سکی۔ یہی وطیرہ سلام نے اپنائے رکھا۔ پھر فاطمہ نوکری چھوڑ کر مصر چلی گئی۔ اپنا ڈیڑھ سالہ بیٹا بھی ہمراہ لے گئی۔ ان بگڑے رویوں پر احباب کو دکھ ہوا۔ اچھا بھلا خاندان دنوں میں بکھر گیا۔

"اگر وہ مجھ سے معافی مانگ لیتی تو میں بھی درگزر کر دیتا۔" سلام اکثر کہا کرتا تھا۔ "فاطمہ نے میری ماں کی توہین کی تھی، جسے کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

معلوم ہوا کہ جھگڑا کوئی بڑا نہیں تھا مگر بڑھ گیا تھا۔ بیچ انا کی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ ان کی تسخیر کار دشوار دکھائی دیتا تھا۔

"آخر بچہ سزاوار کیوں ہے؟" میں نے کئی بار سلام سے پوچھا مگر وہ مناسب توجیہہ نہ دے سکا۔

وقت گزرا تو حالات اور بھی دگرگوں ہو گئے پھر آخر سلام نے سلجھاؤ کا طریقہ ڈھونڈ لیا جو ہر پہلو سے انوکھا تھا۔

"میں مصر جاؤں گا اور اپنا بیٹا اغوا کر لوں گا۔" سلام نے ایک عزم سے کہا۔ "پھر کسی طور اسے یہاں لے آؤں گا۔ فاطمہ آخر ماں ٹھہری، اولاد کے پیچھے بھاگی چلی آئے گی۔ پھر میں تدبیر سے اپنا کنبہ سنبھال لوں گا۔ اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔" سلام نے عجلت میں فیصلے کو حتمی شکل دے دی۔ مزید مشاورت کرنے پر بھی قائل نہ ہوا۔

وہ بچے کو پرویس لایا تو مسائل کی دلدل میں دھنس گیا۔ طفل کی نگہداشت اسے ناممکن لگی۔ جلد ہی مصائب اس کی بساط سے بڑھنے لگے۔ متوقع آیا کسی کام نہ آئی۔ بچہ ہر وقت روتا رہتا تھا، اکثر چیختے چلاتے بے حال ہو

جاتا۔ کھانا نہ پیتا تھا، کبھی سلام کو بھی ساتھ رلا دیتا تھا۔ اس کی نگاہیں فقط ماں کو ڈھونڈا کرتی تھیں۔ حالات کے بوجھ تلے بچے کی جان کے لالے پڑ گئے۔ ایک شب وہ اتنا رویا کہ نڈھال ہو گیا، سلام کو اسے ہسپتال لانا پڑا۔ اس رات گلوکوز اور ادویہ کی سوئیاں بچے کے بدن میں اتر گئیں۔ تشخیص پر معلوم ہوا کہ وہ ٹائیفائیڈ کا شکار ہو چکا تھا۔

ہسپتال قیام کے دوران بچہ کسی حد تک سلام سے مانوس ہو گیا۔ ان دنوں ویسے بھی وہ بچہ مسکن دواؤں کے زیر اثر رہتا تھا۔ بیٹے سے دوستی کا پہلو باپ کے لئے تشفی آمیز تھا۔ اب اس کے وجود میں بیوی کے خلاف انتقام کا جذبہ بھی نمو پانے لگا تھا کیونکہ فاطمہ ہٹ دھرمی پر بدستور قائم تھی۔

ان دنوں سلام کے ذہن پر غیر معمولی بوجھ دکھنے لگا تھا۔ وہ اکثر تناؤ کا شکار ہو جاتا۔ اس دم لازمی امور بھی دھیان سے محو کر دیتا۔ جائے شغل پر بدمزگی حدیں چھونے لگی۔ بچہ اس کے فرائض میں رکاوٹ بن جاتا تھا۔ سلام کی نوکری خطرے میں نظر آنے لگی۔ اسے مجبوراً ناگزیر کا وقتی حل تلاش کرنا پڑا۔ اس ضمن میں وہ پُرخطر، غیر انسانی اقدام کرنے سے بھی نہ کترایا۔ بچے کو نشہ آور دوائیں پلا دیتا جن کے باعث وہ گہری نیند سو جاتا۔ پھر سلام اسے اپنی گاڑی میں لٹا دیتا، کبھی اس مقصد کے لئے کار کی ڈکی بھی استعمال کر لیتا۔ تازہ ہوا کی گردش کے لئے ڈکی ادھ کھلی چھوڑ دیتا۔

ماہ جون اپنے عروج پر تھا اور گرمی زوروں پر۔ وہ جمعے کا روز تھا۔ مسجد کا صحن نمازیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں بھی معمول کے مطابق نماز میں شریک تھا۔ نماز جاری تھی کہ یکدم ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لگا کوئی شخص صفیں چیرتا ہوا باہر کی سمت بھاگ رہا تھا۔ جب وہ میرے سامنے سے گزرا تو میں چونک کر رہ گیا۔ وہ سلام تھا اور بدحواس دکھتا تھا، پسینے میں شرابور تھا اور اس کے منہ سے جھاگ بہہ نکلا تھا۔ وہ مسلسل اپنے بیٹے کو پکار رہا تھا۔ "بزورہ تی، بزورہ تی" (میرا بچہ، میرا بچہ)۔ لفظوں کی تکرار اس کے ہونٹوں پر گرداں تھی، اس کے تعاقب میں شرطے بھی بھاگ رہے تھے۔

سلام کی جھلک دیکھ کر میں بھی بے چین ہو چکا تھا۔ نماز کے فوراً بعد پارکنگ کی طرف لپکا۔ سلام کی گاڑی وہاں کھڑی تھی۔ پولیس نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہاں جم غفیر جمع ہو رہا تھا۔ انتظامیہ نے گاڑی کی ڈکی کھول دی تھی۔ وہاں ایک نونہال کی لاش پڑی تھی، جس نے ننھے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھام رکھی تھی۔ سلام خود گاڑی کے پہلو میں بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے لبوں پر جنبش مدھم پڑ چکی تھی۔ اب وہ اپنی بیوی کو پکار رہا تھا۔ جلد ہی ایمبولینس فراٹے بھرتی وہاں پہنچ گئی۔

اگلے روز فاطمہ سلام کے پاس آ گئی۔ ماتمی رقت اس پر بھی طاری تھی۔ بیوی کو اچانک مقابل دیکھ کر سلام کے حواس معطل ہو گئے اور وہ لمحہ بھر میں پیرا زمین بوس ہو گیا۔

شام کی سیاہی گہری ہو چکی تھی۔ افسردہ گھر میں تاریکی کا راج بچھا تھا۔ سٹریٹ لائٹ کی مدھم روشنی کھڑکی سے اندر جھلک رہی تھی۔ سلام اور فاطمہ لونگ روم میں بیٹھے سسکیاں بھر رہے تھے۔ باہمی تسلی کے الفاظ بھی ان سے روٹھ چکے تھے۔ ان کے بیچ انا کی دیوار منہدم ہو چکی تھی مگر اس کے لئے انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔

"معلوم نہیں گاڑی کی ڈکی میں نے کیسے بند کر دی؟" سلام نے کہا اور ایک بار پھر بلند خروش رو پڑا۔

"کاش! میں بیٹے کی جگہ اپنی لاش اٹھا لیتا۔" فاطمہ بھی بے قابو ہو کر چیخنے لگی۔

■■■

بلوچ آگئے، بلوچ آگئے!

وقت گذر گیا۔ مہاجرین کے قافلے ختم ہو گئے لیکن بلوچ آگئے۔ بلوچ آگئے کا خوف زندہ رہا۔

☆ سکندر خان بلوچ
balochsk@yahoo.com

ساؤتھمپٹن انگلینڈ کا ایک بہت ہی خوبصورت اور پیارا شہر ہے جو لندن سے تقریباً تین گھنٹوں کی مسافت پر واقع ہے۔ جون 2005ء میں مجھے وہاں جانے کا موقع ملا۔ ایک دوپہر میں شہر کے ایک بڑے سے شاپنگ سنٹر میں کھڑا تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹھیٹھ پنجابی میں پوچھا: "محمود صاحب تساں کدوں آئے ہو"۔ میں نے حیرانگی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سردار جی کو مسکراتے پایا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ سردار جی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے بھی ٹھیٹھ پنجابی میں جواب دیا:

"سردار جی تہانوں غلط فہمی ہوئی اے میں محمود صاحب نہیں آں"۔

سردار صاحب کو اصرار تھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ سردار صاحب کا بات چیت کا انداز بڑا پُرکشش تھا۔ ہم بات چیت کرتے ہوئے دوکان سے باہر آئے اور سامنے پڑے بنچ پر بیٹھ گئے۔ سردار صاحب نے تعارف کرایا "میجر ریٹائرڈ امریندر سنگھ" میں نے جواباً اپنا تعارف رینک کے ساتھ کرایا تو سردار جی بڑے خوش ہوئے۔ وہ وہاں کے رہائشی تھے۔ سامنے سے دو کپ کافی لے آئے۔ پھر ہم دونوں باتوں میں مشغول ہو گئے۔ سردار صاحب کو کہیں جانا تھا تھوڑی دیر بعد معذرت کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اُن کا مہمان تھا لہٰذا سردار صاحب نے دوسرے دن مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی اور یہ اتنی پُرخلوص تھی کہ میں انکار نہ کر سکا۔

دوسرے دن میں دیے گئے پتہ پر پہنچا تو باہر سڑک پر سردار صاحب کو اپنا منتظر پایا لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ یہ گھر نہیں بلکہ گردوارہ تھا۔ گردوارے کے باہر جلی حروف میں لکھا تھا "GOD IS ONE" یہ پڑھ کر مجھے تسلی ہوئی کہ سکھ خدا پرست ہیں بت پرست یا لادین نہیں جو ہم یہاں انہیں سمجھتے ہیں۔ خدا کی ذات اور اس کی

واحدانیت پر ایمان رکھنے والے شخص کا میرے خیال میں احترام کرنا چاہیے لہٰذا مجھے اندر سے گردوارہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ سردار صاحب مجھے اندر لے گئے جہاں اس وقت لنگر جاری تھا۔ سردار صاحب نے مجھے ایک میز پر بٹھا کر میرے سامنے کھانے کا ڈھیر لگا دیا۔ پنجاب کی تمام ڈشز ساگ، مکئی کی روٹی، مکھن، لسی، حلوہ، اچار، سبزیاں وغیرہ سب کچھ۔

مجھے پتہ چلا کہ سردار امر بندر سنگھ وہاں انتظامیہ کے سینئر ممبر ہیں۔ میں نے کھانے سے معذرت کی تو وہ چائے اور برفی لے آئے جو بہت اچھی لگی۔ گردوارے کی میزوں پر لنگر کھانے والوں کا بہت رش تھا لہٰذا گپ کے لئے وہ مجھے ایک علیحدہ دفتر میں لے گئے جس کے ایک طرف ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ لائبریری میں بڑے بڑے سٹکرز لگے تھے "INDIA - QUIT KHALISTAN" یہ سٹکر پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ خالصتان تحریک تا حال زندہ ہے۔

سردار جی نے شاید اپنے دوستوں کو بھی میرے آنے کا بتا دیا تھا کہ ہمارے اندر آتے ہی چند ایک اُس کے اور بھی ساتھی اندر آ گئے اور ان میں زیادہ تر کلین شیو (مونے) سکھ تھے جنہیں ملنے کا پہلی دفعہ اتفاق ہوا۔ تمام سردار صاحبان نے میزبانی کا پورا فرض ادا کیا اور ہر موضوع بمعہ گولڈن ٹمپل پر حملہ کے کھلی گپ لگی۔ ان تمام میزبانوں میں مجھے سردار گنڈے سنگھ کا رویہ تھوڑا عجیب سا لگا۔ یہ ویسے تو مونے سکھ تھے اور پچھلے عرصہ چالیس سال سے انگلینڈ میں مقیم تھے میں نے محسوس کیا کہ سردار گنڈے سنگھ مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔ انہوں نے ملتے ہی مجھ سے پوچھا۔

''آپ بلوچ ہیں''۔ عام بات چیت میں انہوں نے کوئی خاص دلچسپی نہ لی بس ہر تھوڑی دیر بعد بلوچوں پر کوئی نہ کوئی سوال پوچھ لیتے۔ مثلاً بلوچ کتنا بڑا قبیلہ ہے۔ کیا بلوچ سارے فوجی ہوتے ہیں۔ کیا بلوچ بہت جنگجو ہوتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب لگا۔ مجھے احساس ہوا کہ سردار گنڈے سنگھ کے سوالوں کے پیچھے کوئی بات ہے ضرور۔ بالآخر مجبور ہو کر میں نے پوچھ ہی لیا۔ سردار صاحب بلوچوں کی کوئی خاص بات ہے جو آپ مجھ سے بار بار پوچھ رہے ہیں۔

سردار صاحب نے جواب دیا ''ہاں ہے۔ مجھے بلوچوں سے ملنے اور انہیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔'' میں نے دل میں سوچا خدا خیر کرے یہ تو کوئی سنجیدہ معاملہ لگتا ہے۔ بہر حال میں نے مسکرا کر کہا ''ہاں سردار صاحب میں بلوچ ہوں فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' میں دل میں ڈر رہا تھا کہ شاید کسی بلوچ نے سردار صاحب کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہوگی۔ بہر حال سردار گنڈے سنگھ نے بہت خفیہ انداز میں جو قصہ سنایا وہ یوں ہے۔

''ہمارا گاؤں ضلع امرتسر میں بڑی سڑک کے قریب ہے۔ ریلوے لائن بھی قریب ہے۔ 1947 تقسیم ہند کے وقت میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ ہماری نزدیکی سڑک پر ہر وقت چھوٹے بڑے مہاجرین کے قافلے گزرتے تھے۔ اُن میں پاکستان سے آنے والے ہندو اور سکھ بھی ہوتے اور پاکستان جانے والے مسلمان بھی۔ اکثر مسلمان مہاجرین کی بھری ہوئی ٹرینیں بھی گزرتیں جو کبھی کبھی ہمارے گاؤں کے نزدیک رُک جاتیں یا ریلوے لائن پر رکاوٹیں ڈال کر روک لی جاتیں۔ گاؤں کے لوگ انہیں دیکھنے کے لئے یا بعض اوقات مدد کے لئے اکٹھے ہو کر ادھر جاتے۔ تماشہ دیکھنے کے لئے ہم گاؤں کے بچے بھی ساتھ ہوتے۔ (سردار صاحب یہ بات گول کر گئے کہ یہ جتھے مسلمانوں کی مدد کے لئے نہیں بلکہ انہیں لوٹنے اور قتل و درندگی کے لئے جاتے تھے)۔

ایک دن مسلمان قافلے اور گاؤں کے سکھوں کے درمیان لڑائی ہو گئی۔ سکھوں کے پاس کرپانیں تھیں۔

قافلے میں خواتین اور بچے بھی تھے۔ جب لڑائی بڑھی تو شور و غل میں کچھ فوجی آئے جنہوں نے آتے ہی ہمارے لوگوں پر فائر کھول دیا جس سے ہمارے چند کھرو جوان جو سب سے آگے آگے تھے گر کر شہید ہو گئے۔ (یاد رہے کہ اس قسم کی موت کو سکھ بھی شہیدی کہتے ہیں) لہٰذا ہمارے لوگ وہاں سے فوری طور پر ادھر اُدھر ہو گئے۔ ہم بچے ساتھ والے کماد کے کھیت میں چھپ گئے۔ بعد میں پتہ چلا یہ بلوچ تھے (مراد بلوچ رجمنٹ کے فوجی) جو مسلمان مہاجرین کی حفاظت کے لئے ٹرین کے ساتھ تھے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ آئندہ ہر ٹرین کے ساتھ بلوچ ہوں گے۔ سڑک پر بھی بلوچ گشت کریں گے کہ کسی قسم کا خون خرابہ نہ ہو۔

بعد میں جب بھی وہاں سے قافلے گزرتے اچانک خواہ مخواہ بلوچ آ گئے۔ بلوچ آ گئے۔ ہم بچوں میں اتنا خوف تھا کہ ہم لوگ کھیتوں میں چھپ جاتے۔ ہمارے بڑے بھی اِدھر اُدھر ہو جاتے اور خواتین بھی گھروں میں چلی جاتیں۔ وقت گزر گیا۔ مہاجرین کے قافلے ختم ہو گئے لیکن بلوچ آ گئے۔ بلوچ آ گئے کا خوف زندہ رہا۔ لہٰذا مجھے بڑا شوق تھا کہ میں بلوچوں سے ملوں۔

"سردار صاحب مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے"۔ میں نے خلوص سے کہا۔ "1947 بہت پیچھے رہ گیا۔ یقین رکھیں بلوچ صرف دشمن ہی نہیں، بلکہ دوست بھی ہوتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ آئندہ ہم جب بھی ملیں گے بطور دوست ہی ملیں گے۔" مجھے سردار صاحب کی اس پُر خلوص سچائی پر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی کیونکہ سردار صاحبان بنیادی طور پر کھلے دل اور کھلے ذہن کے لوگ ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ تقسیم ہند کے وقت مسلمان مہاجرین کی بحفاظت آمد میں بلوچ رجمنٹ نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ فرض شناسی اور دلیری کی اعلیٰ مثال قائم کی حتیٰ کہ بلوچ کا لفظ ہندوستانی علاقے میں خوف و دہشت کی علامت بن گیا اور مسلمانوں کے لئے سلامتی کی ضمانت۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ بلوچ رجمنٹ کے اس شاندار تاریخی کردار کو محفوظ نہیں کیا گیا۔ اپنے اس کردار پر فوج کو فخر ہونا چاہیے تھا۔ بلوچ رجمنٹل سنٹر کو اپنے کارناموں کو یوں گمنامی کی گرد میں ضائع ہونے سے بچانا چاہیے تھا۔ میں سینئر ترین بلوچ جنرل سے اور بلوچ رجمنٹل سنٹر سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ تاریخ کے اس سنہری کردار کو تاریخ کے صفحات پر محفوظ کرنے کی ذمہ داری لیں کیونکہ ہماری آئندہ نسلوں کو اس کی تحت ضرورت ہے۔ (عسکریت پسند یاں)

☆☆☆

مفید باتیں

✱ وہ شخص سب سے زیادہ اندھا ہے جو خود دیکھنے کے لئے تیار نہ ہو۔

✱ ہم پہلے اپنی عادتیں بناتے ہیں پھر ہماری عادتیں ہمیں بناتی ہیں۔

✱ گناہ کا ترک کر دینا توبہ کی عطا ہے۔

✱ جو چاہتا ہے کہ بڑے بڑے کام کرنے والے اور اس میں جان کھپانے والوں سے آگے بڑھ جائے تو اُسے چاہیئے کہ گناہوں سے بچے۔

✱ حضرت عمرؓ سے ایک ایسی قوم کے بارے میں پوچھا گیا جو گناہ کا شوق رکھتے ہیں اور ان پر عمل بہت کرتے۔ فرمایا۔ "وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے آزما لئے ہیں ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے"۔

✱ جب تم کسی دوسرے کے کام آ رہے ہوتے ہو تو جانو کہ اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہے اور جب کوئی دوسرا تمہارے کام آ رہا ہوتا ہے تو سمجھو کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔

درِ زنداں

موم سے پتھر بن جانے والے ایک شریف النفس قبائلی نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت۔

☆---------- رزاق شاہد کوہلر 0345-1563185/E-mail.shahidkohler@gmail.com

صمد یار خان کی حویلی میں داخل ہونا ایسے ہی تھا جیسے کسی بھیڑیے کی کمین گاہ میں۔ وہ اپنی حویلی میں اپنے حفاظتی انتظامات کے ساتھ محفوظ بیٹھا تھا اور ہمیں خطرہ مول لے کر اندر داخل ہونا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہم اندھا دھند کارروائی کرنے کی بجائے ایک محفوظ حکمت عملی تیار کر کے آگے بڑھتے۔ میں نے سب سے اس بات کا اظہار کیا کہ ہمیں ایک لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے۔

"لائحہ عمل کیا ہوگا؟" میں جیسے ہی اندر داخل ہوا لالہ داؤد مجھ سے مخاطب ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس نے لاشعوری طور پر مجھے لیڈر تسلیم کیا ہوا ہو۔

"اس کے ساتھ یہاں کتنی تعداد میں محافظ ہو سکتے ہیں؟" میں نے یامین سے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا..... شاید پندرہ سولہ یا اس سے دو تین کم یا زیادہ۔"

"میرا خیال ہے ان کے آدمیوں کو دو حصوں میں بانٹنا پڑے گا؟" میں خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "اس طرح اس کی طاقت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور ہم آسانی سے ان پر قابو پالیں گے۔"

"وہ کیسے؟" لالہ داؤد اور بابا جان اکٹھے مستفسر ہوئے تھے۔

"یامین فون کر اسے بتا دے گا کہ اس کی کار خراب ہو گئی ہے۔ اسے لینے کے لیے گاڑی بھیجی جائے اور چونکہ اس کی کار ہمارے گاؤں کے مضافات میں خراب ہوئی ہے اس لیے احتیاطاً وہ دو گاڑیاں تو بھیجے گا۔ ان دو کاروں کے ساتھ سات آٹھ بندے ہوں گے...... ہم پہلے مرحلے میں ان بندوں پر قابو پائیں گے اور پھر انھی کی گاڑیوں میں بیٹھ کر اس کی کوٹھی پر پہنچ جائیں گے...... اندر گھسنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

"واہ... شاباش شیر دل خانا!... دل خوش کر دیا....." بابا جان خوشی سے چہکتے ہوئے مہر دل خان کی طرف مڑے۔ "دیکھا مہر دل خان!... پڑھ لکھ کر تیرا بھائی کتنا عقل مند ہو گیا ہے؟"

میرے جی میں آیا خوب کھلکھلا کر قہقہہ لگاؤں... مجھے بے عقل اور بیوقوف سمجھنے والے بابا جان آج میری عقل مندی کا اعتراف کر رہے تھے...... لیکن پھر مجھے حیا آ گئی..... بابا جان یقیناً مجھے اپنے رنگ میں رنگا دیکھ کر ساری ناراضیاں بھلا بیٹھے تھے... انھیں وہ القاب یاد نہیں رہے تھے جو وہ وقتاً فوقتاً مجھے دیتے رہے تھے۔

لالہ داؤد بولا۔ "شیر دل خان! یقین مانو تمہارا دماغ کسی سیکرٹ ایجنٹ کی طرح کام کرتا ہے۔ بہت زیادہ مشکل کام کو تم یوں سلجھا دیتے ہو کہ نہ چاہنے کے باوجود تمھیں کمانڈر بنانے کو جی چاہتا ہے۔"

"تھینکس لالہ جی!... میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے؟"

"بیٹا!..... خیال سے جانا اور اگر یہ آدمی کم ہیں تو میں چند منٹ میں مزید آدمی تیار کر سکتا ہوں؟"

"بابا جان!... آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے..... آپ بس امی جان کا خیال رکھنا آج ہم ان شاء اللہ اس خبیث کا ٹھکانا مکا کر آئیں گے۔"

"داؤد بیٹا!..... خیال رکھنا کہ کوئی جوان جوش میں آ کر ہوش نہ کھو بیٹھے۔" اس مرتبہ بابا جان نے لالہ داؤد کو نصیحت کی۔ میں ان کی بات پر حیران رہ گیا تھا... جوانوں سے ان کا اشارہ ہم دونوں بھائیوں کی طرف ہی تھا۔ ان کی پدرانہ شفقت نے میری آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔

داؤد لالہ نے کہا۔ "آپ بالکل بے فکر رہیں چچا جان!"

حجرے سے نکل کر میں نے یامین کو کہا۔ "صمد یار خان کو کال کر کے بتا دو کہ تمہاری کار دلاور خان کلے سے

نکلتے ہی خراب ہوگئی ہے اور وہ تجھے وہاں سے آ کر لے جائے۔"

یامین موبائل فون نکال کر صدیار خان کو کال کرنے لگا۔

"یس... ؟" صدیار خان کی مکروہ آواز سپیکر سے برآمد ہوئی۔ یامین نے میرے کہے بغیر موبائل فون کا سپیکر آن کر دیا تھا۔

"خان جی!... کار جواب دے گئی ہے... ہم آدھے گھنٹے سے اسے ٹھیک کرنے میں لگے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوئے۔"

اس نے پوچھا۔ "کس جگہ کھڑے ہوئے؟"

"دلاور خان کلے بمشکل فرلانگ بھر آگے۔" یامین نے جواب دیتے وقت میری طرف تائیدی نظروں سے دیکھا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے... میں دو جیپیں بھیج رہا ہوں... محتاط رہنا... تمھیں لینے منگور خان آئے گا، وہ ابھی کال کر کے تمھاری جگہ کے بارے تم سے پوچھے گا، اس کے ساتھ رابطے میں رہنا۔"

"ٹھیک ہے خان جی!..." یامین نے کہا اور صدیار خان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"ہم گاڑیوں میں بیٹھ گئے... سب سے اگلی کار میں مہر دل خان، لالہ داؤد، عدنان اور یامین سوار تھے۔ یامین کو عقبی نشست پر عدنان حیدر اور لالہ داؤد کے درمیان بٹھا دیا تھا۔ جبکہ مہر دل خان میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔

ہم تھوڑا سا ہی چل پائے تھے کہ یامین کا موبائل بجنے لگا...

یامین خان مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ظہور خان کی کال ہے۔"

میں سرعت سے ہدایت جاری کرتا ہوا بولا۔ "اٹینڈ کرو... اور اسے بتاؤ تم دلاور کلے عبور کرنے کے بعد پہلے سنگ میل پر رکے ہوئے ہو۔"

"جی ظہور خان!... ؟" اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔ حسب سابق موبائل کا سپیکر اس نے خود بخود آن کر دیا تھا۔

"یامین خان!... میں تمہارے پاس آ رہا ہوں... تم کس جگہ پر ہو؟"

"دلاور کلے کراس کر کے جو پہلا سنگ میل آتا ہے، اسی کے قریب ہوں۔"

"مطلب ہماری طرف موجود ہو اور ہمیں دلاور کلے کراس نہیں کرنا پڑے گا، ٹھیک ہے... ہم دو جیپوں میں سوار ہوں گے... اور بیس منٹ تک تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔"

میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ وہ آدمیوں کی تعداد معلوم کرے۔

اس نے پوچھا۔ "آپ کے ساتھ کتنے آدمی آ رہے ہیں؟"

"میرے علاوہ سات ہیں... ویسے کیوں پوچھا؟" ظہور نے اپنی تعداد بتلاتے ہوئے چونک کر سوال کیا۔

"آپ دو جیپیں ساتھ لا رہے ہیں... تو کیا سب دو جیپوں میں آ جائیں گے؟... ہم بھی چھ بندے تو بن رہے ہیں... تین قیدی اور تین ہم خود... کیا دو جیپوں میں چودہ آدمی آ جائیں گے؟" یامین خان نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا... اس رویے سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہمارا قیدی ہے یا وہ مجبوراً ہمارے لیے کام کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہے میں تیسری جیپ بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔" کہہ کر ظہور نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اپنے گاؤں سے باہر نکل کر میں نے کار پہلے سنگ

میکل کے ساتھ روک دی، اور لالہ داؤد کو کہا...
''آپ اپنی دو گاڑیاں سامنے بھیج دیں ... مہردل خان بھی انہی کے ساتھ ہوگا، انھیں بتا دیں کہ وہ روڈ سے ہٹ کر اپنی گاڑیاں درختوں کے جھنڈ میں چھپا کر رکھیں اور ان کا رخ عدنان والی کار کی جانب ہو، تاکہ جب میں اشارہ کروں تو وہ گاڑیاں سٹارٹ کر کے ان کی ہیڈ لائیٹس اس طرف روشن کریں۔ اس کے علاوہ ان کا کام ایک تو بروقت دشمنوں کی آمد سے مطلع کرنا ہے، دوسرا دشمن کو اس رستے سے فرار ہونے سے روکنا ہے۔ اپنی تیسری گاڑی آپ گاؤں کی طرف بھیج دیں تاکہ دشمن کسی بھی سمت فرار نہ ہو سکے، اس کا رخ بھی اسی سمت رکھیں تاکہ اس کی ہیڈ لائیٹس کو بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ باقی عدنان والی کار کا بونٹ کھول کر روڈ کے کنارے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ انھیں پتا چل سکے کہ کار واقعی خراب ہے۔ ہم خود یہاں درختوں کے جھنڈ میں رہیں گے... دو بندے سامنے چٹان کے پیچھے بھجوا دیں تاکہ وہ کسی بھی طرف فرار ہو سکیں... اور ہاں تمام کو بتا دیں کہ ایک سنگل فائر اشارہ ہوگا اس بات کا کہ تمام گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس روشن کر دی جائیں۔''

لالہ داؤد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے آدمیوں کی طرف بڑھ گیا۔ مہردل خان بھی اس کے ہمراہ تھا۔

میں اور عدنان یامین کو لے کر ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے لیٹ گئے..... حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے یامین کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے باندھ دیئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد لالہ داؤد بھی وہیں پہنچ گیا ان سارے انتظامات میں دس سے پندرہ منٹ لگے تھے۔

لالہ داؤد میرے ساتھ پوزیشن میں ہوتے ہی پوچھنے لگا...

''شیر دل خانا!..... آٹھ بندے تو ہماری طرف آ رہے ہیں، نجانے وہاں حویلی میں ان کے کتنے بندے باقی ہوں گے؟''

''لالہ! پہلے آنے والوں سے نبٹ لیں پھر ان کی تعداد بھی معلوم کر لیں گے۔''

''وہ کیسے؟''

میں اطمینان سے بولا۔ ''آنے والوں سے ایک بندہ بھی زندہ پکڑا گیا تو حویلی والوں کی تعداد کے بارے معلوم کرنا مشکل نہیں ہوگا۔''

''اوہ... واقعی۔'' داؤد لالہ مسکرایا۔ ''سامنے کی بات ہے میرا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا۔''

عدنان نے کہا... ''شیر دل خان کا دماغ اس معاملے میں خوب تیزی سے کام کرتا ہے، چند سیکنڈ میں محترم نے سارا سیٹ اپ ترتیب دے دیا ہے، یقین مانو یہ سب کچھ کرنے کے لیے جانے مجھے کتنا سوچنا پڑتا اور پھر بھی اتنا جامع منصوبہ نہ سوچ سکتا۔''

اسی وقت میرے موبائل پر مہردل خان کی کال آنے لگی، میں نے اٹینڈنگ بٹن پریس کیا۔

''لالہ! ... وہ لوگ ہمارے قریب آنے والے ہیں... تین گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس نظر آ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ محتاط رہنا۔'' میں نے رابطہ منقطع کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ پہنچنے والے ہیں۔''

عدنان نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ''ویسے فائرنگ کی آواز سن کر کہیں صمد یار خان چوکنا نہ ہو جائے؟''

میں مسکرایا۔ ''بیس کلو میٹر دور تک فائرنگ کی آواز جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالفرض اگر پہنچ بھی جاتی ہے تو بھی یہاں فائرنگ کی آواز معمول کی بات ہے۔''

لالہ داؤد کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ہمیں گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس نظر آنے لگی۔ گاڑیاں اسی وقت موڑ کاٹ کر سیدھی ہوئی تھیں۔ مہردل خان پارٹی اسی موڑ کے ساتھ چھپے ہوئے تھے۔ لالہ داؤد خاموش رہا۔ اگلے چند سیکنڈ میں وہ

ہماری کار کے قریب آ کر رک گئے تھے۔

''یاسین خان!......؟'' اگلی جیپ میں سے کسی نے زور سے پکارا۔ اور پھر جواب نہ پا کر دروازہ کھول کر دو آدمی نیچے اترے اور دائیں بائیں دیکھتے کار کے قریب پہنچے۔

''کار تو اسی کی لگتی ہے۔ ...مگر یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے؟'' کار کے قریب آنے والوں میں سے ایک اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

''کہاں جا سکتے ہیں؟'' دوسری جیپ سے ایک پریشان کن آواز برآمد ہوئی اور پھر اس میں سے بھی ایک آدمی نیچے اترا۔ ...اسی وقت میں نے اپنی کلاشن کوف کا رخ اوپر کی طرف کر کے ٹریگر پریس کیا۔ زوردھماکے نے فضا میں ارتعاش سا پیدا کر دیا تھا۔ صمد یار خان کے تمام آدمی سراسیمہ ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ اگلے چند سیکنڈ میں ہمارے ساتھیوں نے تینوں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس روشن کر دی تھیں۔ ...ان کی اپنی جیپوں کی لائٹس بھی آن تھیں مگر ہماری گاڑیوں کی لائٹس نے بیچ بیچ انہیں روشنی میں نہلا دیا تھا۔ میں زوردار آواز میں چلایا۔

''تم چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہو ...اگر کسی نے بھی غلط حرکت کی کوشش کی تو اسے گولی ماردی جائے گی ...تمام اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ سر سے بلند کر لیں۔'' میری زوردار آواز اور پھر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نے انہیں حقیقتاً ڈرا دیا تھا ...گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے افراد بھی باہر آ گئے تمام نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لیے تھے۔

میں عدنان سے مخاطب ہوا۔ ''یاسین خان کا خیال رکھنا۔ ہم ذرا نئے مہمانوں کا سواگت کر لیں۔''

وہ مسکرایا۔ ''ٹھیک ہے باس۔''

''چلیں لالہ!'' میں نے داؤد خان کو کہا اور ہم دونوں تینیں سونتے اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آئے۔ ہماری دیکھا دیکھی ہمارے آدمی چاروں طرف سے سامنے آ گئے۔ ...دشمنوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔

جیسے ہی ہم روشنی میں آئے انہوں نے مجھے اور لالہ داؤد کو پہچان لیا تھا... اور کیوں نہ پہچانتے کہ وہ صمد یار خان کے خاص افراد تھے اشکلوں ہی سے ظاہر تھا کہ وہ خباثت کے پتلے اور مجرمانہ ذہنیت کے لوگ ہیں۔

''شیر دل خان!...تم اچھا نہیں کر رہے۔ تمہاری دشمنی صمد یار خان سے ہے ہم......''

''چٹاخ......'' میرے زوردار تھپڑ نے صرف اس کی بولتی ہی بند نہیں کی تھی بلکہ اس کے ساتھ اس کی باچھوں سے بھی خون رسنے لگا تھا۔ اس کی آواز سے میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ ظہور خان ہے۔

''ظہور خان!...اگر میری دشمنی صمد یار خان سے ہے تو تم بھی اسی کے پالتو ہو؟ ...اور اب یہاں تمہاری آمد کا مقصد یقیناً ہمیں قیدی بنا کر ساتھ لے جانا تھا۔ پھر اپنی باری پر گلہ کیسا؟''

اس بار ظہور خان سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔

میں داؤد لالہ کے آدمیوں سے بولا... ''تمام کی تلاشی لے کر ان کے ہاتھ باندھ دو۔''

''یقیناً یاسین خان تمہارے ساتھ ملا ہوا ہے......؟'' ظہور خان نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''گن پوائنٹ پر اچھے اچھوں کی مت گم ہو جاتی ہے تو یاسین خان کس باغ کی مولی ہے کہ ہمارا ساتھ نہ دیتا۔'' یہ کہہ کر میں نے عدنان کو آواز دی۔ ''عدنان صاحب بہادر کو لے آؤ۔''

اگلے لمحے عدنان یاسین خان کو ساتھ لیے سامنے آ گیا۔ اس نے یاسین خان کے پاؤں کی رسی تو کھول دی تھی البتہ ہاتھ نہیں کھولے تھے۔

اتنی دیر میں داؤد خان کے آدمی اپنی کار سے پلاسٹک کی ڈوری لے آئے تھے..... چند لمحوں میں انھوں نے تمام کے ہاتھ پشت پیچھے باندھ دیئے۔

میں مہر دل سے مخاطب ہوا۔ "مہردل خان! .....ظہور خان کو ذرا سائیڈ پر لے آؤ تا کہ گپ شپ کر لیں۔"

"جی بھیا!......" کہہ کر اس نے ظہور خان کو کلاشن کوف کے بٹ سے ٹھوکا دیا....

"چل اوے۔" اور ظہور خان نے خاموشی سے مطلوبہ سمت قدم بڑھا دیئے تھے۔

"لالہ داؤد!......ہم ظہور سے حویلی کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں آپ ان میں کسی اور دوسرے سے پوچھ گچھ کریں... تا کہ ان میں سے کوئی غلط بیانی کرے تو ہمیں معلوم ہو جائے اور کم از کم اس غنیۂ کا بوجھ تو اس دھرتی سے کم کر دیں......"

"گڈ آئیڈیا!......" لالہ داؤد تحسین آمیز لہجے میں بولا اور ان میں سے ایک آدمی کو منتخب کر کے سائیڈ پر لے جانے لگا۔

میں عدنان کی طرف متوجہ ہوا۔ "اور ہاں عدنان بھائی!... ان کی جیپیں بھی روڈ سے نیچے اتار دیں گو اس وقت یہاں سے کسی گاڑی کا گزرنا مشکل ہے...... لیکن ناممکن نہیں ... کوئی اجنبی آ کر خواہ مخواہ بدمزگی پیدا نہ کر دے۔"

"او کے!...." کہہ کر وہ جیپوں کی طرف بڑھ گیا۔

مہردل خان اور میں نے ظہور خان کو تمام سے تھوڑا سا دور لا کر ہم نے زمین پر الٹا لٹا دیا

"چل بھئی... داؤد خان کی حویلی کے بارے ساری معلومات بکنا شروع کر دو ... وہاں کتنے آدمی ہیں، فرار کا کوئی رستا ہے کہ نہیں، ہتھیار کون کون سے ہیں... وغیرہ وغیرہ۔" میں نے جوتے کی نوک اس کی گردن پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "اور ہاں یاد رکھنا، ذرا سی غلط بیانی تمہاری گردن کو کندھوں پر سے غائب کر سکتی ہے۔"

"خان جی کے علاوہ چھ آدمی ہیں، تمام کے پاس کلاشن کوفیں ہیں ... ایک ایل ایم جی بھی ہے، چند دستی بم بھی ہوں گے اور فرار کے رستے سے تمہاری مراد اگر کوئی خفیہ سرنگ وغیرہ سے ہے تو ایسی کوئی بات نہیں۔"

"کتنے پہرہ دار ڈیوٹی پر ہوں گے؟"

"دو... ایک سامنے اور ایک عقبی جانب۔"

"ڈیوٹی کیسے ادا کرتے ہیں... چاک و چوبند یا ڈھیلے ڈھالے؟"

ظہور اطمینان سے بولا۔ "آج تو مستعد ہی ہوں گے... خان جی جو آیا ہوا ہے۔"

"صدیار خان کیا کر رہا تھا؟"

"کچھ پینے پلانے کا شغل شروع تھا اور کچھ ... ؟!" وہ خاموش ہو گیا۔

میں مستفسر ہوا۔ "اور کچھ ... کیا؟"

"ایک مشہور مغنیہ آئی ہوئی ہے ... جب بھی خان جی خوش ہوتا ہے ضرور بلاتا ہے۔ گانے بجانے کے بعد...... ویسے آپ خود سردار زادے ہیں، سرداروں کی شوقین مزاجی آپ کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی، اس لیے میں وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

"اس کے ساتھ سازندے ... اور طبلچی وغیرہ بھی تو ہوں گے؟" میں نے اس کے نادر خیالات پر کسی قسم کی رائے کا اظہار ضروری نہیں سمجھا تھا۔

"جی ہاں پانچ بندے ہیں ... لیکن وہ لڑائی بھڑائی سے نا آشنا اور بے ضرر قسم کے لوگ ہیں۔"

"ظہور خان! ... اگر تم نے ذرا بھی غلط بیانی سے کام لیا ہو تو ... !" میری دھمکی ادھوری ہونے کے باوجود مکمل تھی۔

ظہور خان دھیرے سے ہنسا۔ "سردار زادے! ...... میں ایک جرائم پیشہ شخص ہوں... صمد یار خان کے لیے اس لیے کام کر رہا تھا کہ وہ میری پشت پناہی کرتا ہے، پولیس سے تحفظ فراہم کرتا ہے اب لگتا یہی ہے کہ اس کے دن گنے جا چکے ہیں یہیں تو نمک حلالی میں سراسر میرا اپنا نقصان ہے اور نقصان کا سودا میں نہیں کیا کرتا۔ یوں بھی ہم جرائم پیشہ لوگ صرف غرض کے ہوتے ہیں، جہاں اپنا فائدہ نظر آئے وہی اپنا قبلہ بن جاتا ہے..... آپ جان بخشی کا وعدہ کریں اور مجھ پر اعتبار کریں تو یقیناً میں آپ کے لیے صمد یار خان سے لڑنے کو تیار ہوں، بس مجھے اتنا یقین دلا دو کہ آپ پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔"

"اگر تو نے ساری معلومات بالکل ٹھیک ٹھاک بتائی ہیں تو بے فکر رہو میں تمہیں کچھ بھی نہیں کہوں گا، صمد یار خان کا خاتمہ کرتے ہی تجھے رہا کر دیا جائے گا... رہی تمہاری پیشکش کا شکریہ، تمہاری یہ پیشکش ادھار رہی کبھی ضرورت پڑی تو ضرور تجھے کام دوں گا مگر صمد یار خان کے خلاف تم جتنی بھی نیک نیتی سے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو مجھے اعتبار نہیں آئے گا۔"

"اچھا ایک بات یاد رکھنا حویلی کے اندر جانے کے لیے سیمنٹڈ ٹریک بنا ہوا ہے جو مین گیٹ سے بیس گز پہلے شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے جاتے وقت اس ٹریک پر چڑھنے سے پہلے رک کر ایک دفعہ چھوٹا سا ہارن دینا اور پھر تین دفعہ ہیڈ لائٹس جلانا بجھانا...... یہ اندر داخل ہونے کا اشارہ ہے۔ اگر آپ سیدھے گیٹ پر چلے گئے تو شاید پہرے دار چوکنا ہو جائے کہ ہم طے شدہ طریقے کے مطابق اندر داخل نہیں ہو رہے... اور خیال رہے اس بات کا صرف مجھے ہی پتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "ویسے عام طور پر بھی اندر داخل ہونے کے لیے یہی طریقہ کار استعمال ہوتا ہے؟"

"نہیں! نہیں..... نہیں بلکہ عام طور پر یہ طریقہ کار استعمال نہیں ہوتا۔" وہ تھوڑا سا گڑبڑایا اور میں چونک گیا۔

"مہر دل!... جاؤ وہاں سے ایک اور آدمی پکڑ لاؤ۔"

"جی بھیا!" کہہ کر وہ قیدیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی واپسی تک میں گہری سوچ میں کھویا رہا.... ظہور نے بھی مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی... جیسے ہی مہر دل خان ایک دوسرے آدمی کو لے کر لوٹا اس نے ایک دم بولنے کی کوشش کی۔

"سردار زادے! یقین مانو....."

مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتا میرے پاؤں کی بھرپور ٹھوکر اس کے کندھوں کے بیچ لگی اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ میں دھاڑا.....

"اگر اس کے بعد ایک لفظ بھی منہ سے نکلا تو یقیناً وہ تمہاری زندگی کا آخری لفظ ہوگا۔" ظہور خان کے ساتھ میرا برتاؤ دیکھ کر آنے والا بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ بے.... تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ کسی قسم کی غلط بیانی نہ کرنا..... اب شروع ہو جاؤ؟"

وہ ہکلایا۔ "کک..... کیا بتاؤں؟"

"جب یاسین خان کا فون آیا تھا صمد یار خان کو اس وقت تم سب کہاں تھے؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "خان جی کے پاس ہی تھے... ایک گلوکارہ آئی ہوئی تھی اس کے گانے سن رہے تھے... اور ڈانس دیکھ رہے تھے۔"

"ساری تفصیل بتلاؤ۔"

وہ تفصیل بتلاتے ہوئے بولا۔ "ہم سارے خان کے پاس ہی بیٹھے تھے...... یاسین کی کال آئی تو خان جی کے حکم پر گلوکارہ نے ڈانس کرنا بند کر دیا۔ اس کے بعد

خان جی نے ظہور خان کو کہا کہ جاؤ یامین کی گاڑی ورا ور خان کلے کے پاس خراب ہوئی کھڑی ہے اسے فوری طور پر وہاں سے لے آؤ اور اپنے ہمراہ سات، آٹھ افراد اور دو گاڑیاں بھی لے جاؤ۔ پس ظہور خان نے وہیں پر ہمارا چناؤ کیا اور ہم وہاں سے باہر نکل آئے... چلنے سے پہلے ظہور خان نے یامین سے بات کی اور پھر اس کے کہنے پر ایک اور گاڑی بھی ساتھ لے لی۔"

میں نے اچانک پوچھا۔ "لیکن صمد یار خان نے ظہور خان کو اکیلے بلا کر کیا کہا تھا؟"

"ک... اکیلے... نہیں تو... ؟... اکیلے تو نہیں بلایا تھا؟"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "جھوٹ نہ بولو... مجھے پتہ چل گیا ہے؟"

وہ سراسیمہ ہو کر بولا۔ "بخدا انہیں بلایا تھا۔"

"اچھا... اب واپسی کے طریقہ کار کی وضاحت کرو؟"

"واپسی کا طریقہ کار... ؟ ایسا تو کوئی طریقہ کار نہیں ہے؟... غالباً آپ گھما پھرا کر میرے منہ سے کوئی ایسی بات اگلوانا چاہتے ہیں جس کے غلط ہوتے پر میری ساری باتوں کو غلط قرار دے سکیں؟"

"مجھے بالکل تمہاری باتوں پر یقین ہے بس کسی اور کی غلط فہمی دور کرنی تھی۔" یہ کہتے ہی میں نے ظہور خان کے پہلو میں ٹھوکر رسید کی۔ "چترا... تم سے واپسی پر ملاقات ہوگی۔"

اسی تام لالہ داؤد بھی وہاں پہنچ گیا... "ہو گئی پوچھ گچھ... ؟"

"ہاں لالہ!... صمد یار کے علاوہ چھ محافظ ہیں... کوئی ڈانسر وغیرہ بھی آئی ہوئی ہے... اس کے ہمراہ تین چار سازندے ہیں... تمام لوگ اس وقت گانے بجانے کے شغل میں لگے ہیں... بس سامنے اور عقبی جانب ایک ایک ہی فلہ ہے... تمام کے پاس کلاشن کوفیں موجود ہیں اور وہاں پر ایک ایل ایم جی بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ کسی نے کچھ اگلا ہو تو بتا دیں؟"

"نہیں تقریباً یہی باتیں ہوئی ہیں... بلکہ اس سے کچھ کم پوچھ گچھ ہی کرتا رہا ہوں۔"

"تو چلیں پھر... لیٹ ہی نہ ہو جائیں۔" تمام کو ایک بار پھر اکٹھا کر کے ہم نے اپنی گاڑیوں میں بٹھایا اور پھر میں مہرون خان سے بولا۔

"مہرون خان!... تم، عدنان اور لالہ داؤد کے تین آدمی... ان قیدیوں کو حجرے پر لے جاؤ ان کا حساب کتاب واپسی پر کریں گے۔"

"مگر لالہ... میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں؟"

"ٹھیک ہے... مگر ہوگا وہ جو میں چاہوں گا... اب بحث نہ کرو کہ ٹائم بالکل نہیں ہے۔"

"نہیں بھیا!... میں تو ضرور چلوں گا۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

اگلے لمحے میرا ہاتھ گھوما اور اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مارتے ہوئے میں چیخا۔

"تمہیں شاید قبائلی روایات بھول گئی ہیں... بڑا بھائی کہہ رہا ہے قیدیوں کو واپس لے جاؤ اور تم حجت بازی میں لگے ہو... جو کہا ہے وہ کرو۔"

وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھے بغیر کچھ کہے عدنان کی طرف مڑ گیا... میرے غصے کے پیچھے چھپی محبت اس کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی... میں پہلے بھی اسے ساتھ لانے کے حق میں نہیں تھا... دو بھائیوں میں سے کم از کم ایک بھائی تو پیچھے ہونا چاہیے تھا... اسی طرح عدنان کو بھی میں نے اس لیے واپس کر دیا تھا کہ وہ سارہ کا بھائی تھا... خدانخواستہ اسے کچھ بھی ہو جاتا تو سارہ دکھی ہو جاتی اور اس کا دکھ میں کہاں دیکھ سکتا تھا۔ اور یوں بھی

عدنان ہتھیاروں سے صرف اتنی واقفیت رکھتا تھا جتنی کوئی بھی عام آدمی رکھتا ہے کہ ٹریگر دبانے سے فائر ہوتا ہے اور بیرل کا رخ دشمن کی طرف کیا جاتا ہے اور بس۔ اس کے برعکس لالہ داؤد کے آدمی اچھے خاصے تربیت یافتہ تھے۔

لالہ داؤد کے تین آدمی مہردل خان کے حوالے کر کے ہم دشمن کی جیپوں میں بیٹھے اور جیپیں واپس موڑ کر صمد یار خان کی حویلی کی طرف چل پڑے .... میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا... صمد یار خان کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ مگر یہ بات یقینی تھی کہ میرے دل کی یہ دھڑکن کسی خوف کے باعث نہیں تھی... میرا خوف حیران کن طور پر زائل ہو چکا تھا، مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں برسوں اس طرح کی چھاپہ مار کارروائیاں کرتا رہا ہوں۔

یاسین خان کو ہم نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ وہ میرے اور لالہ داؤد کے ہمراہ اگلی جیپ میں موجود تھا۔ رستے میں ہم نے ساری ضروری تفصیلات طے کر لی تھیں۔

صمد یار خان کی حویلی جنگل کے اندر واقع تھی پختہ روڈ سے وہاں تک جانے کے لیے ایک کچا رستا بنا ہوا تھا، رستے کے دونوں جانب پتھر رکھ کر رستے کی نشاندہی کی گئی تھی، گو کثرت استعمال سے رستا ویسے ہی خوب واضح تھا شاید پتھروں کی لائن رستا واضح ہونے سے پہلے بنائی گئی تھی۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق ہم حویلی کی طرف بڑھتے گئے۔ مین گیٹ پر روشن بلب اندھیرے سے رستا کشی میں مصروف تھا۔ یقیناً یہ روشنی جنریٹر کی مرہون منت تھی۔ گیٹ کے قریب پہنچنے پر جنریٹر چلنے کی بھی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی۔ ہمارے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے گیٹ کھل گیا تھا۔ یقیناً اگر ہم رک کر لائٹوں کا اشارہ دیتے تو پہرہ دار چوکنا ہو جاتا...

یاسین کی رہنمائی میں ہم نے جیپ پارکنگ کی مخصوص جگہ پر روکی اور نیچے اتر کر میں اور لالہ داؤد کا ایک

آدمی، عقبی گارڈ کے مورچے کی طرف بڑھ گئے۔ جبکہ آخری جیپ والوں نے اندر داخل ہو کر فرنٹ پہرے دار کو قابو کرنا تھا۔

میں یامین سے عقبی مورچے کے پہرہ دار کی جگہ کے بارے تفصیل سے معلوم کر چکا تھا۔ مورچہ زمین سے چھ فٹ بلندی پر بنا ہوا تھا اور اس کی لمبائی چوڑائی اتنی تھی کہ اس میں بمشکل ایک چارپائی آ سکتی تھی۔ حویلی کی دیواریں نو فٹ سے بھی بلند تھیں۔ لالہ داؤد کے آدمی کا نام صفدر تھا۔ میر... دبے قدموں عقبی مورچے کے نیچے پہنچے مگر چوکیدار جیپوں کی آواز سن کر ادھر ہی متوجہ تھا...... مجھے پہلے سے اس صورت حال کا اندازہ تھا اس لیے میں اپنے پسٹل کی نال پر سائیلنسر چڑھا چکا تھا۔ حویلی کی عقبی جانب بھی روشنی کا خاطر خواہ انتظام موجود نہیں تھا اس لیے وہ ہمیں پہچان نہیں سکا تھا۔

"چہ تہ ہلکا!....." (کدھر لڑکے) اس نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

میں اطمینان سے بولا۔ "ستہ ملا وو تہ راغلے اوو؟" (آپ کو ملنے کے لیے آئے تھے)

"آپ کون؟" اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

میں نے پسٹل اس کی سمت تانا اور دو بار ٹریگر پریس کرتے ہوئے اس کی حیرانی کو گہری خاموشی میں بدل دیا۔ دونوں گولیاں اس کے سر میں لگی تھیں اس لیے اسے زیادہ تڑپنے کی مہلت نہ مل سکی۔

"چلو!..." میں نے صفدر کو کہا اور واپس مڑ گیا۔

آخری جیپ والوں نے سامنے والے گارڈ کو پکڑ کر باندھ دیا تھا۔ اندرونی عمارت سے گانے بجانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

لالہ داؤد نے کہا۔ "میرا خیال ہے تمام مستی میں ڈوبے ہیں... سیدھے اندر چلے چلتے ہیں؟"

میں نے مسکراتے ہوئے لالہ داؤد کی تائید کی۔

"میں بالکل آپ سے متفق ہوں۔"

"صفدر، اسلم، سلمان اور باقر..... تم چاروں عقبی اور سامنے والے مورچے میں جوڑی کی شکل میں چلے جاؤ گو خطرہ تو نہیں ہے لیکن پھر بھی خیال کرنا، کیونکہ کسی بھی قسم کی ناگہانی صورت حال در پیش آ سکتی ہے۔ یہ نہ ہو کوئی ہماری بھی تاک میں ہو اور بے خبری میں مارے جائیں...... باقی کے چاروں ہمارے ساتھ اندر جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب!......" صفدر نے کہا اور باقی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پسٹل جیب میں ڈال کر میں نے کندھے سے لٹکی کلاشن کوف ہاتھ میں تھامی اور آگے بڑھ گیا۔ باقیوں نے بھی چوکنے انداز میں میری تقلید کی تھی۔

میں نے اندرونی عمارت کا دروازہ جیسے ہی کھولا گانے بجانے کا تیز شور میری سماعتوں میں گونجنے لگا۔ پشتو کی ایک مشہور گلوکارہ لہک لہک کر گا رہی تھی۔

"قرارا راشہ ... قرارا راشہ۔" (اے میرے دل کے قرار آ جاؤ)

"ورزالو..... جانانہ... ورزالو" (آ گئے ہیں محبوب آ گئے ہیں) میں زوردار آواز میں بولا۔ اور گاتی بجاتی محفل میں ایک دم سناٹا چھا گیا، نہ صرف گلوکارہ کی آواز اس کے گلے میں گھٹ گئی تھی بلکہ سازندوں کے ہاتھ بھی ایک دم بے جان ہو گئے تھے۔

"واہ! بھلا یہ کیا بات ہوئی... خود بلا رہے تھے کہ آ جاؤ...... اور اب یہ حیرانی کیسی؟" میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ مگر وہ تمام ہونقوں کی طرح ہمیں گھورتے رہے۔

داؤد لالہ کے تمام آدمی گنیں تھامے خاموشی سے ہال کے چاروں کونوں میں پھیل گئے تھے۔

"قرارا راشہ! ذرا قریب آؤ؟" میں نے اس

مشہور گلوکارہ کو بلایا۔

وہ جھجکتے ہوئے میرے قریب آئی.....

"میری نگاہ میں تو تیری اچھی خاصی عزت تھی..... شکل سے بھی شریف لگتی ہو، مگر ایسی محفل میں..... قرارا راشدا..... بہت غلط جگہ دیکھی گئی ہو..... اس جیسے خبیث کے پاس..... "میں نے صدیار خان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ اور اس کے ساتھی اس قابل ہیں کہ.....؟" یہ بات میرے ہونٹوں پر تھی کہ وہاں صوفوں پر بیٹھے ایک آدمی نے صوفے کے سہارے کھڑی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا..... میں کنکھیوں سے صدیار خان کے آدمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا کیونکہ خود اس کے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ میں نے بظاہر اس گلوکارہ کی طرف متوجہ رہتے ہوئے اپنی گن کا رخ ہتھیار کی طرف ہاتھ بڑھاتے آدمی کی طرف کیا اور پھر ہال فائر کی زوردار آواز سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا فقرہ مکمل کیا۔

"انہیں گولی مار دی جائے۔" گولی اس کی چھاتی میں لگی تھی۔

"اس سے پہلے کہ ہتی بھی میرے ہاتھ سے ضائع ہو جائیں..... ان سے ہتھیار لے لو۔" میں نے صوفوں کے پیچھے کھڑے داؤد لالہ کے آدمی روشن خان کو کہا جو فائر کی آواز سے ایک دم چونکنا ہو گیا تھا ورنہ اس سے پہلے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گلوکارہ کو گھور رہا تھا۔

روشن خان نے آگے بڑھ کر ان کی گنیں اٹھا لیں۔

"صغیر خان!....." میں داؤد لالہ کے دوسرے آدمی سے مخاطب ہوا۔ "ان کی تلاشی بھی لے لو اور یہ کام آپ کو آتے ساتھ کرنا چاہیے تھا..... خواہ مخواہ میری ایک گولی ضائع کرا دی، پتا بھی ہے کلاشن کوف کی گولی کتنی قیمتی ہوتی ہے؟"

صغیر خان کھسیانی ہنسی سے آگے بڑھا اور ان کی تلاشی لینے لگا..... باقی تینوں بھی ان کی مدد کے لیے قریب آ گئے تھے۔

"لالہ!..... آپ نے شادی بھی نہیں کی تو کیا خیال ہے؟" میں نے آہستہ سے لالہ داؤد کو کہا۔

وہ مسکرایا۔ "شادی تو تمہاری بھی نہیں ہوئی شیر دل خانا!....."

"اوہ!..... مجھے تو بھول ہی گیا تھا..... خیر چھوڑیں....." میں دوبارہ اس گلوکارہ کی طرف متوجہ ہوا اور اطمینان سے بولا۔ "قرارا راشدا!..... ایسا ہے کہ اپنے تمام کپڑے اتار دو۔"

"کک..... کپڑے؟" وہ گھبرا گئی تھی..... لالہ داؤد بھی میری طرف حیرانی سے دیکھنے لگا۔

"جی محترمہ!..... اگر شرم آ رہی ہے تو باتھ روم میں جا کر اتار دو..... اصل میں مجھے تمہارے کپڑے چاہئیں..... وہ کیا ہے کہ بہت اچھے سلائی کیے ہوئے ہیں..... تم بے شک کوئی اور لباس پہن لو۔"

"مم..... میرے پاس اور لباس بھی موجود ہیں..... آپ ان میں سے کوئی پسند کر لیں وہ بھی بہت اچھے ہیں۔" اس نے شاید سچ مچ یہی سمجھ لیا تھا کہ مجھے اس کے لباس چاہئیں۔

"اچھا..... مطلب آپ پوری تیاری سے آئی تھیں..... یقیناً چند دن رہنے کا پروگرام ہوگا..... خیر مجھے کیا۔" میں نے شانے اچکائے۔ "آپ بس جلدی سے ایک اچھا سا جوڑا نکال لائیں۔"

"مم میرا سامان..... گیسٹ روم میں پڑا ہے۔"

"تو کیا..... جاؤ وہاں سے لے آؤ....." اسے کہتے ہوئے میں روشن خان اور صغیر خان کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ دونوں بھی اس کے ساتھ چلے جاؤ یہ نہ ہو، بیچ میں سے ذر گئے۔" اور وہ دونوں سر ہلاتے ہوئے اس کے ہمراہ ہو لیے۔

"تو.... ایم این اے صمد یار خان صاحب! آخر دوبارہ ملاقات ہو ہی گئی، تھوڑے سے فرق کے ساتھ... وہ کیا کہتے ہیں...

بلندی کا بھروسا کیا
کبھی ہم تھے جہاں تم ہو

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "شیر دل خان!... میں اپنی ہار تسلیم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ دلاور خان کا جانشین... اپنے رتبے کے مطابق مجھ سے سلوک کرے گا۔"

"بالکل... خان جی! مجھے آپ کا سلوک بھولا تو نہیں ہے.... گو میرے دوست ارشد کے جسم پر اب وہ زخم نہیں رہے جو تمہارے پالتو کتوں کی مہربانی سے لگے تھے مگر میرے دل پر لگے گھاؤ نہیں بھر سکے، میں نے بھی کبھی بھی نہیں ماری تھی... اب انسان کو قتل کرتے ہوئے بھی میرے ہاتھ نہیں کانپتے... یہ ساری آپ کی عنایات ہی تو ہیں۔" اسی وقت روشن اور صغیر.... گلوکارہ کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے.... گلوکارہ نے ہاتھ میں سرخ کپڑوں کا جوڑا اٹھایا ہوا تھا۔ ایک نظر ہال میں داخل ہونے والے کی طرف کر کے میں دوبارہ صمد یار خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"خیر میں کہہ رہا تھا...... میرے مسلک میں آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور عزت کے بدلے عزت ہے..... ارشد یہاں موجود نہیں کہ تمہیں چھیلی لگا سکے..... چلو وہ کام لالہ داؤد کے آدمی کر دیں گے... بلکہ وہ میں معاف کر دیتا ہوں... تم بس یہ قرار راشد کا لباس پہن کر دکھاؤ... دیکھیں تو وہ لباس جو تو نے قرار راشد کے جسم پر سے اتارا تھا وہ تیرے اپنے جسم پر کیسے لگتا ہے؟" یہ کہتے ہی میں نے اپنی کلاشن کوف لالہ داؤد کے حوالے کی اور اس گلوکارہ کے ہاتھ سے سرخ لباس لے کر صمد یار خان کو تھمایا۔

"شیر دل خان!... میں معذرت کرتا ہوں دیکھو...؟" مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا۔

"صمد یار خان!... تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ یہ لباس پہن لو... اگر یہ قبول نہیں تو میں تمہاری دونوں آنکھیں نکال دوں گا، اور وہ بدلہ ہوگا اس چیز کا جو تم نے مجھے چوڑیاں پہننے پر مجبور کیا تھا... کیا کہتے ہو؟"

"اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم اس کے بعد مجھے چھوڑ دو گے؟"

"میں اللہ پاک کی قسم کھاتا ہوں کہ اس کے بعد تجھے معاف کر دوں گا اور ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔"

"دیکھو شیر دل خان!..... تم قبائلی سردار کے بیٹے ہو... تمہارا والد آج تک اپنی زبان سے نہیں پھرا ہے نہ ہو؟... تم بعد میں اپنے الفاظ سے مکر جاؤ۔"

"میں دلاور خان کا جانشین ہی ہوں..... زبان دی ہے تمہیں۔"

"ٹھیک ہے...." صمد یار خان جوشیلے لہجے میں بولا.... اور جلدی سے اپنا کوٹ اتارنے لگا....

چند لمحے بعد وہ گلوکارہ کا لباس پہنے کھڑا تھا... گو وہ لباس اس پر کافی تنگ تھا، مگر کھینچ تان کر آ ہی گیا تھا۔

"بس یہی تمہاری بہادری تھی صمد یار خان!... یاد ہے اس دن تم کتنے قہقہے لگا رہے تھے؟" میرے لہجے میں بیتے دنوں کا دکھ در آیا۔ "تم نے جان کے خوف سے یہ بے عزتی قبول کی ہے... جبکہ میں نے اپنے دوست کی جان بچانے کے لیے اپنی ہتک قبول کی تھی، اپنی فیملی کو جھگڑے سے بچانے کے لیے اپنی مردانگی کو داؤ پر لگایا تھا... بخدا اگر صرف جان کا خوف ہوتا تو میں کبھی بھی چوڑیاں نہ پہنتا...... بہرحال میں نے زبان دی ہے اور مرد اپنی زبان سے پھرا نہیں کرتے... جاؤ میں نے تجھے معاف کیا..... بس میرا بدلہ پورا ہو گیا۔"

"تچ تچ!... میں چلا جاؤں...؟" صمد یار خان نے خوشی سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

میں اطمینان سے بولا۔ "جی بالکل... میری طرف سے آپ آزاد ہیں۔"

"چچا جان!... مجھ سے بھی تو پوچھیں نا؟" میرے ساتھ خاموش کھڑا لالہ داؤد پہلی بار اس سے مخاطب ہوا۔

میں اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

صمد یار خان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ ہکلایا "یہ... یہ دھوکا ہے... سراسر زیادتی ہے میرے ساتھ، شیر دل خان!... تم ایسا نہیں کر سکتے میرے ساتھ؟" زنانہ کپڑوں میں وہ بہت عجیب دکھائی دے رہا تھا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا خان جی!...... میں نے تو تمہیں دل سے معاف کر دیا..... اب تم جانو اور تمہارا بھتیجا...... میں اگر تمہیں چھوڑ بھی دوں تو جو چوری کی سزا... ... وہ تو خیر چور کو ملتی ہے بہر حال میں نے معاف کر دیا ہے اور میں نے تم سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ تمہیں داؤد خان بھی معاف کر دے گا۔"

اسے کہہ کر میں اس گلوکارہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"قرار اراشہ!... ذرا ادھر آؤ نا؟"

وہ تیزی سے میرے قریب آ گئی......

"بیٹھو ذرا گپ شپ کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور وہ اطمینان سے بیٹھ گئی..... اسے پتا تھا کہ ایک سردار زادے کی اہمیت کتنی ہوتی ہے..... ایسے شکار کی تلاش میں تو وہ ہمیشہ سرگرم رہتی ہیں۔

"آپ کا نام شیر دل خان ہے نا؟" اس نے لگاوٹ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "بابا جان نے تو یہی رکھا تھا.. ویسے آپ کسی بھی نام سے پکار سکتی ہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اسی وقت صمد یار خان داؤد خان سے مخاطب ہوا۔

"بھتیجے!... میرا یقین کرو... میاں کی موت قدرتی تھی... یہ سراسر الزام ہے مجھ پر..."

"تمہارا بھتیجا کہلانے سے بہتر ہے میں موت کو گلے لگا لوں... اور میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں، اس لیے تم چھٹی کرو۔" داؤد نے کلاشن کوف سیدھی کی صمد یار خان کا رنگ پیلا پڑ گیا اور جسم خوف سے لرزنے لگا تھا... موت کو سامنے دیکھ کر بزدل آدمی کی یہی حالت ہوتی ہے۔

"ایک منٹ لالہ!" ان کی انگلی ٹریگر پر سرکتی دیکھ کر میں نے انہیں آواز دی۔ اور وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔

"لالہ... یہ فقط آپ کا دشمن نہیں ہے... ایک اور شخص بھی ہے جسے اس نے آپ سے بھی کئی گنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے... کیا ہی خوب ہو کہ اس کا انجام اس شخص کی نظروں کے سامنے ہو؟"

"کون ہے وہ؟" لالہ داؤد نے کلاشن کوف کی نال جھکاتے ہوئے پوچھا۔

"گل رخ...!... یہ ان کے والدین کا بھی قاتل ہے، اس کے منگیتر یعنی آپ کے والد محترم کا بھی قاتل ہے، اس کی بیٹی کو اغوا کرا کے اسے ذہنی طور پر ٹارچر کرنے والا بھی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ گزشتہ چالیس سال سے جلاوطنی کی سزا بھی کاٹ رہی ہے۔"

"صحیح کہا شیر دل!... یہ اصل مجرم تو اسی کا ہے..."

"بس ٹھیک ہے... اسے یہیں قید کر دیتے ہیں...... یہاں ہمیں کسی طرف سے مداخلت کا اندیشہ نہیں... میر دل خان اور عدنان کو بھیج دیتے ہیں کہ وہ گل رخ کو یہاں لے آئیں۔"

"وہ یقیناً گاؤں پہنچ گئے ہوں گے..."

میں مسکرایا۔"نہیں... میں مہر دل خان کی رگ رگ سے واقف ہوں... وہ تمام ابھی حویلی کے مضافات میں موجود ہوں گے......"

"وہ کیسے؟" لالہ داؤد حیران رہ گیا تھا۔

"ابھی خود سن لینا۔" یہ کہہ کر میں مہر دل خان کو کال کرنے لگا۔

"جی بھیا!......؟" اس نے کال اٹینڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

مہر دل خان!... تم کہاں ہو؟"

"بھیا!... میں وہ...... دراصل عدنان بھائی کہہ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے آپ لوگوں کو ہماری ضرورت پڑ جائے تو اس لیے ہم بھی آپ لوگوں کے پیچھے پیچھے چلے آئے اور اس وقت حویلی کے باہر موجود ہیں۔ اگر حالات آپ کے قابو میں ہیں تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے لالہ داؤد کی طرف دیکھا... اور بولا۔"نہیں...... اگر آ ہی گئے ہو تو حویلی کے اندر آ جاؤ۔ قیدیوں کو بھی لے آؤ۔" رابطہ منقطع کر کے میں نے لالہ داؤد کو کہا......

"پہرے داروں کو بتا دو کہ اپنے آدمی آ رہے ہیں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔"

لالہ داؤد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے روشن خان کو پہرے داروں کے پاس بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد مہر دل خان پارٹی ہمارے درمیان پہنچ چکے تھے۔

ایک کار ان کے حوالے کر کے میں نے انھیں بغیر کسی تاخیر کے گل رخ کو لانے کے لیے بھیج دیا۔ باقی بندوں کو ہم نے ایک کمرے میں بند کر کے باہر پہرہ دار مقرر کر دیے۔ اور باقی آدمی آرام کرنے لگے۔ گلوکار کی نیت میرے ساتھ آرام فرمانے کی تھی لیکن میں نے اسے نرمی سے منع کر دیا... اسے حیرانی تو بہت زیادہ ہوئی تھی کہ میں اتنی شاندار آفر کو ٹھکرا رہا ہوں...... مگر وہ میری طبیعت سے واقف نہیں تھی ورنہ اسے حیرانی نہ ہوتی۔

☆☆☆

دوسرے دن رات گئے ہی وہ لوگ واپس پہنچے تھے۔ گل رخ کے ساتھ عدنان حیدر کا والد فرمان حیدر بھی آیا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کیا... داؤد زلہ کو دیکھ کر گل رخ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

جذباتی ملاپ کے ڈراپ سین کے بعد میں نے صمد یار خان کو وہیں بلا لیا تھا... وہ اب تک اسی لباس میں تھا... اسے دیکھ کر گل رخ کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے تھے۔

"دیکھ لو بدکردار انسان!... آخر تیری رسی کھینچ لی گئی نا؟......"

جواباً وہ خاموش رہا تھا... اس سے کوئی بات ہی نہیں بن رہی تھی۔

"اب بتا... کہاں گئی تیری وہ اکڑ... وہ غرور... ظالم تو نے اپنے خون کے رشتوں کو بھی معاف نہیں کیا... کاش میں تمھیں موت سے بدتر سزا دے سکتی۔"

صمد یار خان کا سر جھکا ہوا تھا... اس کے پاس اپنے مظالم کی کوئی توجیہ نہیں تھی۔

"داؤد بیٹا!... مجھے گن دو؟" گل رخ، داؤد خان سے مخاطب ہوئی۔ اور داؤد خان نے جلدی سے اپنی کلاشن کوف اس کی جانب بڑھا دی۔

"صمد یار خان!... کوئی آخری خواہش ہو تو بتا سکتے ہو؟" اس مرتبہ گل رخ کے غصیلے لہجے میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

"مجھے معاف کر دو گل رخ۔" صمد یار خان کے لہجے

میں دنیا جہان کی بے بسی سمٹی ہوئی تھی۔ "میرا ایک ہی بیٹا ہے اور اسے میری ضرورت ہے۔"

"بھول گئے خان جی! ... برسوں پہلے ایک بیٹی کو اپنے والدین کی ضرورت تھی... جب تم اس کی ضرورت کو پورا نہ کر سکے تو آج کس طرح یہ مطالبہ کر رہے ہو کہ تمہارے بیٹے کی ضرورت کو کوئی سمجھے گا؟"

وہ گڑگڑایا "میں رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔"

"یہ میرے بس سے باہر ہے۔" کہہ کر گل رخ نے ٹریگر دبا دیا۔ کلاشن کوف کا سیفٹی لیور برسٹ پر سیٹ ہوا تھا... گولیوں کی بوچھاڑ نے صمد یار خان کا سینہ چھلنی کر دیا تھا... وہ پیچھے گر کر تڑپنے لگا۔ گل رخ نے کلاشن کوف نیچے پھینکی اور داؤد خان سے لپٹ کر رونے لگی۔

"ہاں جی!... وہ اسی قابل تھا... اگر آپ اسے معاف کر دیتیں تب بھی اس نے اپنی پرانی حرکتوں سے باز نہیں آنا تھا۔ اچھا ہوا زمین ایک شیطان کے بوجھ سے آزاد ہو گئی۔"

گل رخ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

انھیں وہیں چھوڑ کر میں قیدیوں کے پاس چلا گیا... فائرنگ کی آواز سن کر تمام کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

"تو کیا خیال ہے بھئی تمام کا؟... تمہارا خان جی تو اپنے انجام کو پہنچا... اب تمہاری باری ہے۔"

ظہور خان جلدی سے بولا "شیر دل خان!... ہم حکم کے بندے ہیں، ہماری صمد یار خان سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے... اگر ہو سکے تو ہمیں معاف کر دو... ہم تمہارے خلاف یوں بھی کوئی ایکشن نہیں لے سکتے کہ ہم بہت سختی سے پولیس کو مطلوب ہیں..."

"ظہور خان!... تم نے تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی اور... دھوکا دینے والوں کو معاف کرنا اپنے ساتھ زیادتی کرنا ہے۔"

"مردار زادوے!... میری پوری کوشش تھی کہ جس کا نمک کھا رہا ہوں اسے بچا سکوں... اب اس میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی تو اس کی قسمت۔"

"روشن خان! ان تمام کو کھول دو... اور جانے دو... اگر آدھے گھنٹے بعد اس عمارت کے مضافات میں کوئی نظر آیا تو خود جواب دہ ہوگا۔"

میری بات سن کر تمام کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے تھے۔ روشن خان نے تمام کی بندشیں کھولیں اور انھیں حویلی سے نکال دیا... میں مہردل خان کو ساتھ لے کر حویلی کی تلاشی لینے لگے... حویلی میں ایک بڑا سا تہہ خانہ بنا ہوا تھا... وہاں بارود کا ذخیرہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے تھے۔ مہردل خان بارود کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھا۔

"مہردل! میرا خیال ہے اس حویلی کو دھماکے سے اڑا دیتے ہیں، تاکہ یہی سمجھا جائے کہ صمد یار خان دہشت گردی کا شکار ہوا ہے۔"

"بہت اچھا خیال ہے..." مجھے پیچھے سے لالہ داؤد کی آواز سنائی دی۔ جانے وہ کس وقت وہاں پہنچا تھا۔

"ٹھیک ہے لالہ!... آپ لوگ چلیں ہم بارود فٹ کر کے آتے ہیں"۔

"اوکے ہم حویلی سے باہر منتظر ہوں گے۔" کہہ کر لالہ داؤد باہر نکل گیا... مہردل خان نے بارود فٹ کیا اور فیوز کی تار بچھاتے ہوئے ہم باہر آ گئے۔ تمام لوگ حویلی کے صحن میں تیار کھڑے تھے۔

"اپنی گاڑیوں میں بیٹھ جاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔ جیسے ہی تمام بیٹھے میں نے انھیں چلنے کا اشارہ کیا، گاڑیاں ایک ایک کر کے حویلی سے نکلتی گئیں۔ آخری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر لالہ داؤد خود بیٹھا ہم دونوں بھائیوں کا منتظر تھا۔ مہردل خان نے فیوز کو آگ لگائی اور

ہم دوڑتے ہوئے کار میں بیٹھ گئے۔ داؤد خان نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھاوی......

"ہمارے پاس آدھے گھنٹے کا وقت ہے۔" مہر دل خان نے ہمیں اطلاع دی۔ "اس لیے اتنی تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

"فیوز کی ایک فٹ لمبی تار کے جلنے میں قریباً ایک منٹ لگتا ہے اور میں نے تقریباً تیس فٹ لمبی تار کو شعلہ دیا ہے اس لیے یقیناً آدھا گھنٹہ لگ جائے گا۔"

ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا... اور پھر جب ہم اپنے گاؤں پہنچے تو زور دار دھماکوں کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی... بیس کلومیٹر دور ہونے کے باوجود دھماکوں کی آواز یہاں تک پہنچ گئی تھی۔

گلوکارہ اور سازندوں کو ہم نے گاؤں سے باہر سے ہی رخصت کیا اور خود گھر پہنچ گئے۔ تمام گھر والے ہمارے منتظر تھے۔ داؤد خان کے آدمیوں کو حجرے میں چھوڑ کر ہم گھر چلے گئے۔ امی جان اور زرغونہ گل رخ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں... سائرہ اپنی امی سے مل کر خوشی سے آنسو بہانے لگی۔

بابا جان نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا......

"شیر دل خانا! ...... میں جانتا تھا کہ میرا بڑا بیٹا شیر ہے شیر بس دل کا تھوڑا نرم ہے۔"

"مطلب یہ کہ آپ مجھے جانور سمجھتے ہیں بابا جان! ....." میں مصنوعی خفگی سے بولا اور تمام ہنسنے لگے تھے۔

☆☆☆

منظر وہی دل کو موہ لینے والا تھا۔ چاروں طرف سایہ دار اور پھل دار درخت ٹھہرے تھے۔ وہاں پھولوں کی بھی بہتات تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا مگر اس کی تمازت میں چاند کی روشنی جیسی ٹھنڈک تھی۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی، جس کی سرسراہٹ میں ایک نغمگی تھی۔ ایسی نغمگی جو سماعتوں میں رس گھول دیتی ہے۔ وہ ایک نہایت ہی خوب صورت وادی تھی۔ اتنی حسین و جمیل جیسے جنت کا کوئی ٹکڑا۔ وہاں ایک شفاف پانی کا چشمہ رواں تھا۔ اس چشمے کا پانی اس قدر صاف و شفاف تھا کہ اس کی تہہ میں سنہری ریت اور رنگین پتھروں کے ٹکڑے تک چمکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ خوش آواز پرندے پھل دار درختوں پر چہک رہے تھے اور پھر مجھے وہ نظر آئی ...... وہی جو اس منظر کی جان تھی۔ میں دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا... اس کے ہونٹوں پر دلآویز تبسم ابھرا اور وہ مدھر آواز میں بولی۔

"اٹھ بھی جاؤ نا؟" اور میری آنکھ کھل گئی..... سائرہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی "تمہارے ساتھ ہی تو لیٹی ہوں۔ کہاں خوابوں میں ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟"

میں نے اس کے گرد اپنی بانہوں کا گھیرا ڈالتے ہوئے کہا۔ "ڈھونڈتا کہاں ہوں پگلی! ... اب تو میں نے تمہیں خوابوں میں بھی پا لیا ہے۔"

اس وقت دروازے پر دستک ہوئی اور بابا جان کی بھاری آواز سنائی دی......

"شیر دل خانا! ...... تو نے اذان کی آواز نہیں سنی؟"

"سن لی بابا جان! ... بس وضو کر رہا ہوں۔"

"بری اپ ٹائم شارٹ ہے۔" اور ان کے منہ سے انگلش کے الفاظ سن کر میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ سائرہ آج کل انہیں زبردستی انگریزی پڑھا رہی تھی اور وہ سائرہ کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ سائرہ کے علاوہ ان کی دوسری بہو بھی ان کی منہ چڑھی تھی..... جی ہاں آپ صحیح سمجھے ارشد کی بہن حنا کی شادی مہر دل خان سے ہوگئی تھی اور زرغونہ ارشد کی دلہن بن کر ان کے گھر پہنچ گئی تھی۔

◆..... ختم شد ......◆

سلسلے وار آپ بیتی

کلدیپ لالہ کے سیف سے ایک لاکھ پینتیس ہزار روپے اور سترہ
تولے سونا لے کر حویلی سے بھاگ گیا تھا اور لالہ جی کو غش آرہے تھے۔

قسط: 9 ☆ محمد رضوان قیوم

گھر کے جھگڑوں، دیگر مسائل کی وجہ سے لالہ نفسیاتی مریض بنتا چلا جارہا تھا۔ وہ گھر میں تائی سنتو کی ہر وقت کی بک بک سے تنگ آ کر اپنی حویلی کے داخلی دروازہ پر بنے چبوترے پر بیٹھ کر بڑبڑاتا رہتا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اتنا منتشر تھا کہ وہ بعض دفعہ ابا اور راہ گزرتے لوگوں سے ذرا ذرا سی بات پر خواہ مخواہ بے مقصد الجھنے لگتا۔ راہ گزرتے لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ محلے کے ہمدرد بزرگ یا ابا، لالہ کو سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کراتے تھے۔

ادھر سنتو تائی نے دیپا کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ توتی کی موت، حویلی میں ہونے والے پُراسرار واقعات، حویلی، کی دکانوں کی فروختگی اور دیگر نقصانوں کا سارا غصہ اس پر اتارا کرتی تھی۔

ایک دن سنتو تائی نے اپنے گھر کی الماری کا تالہ کھولا تو وہاں رکھے گئے پندرہ ہزار روپوں کی جگہ بڑا ناگوار بدبودار گہرے سبز رنگ کا گاڑھا سا مواد پڑا ہوا تھا۔ سنتو تائی نے اس منظر کو دیکھ کر واویلہ کرنا اور سر پیٹنا شروع کر دیا۔ یہ شور شرابہ سن کر اردگرد کے ہمسائے جمع ہو گئے۔ ہمارے گھر کا کوئی فرد وہاں نہیں گیا تھا۔ حویلی میں رونما ہونے والا پُراسراریت سے بھرا یہ بالکل انوکھا واقعہ تھا۔ یہ منظر دیکھنے والے ششدر رہ گئے۔ فوری طور پر دھونند اور مریال کو بلایا گیا۔

"بھگوان معاف کرے"۔ دھونند نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "اس حویلی میں اب کوئی بھوت آ گیا ہے اور یہ بدبودار مواد دراصل اس کا فضلہ ہے"۔

مریال نے وہاں موجود سب لوگوں کو کہا کہ تم لوگ سن لو کہ اس حویلی میں ایک بہت بڑا بھوت عملیات سے بھیجا گیا ہے..... لگتا ہے بڑی تباہی آنے والی ہے۔

"ارے کم بختو! تم لوگ اتنے عرصہ سے اس حویلی میں رہ کر کیا کرتے رہے ہو؟" وہاں کھڑا ایک بوڑھا بولا۔ "تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ تم اس حویلی کے اندر موجود پُراسرار مخلوق کو ڈھونڈ پاتے۔ تم لوگوں نے ابھی تلک کیا کیا ہے؟"

"بزرگو! ہمیں یہاں ہماری مرضی سے کوئی کام کرنے ہی نہیں دیا گیا"۔ مریال نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس حویلی میں موجود پلید مخلوق کو بھگانے کی جب بھی کوشش کی اسی وقت اس حویلی میں چند لوگوں نے درمیان میں آ کر مداخلت کی اور الٹی سیدھی باتیں کر کے ہمارے کاموں میں نہ صرف رکاوٹیں ڈالیں بلکہ جہاں تلک ہم نے اپنا کام کیا بھی تھا اُسے بھی ضائع کیا"۔

"خاص طور پر اس عورت نے"۔ دھونند نے سنتو تائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ اماں جی ہر وقت ہمارے سروں پر بدروح کی طرح سوار رہتی تھیں۔ انہوں نے ہمیں بہت دق کیا"۔

"ہائے، میں مر گئی میرے پندرہ ہزار روپے جنوں کے فضلہ میں تبدیل ہو گئے۔ بھگوان ان کا بیڑا غرق کرے"۔ سنتو نے گریہ زاری کے ساتھ کوسنوں کا طوفان اٹھا لیا۔ "ارے یہ کمبخت لاسا گاؤں سے اپنے کاندھوں پر اوپری مخلوق کو سوار کر کے لائی تھی"۔ اس نے دیپا کو لپیٹتے ہوئے کہا۔

"بہت ہو گیا ساس جی! میں اب چپ نہیں رہوں گی"۔ دیپا کی یہ تیز آواز پہلی بار حویلی کی دیواروں میں گونجی تھی۔

"ارے تیرے منحوس قدم اس حویلی میں کیا پڑے۔ اسی دن سے اس حویلی میں عذابوں، مسائل، تباہی کا آغاز ہو گیا۔ ارے لوگو! ہمارے نصیب پھوٹ گئے تھے اور یہ میرا عقل کا مارا بیٹا کلدیپ اس گوری چمڑی کے حسن والی کے سحر میں گرفتار ہوا تھا"۔

"میری بھی سنو بھائیو بہنو!" دیپا بچوں کی طرح روتے چلاتے ہوئے وہاں موجود لوگوں کو کہہ رہی تھی۔

"میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ کلدیپ میرے پیچھے آیا تھا اور اس نے میرے پتا کی منتیں کی تھیں کہ مجھے اپنی فرزندی میں لے لو اور دوسرے جو ابا میرے پتا جی نے اسے کہا تھا کہ بیٹا ہم غریب اور آپ صاحب حیثیت لوگ ہیں۔ ہمارا تمہارا کسی صورت میں ناطہ نہیں اور اگر تم واقعی بضد ہو تو میری بیٹی کے ہاتھ کے لئے سوال کرنے کے واسطے اپنے بزرگوں کو لاؤ اور میرے رشتہ کے لئے یہ لوگ بذات خود لاسا گاؤں آئے تھے۔ تب جا کر ان لوگوں کی منت سماجتوں کے بعد میرے پتا نے میری کلدیپ سے شادی کرائی۔ میں آج یہ بات بطور مجبوری آپ سب لوگوں کے سامنے کھولنا چاہتی ہوں کہ میں جب سے اس حویلی میں دلہن بن کر آئی ہوں میری ساس نے مجھ بے کس لڑکی کو غریب، گنوار، گھٹیا خاندان والی جیسے طعنوں کی ضربیں لگانے کے ساتھ مجھ پر یہ الزام بھی لگا رہی ہیں کہ اس حویلی میں جو چڑیل اور غالباً کسی جن بچے کا بسیرا ہے وہ میں اپنے گنوار پنے سے ساتھ لائی ہوں"۔

"ہاں، تو یہ بات کوئی جھوٹ ہے"۔ سنتو تائی نے درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا۔ "میں نے منندو جوتشی سے حساب نکلوایا تھا۔ اس نے مجھے بتلایا تھا کہ سنتو تیری بہو کے حسن پر کوئی جن عاشق ہے اور وہی اس کے ساتھ لگ کر تمہاری حویلی میں آ گیا ہے"۔

وہاں موجود ایک پڑھا لکھا محلہ دار ٹھٹھا مار کر ہنسا اور سنتو تائی کا دل جلاتے ہوئے بولا۔ "اری پگلی تو نے اس منندو جوتشی سے اس حویلی میں موجود غیر مرئی مخلوق کا حساب نکلوایا ہے، جس کی اپنی زندگی کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے۔ سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے الٹی سیدھی باتیں گانٹھ کر پیسے اینٹھتا ہے۔ یہ جادو، ٹونہ اور پری معاملات کو سمجھنا اس کے بس کا نہیں ہے"۔

دیپا جب زیادہ ہی روتے پیٹنے لگی تو سنتو تائی جو اپنے غصہ پر قابو رکھے ہوئے تھی اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

"گستاخ، زبان دراز تیری یہ جرأت کہ تو دو ٹکے کی چھوٹی ذات کی چھوکری میرے منہ لگے"۔

یہ دیکھ کر کلدیپ برق رفتاری سے آگے بڑھا اور اس نے سنتو تائی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں غصے سے پیچھے دھکیل دیا۔

"ماتا جی! بہت ہو گئی"۔ کلدیپ نے جلتے لہجے میں کہا۔ "اب آپ میری نظر میں ماتا کم ایک چنڈال زیادہ ہیں۔ آپ نے میری بے قصور، معصوم وفادار پتنی کو تسلسل کے ساتھ اپنے طعنوں، گالیوں کے تیروں سے چھلنی کر رکھا ہے"۔

"ہاں، ماتا جی! کلدیپ بھیا بالکل صحیح بولتے ہیں"۔ قریب کھڑے ماتا نے کہا۔ "آپ واقعی دیپا بھابی کو ہر وقت ناجائز تنگ کرتی رہتی ہیں"۔ ماتا نے جب اپنے بھائی کی بات کی تائید کی تو سنتو تائی اور بھڑکیں۔

"ارے وہ تو زن مرید ہے، تو بھی اپنی دیپا بھابی کے تلوے چاٹنے لگا ہے۔ ہاں، ہاں کیوں نہیں اس کمینی کی تائید کرے گا یہ تجھے تیرے چرس کے نشے، آوارگی کے لئے خرچہ جو دیتی ہے۔ میرے لئے آج سے تم دونوں ناخلف بیٹے مر گئے"۔

"ساس جی! آپ کے منہ میں خاک، بھگوان میرے پتی کی زندگی دراز کرے"۔ دیپا یہ جملہ کہتی روتی ہوئی کلدیپ کا ہاتھ چومتے ہوئے بولی۔

درمیان میں ایک محلہ دار بولا۔ "سنتو تائی! ہر وقت اپنے بچوں کو کوستے رہنے کے علاوہ ان کی موت کی پرارتھنا نہ کیا کر۔ بعض لمحے قبولیت کا ے بھی ہوتے ہیں"۔

"میرا تو خود اس نحوست اور کوفت بھری مسائل سے گھری حویلی میں جی ڈوبتا ہے"۔ دیپا نے آنسو بھرے لہجے میں کہا۔ "میں آج ہی اپنے بھائی کے ساتھ اپنی پھوٹی قسمت لئے واپس اپنے گاؤں چلی جاؤں گی"۔

"نہیں دیپا تم ایسا نہیں کرو گی"۔ کلدیپ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے من پر بھاری پتھر رکھنا پڑے گا"۔ دیپا نے کلدیپ کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا۔ "میرا اب ساس جی کے ساتھ گزارا نہیں ہے"۔

"آپ میری دیدی لوتن کی طرح ہیں"۔ ماتا نے آگے بڑھ کر کہا۔ "آپ نے ہمارے سارے پریوار کو بہت پیار دیا ہے۔ ہماری ماتا نے تو ہمیں صرف پیدا کیا ہے یا ہر وقت بے جا چیخ و پکار، ڈانٹ ڈپٹ اور کوسنے دے دے کر اس حویلی کے مسائل میں اضافہ ہی کیا ہے۔ بھابی آپ جہاں جائیں گی میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا"۔

"نہیں ماتا تم اپنی ماتا کے بیٹے ہو"۔ دیپا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا حق ان کے ساتھ رہنے کا ہے اور تم رئیس کھاتے پیتے گھر کے بیٹے ہو۔ یہاں تمہیں اچھا کھانا پینا اور پہننے کو اعلیٰ کپڑے سہولیات ملتی ہیں۔ ہمارے گاؤں کی غریب جھونپڑی میں تمہیں بہ مشکل دو روٹیاں ہی مل پائیں گی"۔

"نہیں بھابی تم بے شک وہاں بھوکا رکھنا روٹی نہ دینا لیکن میں کسی صورت میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا"۔ ماتا نے جذباتی انداز میں کہا۔

"جا مر گوبر کی کیڑی وہیں جا جہاں کا تیرا خمیر ہے"۔ تائی سنتو نے منہ بنا کر کہا۔ "تیرا چہرہ دیکھ کر میرا دل خراب ہوتا ہے"۔

"ہاں، ہاں میں جا رہی ہوں، میں یہاں زیادہ دیر رہ کر آپ کو پریشان نہیں کروں گی"۔ دیپا نے روتے ہوئے یہ کہا۔

"سنتو! بھگوان کے واسطے کچھ خیال کر"۔ اسی دوران ایک محلے دارنی بولی۔ "اتنی کشور دل کی نہ بن چل اپنی بیٹی جیسی بہو کی ذرا سی گستاخی کو معاف کر دے"۔

"تو چپ کر اور جا اپنے گھر دفع ہو"۔ سنتو تائی نے اس محلے دارنی کے لتے لیتے ہوئے کہا۔ "کاش! تیری اسکی زبان دراز منحوس اور چنٹ بہو ہوتی تو تجھے دن میں تارے نظر آتے"۔ پھر تائی سنتو نے اپنے سینے پر زور زور سے دوہتڑ مارتے ہوئے کہا۔ "ارے میرے دل کو چیر کے دیکھو اس میں چھلنی کے چھید ہوئے ہیں اور یہی کمبخت اس کا کارن ہے"۔

"بھگوان کی ناشکری نہ کر سنتو!" اس نے جواباً کہا۔ "تیری بہو اتنے اجلے رنگ اور قد بت کے لحاظ سے اتنی منفرد نقش و نگار کی مالک ہے یہ کاش واقعی میری بہو ہوتی اور دوسرے یہ کام کاج میں بھی بہت چست ہے۔ ایک میری بہو ہے جو قد کاٹھ، رنگ روپ سے بھگوان کی بنائی ہوئی عجیب سی شے ہے اور دوسرے وہ کسلمندی کا ڈھیر ہے"۔

"اچھا اچھا تو یہاں سے جاتی ہے یا میں دھکے دے کر تجھے یہاں سے نکلواؤں"۔ سنتو نے جب اس محلے دارنی کو یہ جملہ کہا تو اس نے بڑے ڈھیٹ پنے سے لکا تک زبان چلاتے ہوئے بڑی کڑی باتیں کیں۔

"اری میرے منہ سے اپنی بہو کی صفتیں سن کر تیرے تن بدن میں آگ لگ گئی نا۔ تیرا اور تیرے خاندان کا ہم لوگوں سے کیا چھپا ہے۔ ارے تو نے اور لالہ نے مکیش اور اس کے پریوار کا وہ حق دبایا ہوا ہے جس کا وہ صحیح معنوں میں حقدار تھا"۔

"جا جا، بڑی آئی مکیش اور میری بہو کی وکالت کرنے والی"۔ سنتو نے ہاتھ نچا کر کہا۔

اسی دوران دیپا روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کلدیپ، ماتا اپنی ماتا سے الجھنے لگے۔ سنتو دونوں بیٹوں کو کوسنے دینے کے ساتھ سینہ کوبی کرنے لگی۔

اتنے میں لالہ ان کے درمیان آیا اس نے اپنے سامنے پڑا ہوا لوہے کا بڑا پائپ اٹھا کر کلدیپ کو دیتے

ہوئے کہا۔ "لو اس سے میرا سر کھول دو، مجھے مار دو۔ کاش میں مر جاؤں"۔

سنتو تائی نے طاق میں پڑی مورتی کی جانب منہ کرتے ہوئے کہا۔ "اے بھگوان مجھے اٹھا لے اس روز روز کے سیاپے سے میری جان کی خلاصی تو ہو"۔

"پتا جی آپ مجھے میرے حصے کے روپے دیں میں نے بھی اس نحوست بھری حویلی میں نہیں رہنا"۔ کلدیپ نے لالہ جی سے کہا۔

"تو تن مرگئی تو اور دیپا اس حویلی کو چھوڑ کے جا رہے ہو"۔ لالہ نے ایک زوردار تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "ادھر مانا چرس اور شراب کے نشوں کی لت میں پڑ گیا ہے۔ یہاں پیچھے کون رہ جائے گا۔ چتا کی آگ کے منتظر ہم دونوں بڈھا بڈھی...... تو ایسا کر رسوئی سے ماچس لا کر اس حویلی کو آگ لگا دے"۔

"پتا جی! میں کیا اس حویلی کو آگ لگاؤں گا"۔ کلدیپ نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔ "اس حویلی میں آگ تو اس وقت سے لگی ہوئی ہے جب سے آپ نے اپنی ضد، ہٹ دھرمی کی وجہ سے چاچا شنکر دیال کا اصل حق دبا رکھا ہے جو ان کا جائز حق ہے"۔

"میں نے شنکر دیال کو اس کے حصے کے پیسے دے دیئے تھے"۔ لالہ جی نے کہا۔ "اس نے اپنا حصہ میرے آگے بیچ دیا تھا"۔

"لیکن وہ کچھ اور ہی کہتے ہیں"۔ کلدیپ نے کہا۔

"اسے بکنے دے"۔ لالہ جی نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

حویلی کی ملکیت کے لئے زور لگانے میں کسی صورت میں بھی اس حویلی کا ایک انچ بھی اس لالچی انسان کو نہیں دوں گا"۔

"پتا جی! آپ نے اپنی جلد بازی، بے وقوفی اور [illegible] کٹھال

بدمعاش کے ہاتھوں گیارہ کی گیارہ دکانیں کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر دی ہیں"۔ مانا نے نشے میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"لو آج تائی کا کیڑا بھی مجھے کچوکے مار رہا ہے"۔ لالہ نے جھنجلا کر کہا۔ "تم دونوں جاؤ میری بلا سے بھاڑ میں۔ جو اولاد سکھ نہ دے ایسے اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے"۔

◆◆◆

لالہ کی پہلے سے موجود مصیبتوں میں ایک اور اضافہ اس وقت ہوا جب کورٹ نے لالہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے بھائی شنکر دیال کو کل حویلی کا آدھا حصہ بطور حق فلاں تاریخ تک دے دے۔ اس عدالتی حکم سے لالہ نت کو پاؤں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ وہ بڑبڑا کر پریشانی کے عالم میں مولدر سنگھ اور راپا کو اپنے ساتھ لے کر سیدھا وکیل کے پاس پہنچا۔ وکیل نے اس کی پریشانی کے گراف میں مزید اضافہ کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ وہ فی الفور عدالتی حکم پر مقررہ تاریخ پر اس کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے بھائی کا جائز حق دے۔ ورنہ اسے مقررہ تاریخ کے بعد روزانہ کے حساب سے پہلے پندرہ دن تک بیس روپے جرمانہ ہوگا اور پھر سولہویں دن شنکر دیال شرما چاہے تو اس پر عدالت کے حکم کے خلاف حکم عدولی کا کیس بھی ہو سکتا ہے اور اس کی سزا کم از کم تین سال قید اور دو ہزار روپے جرمانہ ہو سکتی ہے۔ دوسرا راستہ وکیل نے لالہ کو یہ بتلایا کہ وہ عدالت کے اس حکم کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دے لیکن اس کیس میں اس کے جیتنے کے صرف 20 فیصد چانس ہیں۔ وکیل نے اپیل کا خرچہ بمعہ فیس -/2500 مانگا تھا۔

یاد رہے اس زمانہ میں سونا -/80 روپے تولہ تھا۔

وکیل نے لالہ کی پھرکی یہ بات کر کے بھی گھما دی کہ عدالت کا حکم یہ ہے کہ لالہ اپنے بھائی شنکر دیال شرما کو حویلی کی کل گیارہ دکانوں میں سے بھی حصہ دے۔ یہ دکانیں پہلے ہی اس نے کٹھال بدمعاش کے ہاتھوں فروخت کر

دی تھیں۔ یہ ایک اور دوپیچیدہ مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔

لالہ کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ابا اور مولدو سنگھ اسے طفل تسلیاں دے رہے تھے۔ بہت مشوروں، سوچ و بچار کے بعد لالہ کو یہ مشورہ ملا کہ وہ شنکر دیال کو وہ رقم دے کر جان چھڑائے جو اس نے دکانوں کی فروخت سے حاصل کی ہے لیکن اس میں سے بقول لالہ کے صرف -/60000 روپے رہ گئے تھے۔

دوسرا مشورہ اسے یہ ملا کہ وہ اپنی بقیہ رہائش والی حویلی بھائی کو دے دے اور یا جو رقم اس کے پاس موجود ہے اسے وہ اپنے پاس رکھے اور رہائش کے لئے کوئی مکان کرایہ پر لے لے۔ شنکر دیال سے ابا اور محلہ کے چند لوگ ملے اور اس سے اس کے حصہ اور لالہ کی حالیہ مالی و دیگر پریشانیوں پر بات کی گئی تو شنکر دیال نے بڑے غصہ اور ڈھیٹ پنے میں اس وفد کو ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں حویلی کی گیارہ دکانوں میں سے ساڑھے پانچ دکانیں لوں گا یا مجھے اس کی موجودہ قیمت لاکھ روپے ہے۔ تاہم اس میں خرچہ مقدمہ و دیگر اخراجات ملا کر ساڑھے تین لاکھ لوں گا۔ عدالت نے لالہ کو مقدمہ کا خرچہ جسے عدالتی زبان میں Cost کہتے ہیں وہ ڈالا تھا۔ تاہم اس حویلی کا اوپری حصہ لینے سے شنکر دیال نے یکسر انکار کر دیا تھا۔ اس نے یہ ایک اور عجیب مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ ابا اور محلہ کے دیگر بزرگوں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ لالہ کی مالی حالت اور حویلی کے حالات بہت ناگفتہ ہیں۔ وہ نوتن کی جوان موت سے نا صرف نڈھال ہے بلکہ ماتا کو بھی نشہ کی لت لگ گئی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس سے حویلی کے اندر موجود پراسرار مخلوق کا بھی ذکر کیا لیکن یہ سب سن کر بھی شنکر دیال کا سخت دل رتی برابر بھی نرم نہ پڑا۔

"مجھے لالہ کی بربادی اور پریشانی دیکھ کر دلی سکون ملا ہے"۔ اس نے کہا۔ "لالہ اسی قابل ہے"۔

"نہیں، شنکر دیال! اتنا کٹھور نہ بن"۔ ایک بزرگ نے کہا۔ "وہ جیسا بھی ہے، ہے تو بالآخر تیرا بھائی"۔

"شما کرنا بزرگو! میں آپ سے صرف اتنی بات کرتا ہوں"۔ شنکر دیال نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اس وقت کہاں گیا تھا میرا بڑا بھائی جس نے پتا کے مرتے ساتھ ہی مجھ کم عمر نابالغ چھوٹے بھائی کو حویلی کے حصہ کے نام پر مجھے چند ٹکے دے کر میری کمر پر لات مار کر حویلی سے باہر نکال دیا تھا۔ آپ کو کیا معلوم میں نے اور میری پتنی نے بچوں کے ساتھ کس کس در کی ٹھوکریں نہیں کھائیں۔ ارے ہم نے آشرم کے لنگر کا بھیک کا کھانا بھی کھایا ہے"۔

شنکر دیال یہ باتیں اتنے غصہ میں کر رہا تھا کہ اس کے منہ سے تھوک کی پھوار نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

"میری طرف سے لالہ کو پیغام دے دینا"۔ اس نے آخر میں سب بزرگوں کو کہا۔ "میں مقررہ تاریخ کو اپنا کورٹ کی جانب سے ملے شدہ حق لینے لازمی آؤں گا اور مجھے اگر میرا جائز حق نہ ملا تو میں وہ کچھ کر گزروں گا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا"۔

ان لوگوں نے جب یہ بات لالہ کو بتائی تو اس کے مزید ہاتھ پاؤں پھولے۔ وہ کبھی مشورہ کے لئے ادھر بھی ادھر جاتا۔ وہ جہاں بھی جاتا اسے یہی جواب ملتا کہ اسے عدالت کے حکم کے تحت شنکر دیال کو اس کا آدھا حصہ لازماً دینا پڑے گا۔

ادھر اُسے اپنے خاندان والوں کی طرف سے بھی مختلف انداز سے ذہنی طور پر پریشان اور تنگ کیا جا رہا تھا۔

دوسری طرف سنتو تائی اور دیپا کے درمیان سرد جنگ کا محاذ اس حد تک کھل گیا تھا کہ ہر لمحے دیپا اپنے گاؤں جانے کی دھمکی دے رہی تھی تو دوسری طرف کلدیپ مسلسل حویلی چھوڑنے اور کاروبار کے لئے روپوں کا تقاضا کر رہا تھا۔ سنتو تائی نے لالہ کو کہا کہ اگر تم نے حویلی کو مزید فروخت کیا تو میں چھت سے کود کر آتما ہتیا کر لوں گی۔

لالہ کی حالت اس چوہے جیسی ہو رہی تھی جسے کسی نے گھیر کر کسی بند جگہ میں مارنے کے لئے بند کر دیا ہو اور وہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے آخری بار ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔

لالہ نے بالآخر کسی سے مشورہ کئے بغیر چپکے سے حویلی کا بقیہ رہائش کا حصہ فروخت کرنے کے لئے علاقہ کے پراپرٹی ڈیلرز اور مالدار انویسٹر لوگوں سے رابطے شروع کر دیے۔ کچھ لوگ حویلی دیکھنے آئے بھی تو انہیں سنتو تائی نے کوسنے دے دے کر بھگا دیا۔ یا جنہوں نے اس اوپری حصہ کی قیمت لگائی وہ بالکل معمولی اور نہ ہونے کے برابر تھی لالہ نے اس حصہ کی ڈیمانڈ چار لاکھ کی تھی لیکن اسے ہر کوئی آسیب زدہ قرار دے کر زیادہ سے زیادہ اس کی قیمت ساٹھ یا ستر ہزار روپے لگا رہا تھا۔

کنجال بدمعاش کا کیونکہ ذاتی انٹرسٹ تھا اس کی تمام دکانیں حویلی سے ملحقہ تھیں تو اس نے لالہ رتن کو اسی ہزار روپے فوراً دینے کی آواز لگا دی۔ لالہ نے سودے کو اوپر اٹھانے کی بہت کوشش کی۔

بالآخر کنجال اس حویلی کے اوپری رہائش کے حصہ کو -/83000 روپے میں خریدنے پر راضی ہو گیا۔ اس نے کل سودا کی آدھی رقم اس کے حوالہ کر دی اور بقیہ رقم کے لئے اس نے چار ماہ کا وقت مانگ لیا۔

سنتو تائی کو جب حویلی کے فروخت ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے پوری حویلی کی در و دیواروں کو اپنے مخصوص انداز میں چیخ و پکار کر کے سر پر اٹھا لیا۔ سینہ کوبی کی، ماتھا پیٹا، کوسنے دیے اس کی فلک شگاف آوازیں دور دور تک گونجنے لگیں۔

"بھگوان کی بندی اپنا رونا دھونا بند کر میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں"۔ لالہ اس کی جتنی خیں سماجتیں کرتا وہ اتنا ہی بھڑکتی۔

"میں تو چلی مندر کے آشرم میں"۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "وہاں فقیروں کی لائن میں لگ کر بھیک مانگوں والا لنگر کھاؤں گی"۔

"نہیں نہیں تُو ایسا نہیں کرے گی"۔ لالہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہوش کر سنتو دیکھ اس طرح زمانہ میں میری رسوائی اور ٹوپی اچھلے گی"۔

"تیری ٹوپی تو پورے علاقہ میں پہلے ہی اچھل گئی ہے"۔ سنتو تائی نے ہاتھ جوڑتے لالہ کیدار ناتھ کو کہا۔ "تُو نے اپنی اور ہماری رسوائی کے لئے چھوڑا ہی کیا ہے"۔ سنتو تائی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سر پر چادر لی اور ہزار روکنے کے باوجود حویلی سے نکلنے لگی تو دیپا روتی چلاتی ہوئی درمیان میں آ گئی اور اس نے بھی واویلا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں ہی منحوس ہوں۔ اب بھی تم لوگوں نے اپنی اس بربادی کا دشمن مجھے ہی ٹھہرانا ہے"۔

"ٹھہرانا کیا ہے تُو ہے ہی ہماری بربادی اور رسوائی کی سراسر ذمہ دار"۔ دیپا اور سنتو تائی کے درمیان چیخ و پکار اور لڑائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ "تُو روز کہتی ہے کہ میں اپنے گاؤں لاسا جاؤں گی۔ جاتی بھی نہیں بس ہر وقت راگ الاپتی رہتی ہے کہ میں جا رہی ہوں۔ ارے تجھے اس حویلی جیسا آرام اپنے سڑے ہوئے گاؤں کے جھونپڑے میں کہاں ملے گا"۔

"معاف کرنا ساس جی!" دیپا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میرے گاؤں کا جھونپڑا میرے باپ کی ملکیت ہے یعنی اپنا ہے۔ اب تو آپ کے سر سے آپ کی تاج محل جیسی حویلی کی چھت بھی نہیں رہی وہ بک چکی ہے۔ آپ کہاں سر چھپائیں گی؟"

"قینچی کی طرح چلتی تیری لمبی زبان کاٹ دوں گی"۔ سنتو نے ڈپٹ کر کہا۔

دیپا نے ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا۔ "اچھا یہی بات ہے تو میں ابھی انہی کپڑوں میں اپنے گاؤں جانے والی بس میں سوار ہو جاتی ہوں"۔

''نہیں نہیں، بیٹی! بھگوان کے واسطے تم ہمیں مزید ذلیل و رسوا کرنے والا فیصلہ نہ کرو''۔ لالہ جی نے بات سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں سسر جی! آپ مجھے نہ روکیں''۔ دیپا نے کہا۔ ''یقین کریں میرے یہاں سے جانے کے بعد شاید اس حویلی میں امن شانتی، سکون آ جائے''۔

''لالہ! اس کلموہی، آسیب زدہ کو نہ روکو''۔ سنتو نے لالہ سے کہا پھر دیپا کو مخاطب کر کے بولی۔ ''جا دفع ہو تیرے جاتے منحوس قدموں کے ساتھ تیری ذات سے چمٹے جن بھوت ہماری جانیں تو چھوڑ دیں گے''۔

''سنتو! میں جتنا اس گھر اور پریوار کو سمیٹ کر رکھنا چاہتا ہوں تو اتنا ہی اسے بکھیرنے میں تلی ہوئی ہے''۔ لالہ نے سنتو سے کہا۔ ''کچھ بھگوان کا خوف کر، اس طرح بہو بیٹیوں سے باتیں نہیں کرتے''۔

''نہیں نہیں اب اس نحوست ماری کا منہ نہیں دیکھنا چاہتی''۔

''میں بھی دیپا بھابی کے ساتھ گاؤں جاؤں گا''۔ مانا درمیان میں نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا''۔

''لے جا اپنے اس چہیتے چڑیل کو اپنے ساتھ''۔ سنتو نے دیپا پر چلاتے ہوئے کہا۔

دیپا مانا کے قریب آئی اور اس نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے، روتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، میرے بھائی تم نے اپنی ماتا، پتا کے ساتھ رہنا ہے۔ ان بوڑھوں کو تمہارے سہارے کی اشد ضرورت ہے''۔

''نہیں بھابی انہیں نہ تو ہم بہن بھائیوں سے کوئی خاص محبت تھی اور نہ ہے''۔ مانا نے کہا۔ ''پتا جی کو اگر ہم دونوں بھائیوں سے انسیت ہوتی یا انہیں کچھ ہمارے مستقبل کا خیال ہوتا تو یہ یقیناً ہماری پوری حویلی بمعہ دکانوں کا ٹکے ماری کا سودا نہ کرتے۔ اب ہم دونوں بھائی گلیوں، کوچوں میں کتوں کی طرح دھکے کھاتے رہیں گے۔ دیکھ لیا نا چاچا نے اپنا حق عدالت کے ذریعہ مانگ لیا ہے۔ پتا جی نے اپنی ضد ہٹ دھرمی کے عوض اپنا سب کچھ کھو دیا ہے جو وہ اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتے تھے''۔

''گستاخ، بکواس کرتا ہے تجھے تمیز نہیں ہے کہ اپنے باپ کے سامنے یہ کس قسم کی بے ادبی والی باتیں کر رہا ہے''۔ لالہ کیدار ناتھ نے جھنجھلا کر ایک زوردار لات اس کی کمر میں جڑ دی۔

''آپ بے شک مجھے جان سے مار دیں میں نے ہر صورت میں بھابی کے ساتھ جانا ہے''۔ یہ گستاخانہ جملہ مانا نے سر چڑھ کر بولا تھا۔

تیری اگر یہی اچھا (مرضی) ہے تو جا مر، دفع ہو، میں اب تجھے روکنے سے بے بس ہوں''۔

دیپا تھوڑی دیر بعد حویلی سے چلی گئی۔ لالہ اور سنتو تائی کو اس پر اتنا غصہ تھا کہ انہوں نے اسے روکنے کا بھی نہیں کہا۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ مانا بھی اس کے ساتھ نکل گیا۔

کلدیپ کچھ دیر بعد حویلی میں واپس آیا اور اسے جب دیپا اور مانا کے یوں روٹھ کر جانے کا علم ہوا تو اس نے پوری حویلی سر پر اٹھالی۔ وہ بار بار سنتو تائی اور لالہ سے چیخ و پکار کر کے الجھنے لڑنے لگا۔

''تو بھی دفع ہو جا''۔ لالہ نے غصے سے مغلوب ہو کر کہا۔ ''میں تم لوگوں کی شکلوں اور حرکات سے اتنا عاجز آ گیا ہوں کہ میرا دل کرتا ہے کہ تم سب کو ذبح کر کے خود آتما ہتھیا کر لوں''۔

''یہ آپ کا مسئلہ ہے''۔ کلدیپ نے کہا۔ ''لیکن آپ میرا مسئلہ حل کریں''۔

''میں تیرا کیسا اور کون سا مسئلہ حل کروں۔ عقل کے اندھے تجھے یہ علم نہیں ہے کہ آج کل اس حویلی کے ساتھ کیا کٹھنائیاں اور کیا نرا چل رہا ہے۔ بھگوان کسی دشمن کے ساتھ بھی ایسے حالات پیدا نہ کرے جن کا سامنا ہم کر

رہے ہیں"۔

"بتاجی! اب میں اپنی ذرا اور زبان کھولوں گا تو آپ یہی کہیں گے کہ میں گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہوں"۔

لالہ نے اپنی مٹھیوں کو بھینچے اور شدید غصہ میں غراتے ہوئے کہا۔ "ہاں، ہاں تو بھی اپنے دل میں دبی بھڑاس نکال کر میرے اعصاب کو مفلوج کر"۔

"بتاجی! آپ نے اپنی ہی قسمیں میرے پریوار کی تباہی کے لئے خود ہی ایسے حالات بنائے ہیں"۔ کلدیپ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں تو کہتا ہوں....."

"ناخلف، آگے بول رک کیوں گیا؟" لالہ نے کلس کر کہا۔ "تو بھی مجھے کچوکے مار کر میرے سینے میں چھید کردے"۔

"بتاجی! آپ مجھے کاروبار کے لئے کم از کم پچیس ہزار روپے دیں"۔ کلدیپ نے کہا۔

"تو کہاں کاروبار کرے گا حویلی کی تمام دکانیں تو فروخت ہو چکی ہیں"۔ لالہ نے کہا۔

"بتاجی! آپ مجھے بتائیں کہ مجھے کاروبار کے لئے روپے دیں گے کہ نہیں؟" کلدیپ نے دوٹوک بات کی مگر لالہ ٹال گیا کہ کچھ نہ کچھ کروں گا۔ مجھے ذرا حالات پر قابو پا لینے دے۔

لالہ نے مکیش کو حویلی بلا کر اسے تاکید کی کہ وہ ہر حال میں مانا اور دیپا کو واپس لانے کی کوشش کرے۔ اُدھر کلدیپ نے بھی گاؤں جانے کا اعلان کر دیا تھا۔

ادھر محلے کے بزرگوں نے شنکر دیال کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ اس کی بقیہ رقم ہفتہ بعد دے دیں گے۔

دو روز گزر گئے لاسا گاؤں سے کوئی نہ آیا۔ اب تو لالہ جی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ بہو کے ساتھ دونوں بیٹے بھی ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے۔ لالہ تیسرے روز ہمارے گھر ابا کے پاس آیا اور اس نے ان سے مشورہ کیا تو ابا نے کہا۔

"تو آج کل جو بُرا کاٹ رہا ہے وہ دراصل تیری ضد اور اکڑ کا بویا ہوا ہے"۔ ابا نے اُسے لعن طعن کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسے مشورہ دیا۔ "تو کلدیپ کے ساتھ دیپا کو لینے جا اور اکیلے نہ جانا"۔ لالہ کیدار ناتھ کو ابا کی یہ تجویز پسند آئی اور مانا اور دیپا کو لینے لاسا گاؤں جانے پر راضی ہو گیا۔

◆◆◆

اُسی روز تقریباً شام کے وقت لالہ کی حویلی سے سنتو تائی اور لالہ کے رونے کی کان پھاڑ چلاّن کی آواز آنے لگی۔ پورے محلے کی طرح ہمارا خاندان بھی بڑبڑا کر حویلی پہنچے تو وہاں ہماری نگاہوں کے سامنے لالہ زمین پر پڑا بڑے بُرے طریقے سے اپنے ہاتھ کی مدد سے اپنا سر پیٹے جا رہا تھا۔

"اے بھگوان مجھے اٹھا لے، میں اب جینے اور زمانہ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا ہوں"۔

ادھر سنتو تائی اپنے روایتی انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں کا مکہ بنا کر سینہ پیٹتے ہوئے گریہ کر رہی تھی کہ ارے ہم لٹ گئے، ہمارا سب کچھ وہ کمبخت ناخلف کلدیپ نہ جانے کہاں لے کر بھاگ گیا۔

لالہ نے زمین پر گرے جب ابا کو دیکھا تو وہ جھٹ سے اٹھ کر ان کے سینے سے چمٹ کر روتے ہوئے بولا۔

"ارے عظیم یار! میرا کچھ نہیں بچا میں برباد ہو گیا"۔ وہاں موجود کسی محلے دار نے اسے اور سنتو تائی کو پانی پلوایا۔

"ارے کچھ منہ سے بھی پھوٹ کچھ پتا تو چلے تم لوگ یوں کیوں کلپ رہے ہو؟" ابا نے جھنجلا کر کہا۔

"کلدیپ میرے سیف کی چابی چرا کر اس کے اندر سے ایک لاکھ پینتیس ہزار اور ستر تولہ سونا لے کر حویلی سے بھاگ گیا ہے"۔ لالہ نے بڑی مشکل سے روتے ہوئے بتلایا۔

"لیکن تُو نے تو مجھے کہا تھا کہ تیرے پاس شنکر دیال کو دینے کے لئے بمشکل ایک لاکھ پانچ ہزار روپے پڑے ہیں اور اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ کلدیپ ایک لاکھ پینتیس ہزار روپے چرائے ہیں۔ یہ تیرے پاس بقیہ رقم کہاں سے آئی؟" اس کے ایک ہم عمر مخلص دوست نے تشویش کے عالم میں پوچھا۔

"وہ میں نے شنکر کو دینے کے لئے کسی سود خور سے تیس ہزار روپے سود پر لئے تھے"۔

"اچھا لالہ! تُو اب دل سے کیا چاہتا ہے؟" اسی آدمی نے پوچھا۔ "کیا تُو چاہتا ہے کہ تیرے اپنے ہی بیٹے کے خلاف پولیس میں پرچہ دینا چاہیے؟"

"ارے میں ان حالات میں بے بس ہو گیا ہوں۔ بھگوان کے واسطے مجھے اس گرداب سے نکلنے کے لئے کوئی راستہ دکھاؤ"۔ لالہ نے حویلی کے موجود سب لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

وہاں موجود زیادہ تر نے متفقہ طور پر اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ کلدیپ کے خلاف ایک لاکھ پینتیس ہزار روپے نقد اور ستر تولہ سونا کی چوری کا پرچہ پولیس میں دے دے۔

تھانہ میں جب کلدیپ کے خلاف چوری کا پرچہ دیا گیا تو وہاں موجود تھانیدار نے الٹا لالہ کیدارناتھ کو ذلیل کرتے ہوئے کہا۔ "شوم دی ہٹی، کتے دی چٹی"۔ اس نے بڑی مشکل سے رشوت لے کر پرچہ کاٹا۔

دو روز اور گزر گئے نہ کلدیپ کا کوئی پتا لگا نہ لاسا گاؤں سے کوئی آیا۔ لالہ اور سنتو تائی کو کئی غموں بھرے صدمات کے سانپ ڈس رہے تھے۔ ماتا، و پیا کا حویلی سے روٹھ کر چلے جانا۔ کلدیپ کی جانب سے کی جانے والی چوری اور پھر اس کا بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور سب سے بڑھ کر شنکر دیال کو وعدہ کے مطابق حویلی کے حصہ کی صورت میں بھاری رقم دینی تھی جو چوری ہو چکی تھی۔

علاقہ کی پولیس چوکی کا تھانیدار حویلی آیا اس نے بتلایا کہ ان کی اطلاع کے مطابق کلدیپ چوری کر کے اپنی پتنی اور بھائی کے پاس لاسا گاؤں کی جانب جاتا دیکھا گیا ہے لیکن ایک اور مشکل یہ آ پڑی ہے کہ آج کل برسات کی شدید بارشوں کی وجہ سے لاسا سمیت تقریباً 19 گاؤں میں شدید باڑ آئی ہوئی ہے لہٰذا وہاں انکوائری یا چھاپے کے لئے جانا ناممکن ہے۔ نیز اس تھانیدار نے بھی یہ بتلایا کہ لاسا گاؤں تک پہنچنے کے لئے فقط ایک کچا پکا مگر دشوار گزار راستہ ہے لیکن پہلے اس کے لئے اس سے پیچھے ایک گاؤں 8 میل دور تھسں جانا پڑے گا اور پھر اس رستے سے بھی بڑی مشکل سے لاسا گاؤں تک رسائی ہو گی اور وہ سارا علاقہ ڈاکوؤں، وارداتیوں پر مشتمل ہے۔

"تم اچھے خاصے صاحب حیثیت جائیداد والے اعلیٰ لوگ ہو"۔ تھانیدار نے بڑے تجسس سے سنتو تائی سے پوچھا۔ "تم کیسے ان بھیک منگوں میں گند کھانے گھس گئے تھے؟"

"بس تھانیدار صاحب! ہمارے نصیب ہی پھوٹ گئے تھے"۔ سنتو نے روتے ہوئے اس تھانیدار کو جواباً بتلایا۔ "کمبخت وہاں ایک آسیب زدہ گوری چمڑی والی نے میرے بے عقل بیٹے کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا لیا تھا"۔

ابھی تھانیدار حویلی میں بیٹھا ہی ہوا تھا کہ علاقہ کے تھانے کا ایک سپاہی وہاں آیا اور اس نے تھانیدار کو یہ ہولناک خبر سنائی کہ لاسا گاؤں کی جانب جاتی سڑک جو تھسں گاؤں میں ہے، وہاں سے ایک نوجوان کی لاش ملی ہے۔ خیال ہے کہ یہ لالہ کے بیٹے کلدیپ کی لاش ہو سکتی ہے۔ یہ خبر لالہ اور سنتو تائی پر کسی آسمانی بجلی کے گرنے سے کم نہ تھی۔ لالہ نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا اور دھڑام سے زمین پر اوندھے منہ گر گیا جبکہ سنتو تائی نے آخری حد تک آہ و فغاں کرنا شروع کر دیا۔ جس جس نے یہ خبر سنی وہ حویلی کی جانب دوڑا آیا۔

(ہر پل رنگ بدلتی یہ کہانی جاری ہے)

"یہ جتنی کوتاہ قامت تھی اتنی ہی فتنہ پرور تھی۔ اس نے اس بات کا بدلہ لینے کے لئے غلام محمد کو پھنسانے کی کوشش کی تھی۔

☆ عمر حیات
0347-5179266

ایڈیٹر صاحب! ایک سو فیصد سچی کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ ہمارے علاقے میں ایسی بے شمار کہانیاں بکھری پڑی ہیں جو"حکایت" کے مزاج کی ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ میری تعلیم کم ہے اور لکھنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ پھر بھی ٹوٹی پھوٹی تحریر میں کہانی ارسال ہے، اگر پسند آجائے تو خود ہی اس کی نوک پلک سنوار لینا۔

یہ 1992ء کا زمانہ تھا۔ میں آرمی میں تھا اور ان دنوں کھاریاں چھاؤنی میں تھا۔ فوج کی زندگی بڑی سخت اور ڈسپلن والی ہوتی ہے۔ ہمارے لئے باقاعدہ لنگر پکتا تھا اور اس کام کے لئے یونٹ میں دو لانگری موجود تھے۔ ایک کا نام رب نواز اور دوسرا غلام محمد تھا۔ دونوں بڑے اچھے کھانے پکاتے تھے اور خوش مزاج بھی تھے۔ رب نواز شادی شدہ تھا اور اس کی شادی کو ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ ہماری یونٹ کے قریب ہی فیملی کوارٹرز میں اپنی بیوی ناہید کے ساتھ رہتا تھا۔ ناہید یوں تو اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی لیکن قد کے معاملے میں مار کھا گئی تھی۔ اس کا قد چار فٹ سے تھوڑا ہی زیادہ ہو گا لیکن سڈول بدن تھی۔

ایک روز دن کے دس بجے کا وقت ہو گا۔ تمام فوجی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ جب اچانک فیملی کوارٹرز کی طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہماری یونٹ اور فیملی کوارٹرز کے درمیان صرف ایک سڑک موجود تھی۔ ہم یہ چیخ و پکار سن کر فیملی کوارٹرز کی طرف بھاگے۔ وہاں اور لوگ بھی ایک کوارٹر کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ قریب جا کر صورت حال معلوم کی تو یہ بات سامنے آئی کہ رب نواز نے اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا لی ہے۔ ہم نے آگے جا کر دیکھا تو رب نواز بہت بُری طرح جل کر مر چکا تھا اور اس کی لاش ناقابل شناخت ہو گئی تھی۔

... کرنل صاحب ... نواز کے والدین کو اطلاع بھجوا دی کہ ان کے بیٹے نے خودکشی کر لی ہے اور وہ آ کر اس کی لاش وصول کر لیں۔ رب نواز کے خاندان والے آئے اور ضابطے کی کارروائی کے بعد لاش اپنے آبائی گاؤں لے گئے۔

رب نواز کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ خاصے دنوں تک ہماری یونٹ میں اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تر ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ رب نواز نے اپنی بیوی کی حرکتوں سے تنگ آ کر خودکشی کی ہے اور یہ بھی کہ ناہید کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ ناہید کی شادی رب نواز کے ساتھ زبردستی کی گئی تھی، اس میں ناہید کی مرضی نہیں تھی۔ چند ماہ تک یہ موضوع چھتا رہا پھر آہستہ آہستہ ہم اس بات کو بھولنے لگے۔ اس طرح تقریباً ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔

اچانک ایک دن ہماری یونٹ میں اس خبر نے کھلبلی مچا دی کہ رب نواز مرحوم کے باپ نے یونٹ میں درخواست دی ہے کہ اس کے بیٹے نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے لہٰذا اس سارے معاملے کی نئے سرے سے انکوائری کی جائے اور ناہید کو شامل تفتیش کیا جائے۔

اصل بات یہ تھی کہ رب نواز کے باپ کو کسی نے اطلاع دی تھی کہ ان کی بہو کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے اور وہ اِدھر اُدھر دوستیاں لگانے والی عورت تھی۔ شک تھا کہ ناہید نے کسی آشنا کے ساتھ مل کر رب نواز کو قتل کروا دیا ہو گا۔

اس کیس کی انکوائری ہمارے کرنل صاحب کے سپرد کی گئی۔ کرنل صاحب بڑے جہاندیدہ اور فہم و فراست رکھنے والے انسان تھے اور ڈسپلن کے بڑے پابند تھے اور اپنے ماتحتوں سے بھی بڑی سختی سے عمل کراتے تھے اور جو خلاف ورزی کرتا اس کو ایسی سزا دیتے کہ دوسروں کے لئے عبرت کا باعث ہو۔

بیوہ ہونے کے بعد ناہید اپنے والدین کے پاس

چلی گئی تھی۔ اس کو یونٹ میں بلوالیا گیا۔ وہ آئی تو خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ کرنل صاحب کے رعب نے اس کو بالکل ہی حواس باختہ کر دیا۔ دوران تفتیش اس نے کرنل صاحب کو چکر دینے کی کوشش کی لیکن وہ عام سی دیہاتی عورت زیادہ دیر کرنل صاحب کے سوالات کا مقابلہ نہ کر سکی اور تسلیم کرلیا کہ رب نواز نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے قتل کیا گیا۔

اس نے بیان میں بتایا کہ یونٹ کے دوسرے لانگری غلام محمد کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی تھی جو بڑھتے بڑھتے ناجائز تعلقات تک پہنچ گئی تھی۔

''میرا خاوند لانگری تھا'' ۔ناہید نے کہا۔''اس لئے وہ صبح سویرے یونٹ میں چلا جاتا تھا اور پھر مغرب سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں ہوتی تھی۔ یہ اس کا پکا معمول تھا۔ اس عرصے کے دوران کسی وقت غلام محمد کوارٹر میں آ جاتا اور ہم رنگ رلیاں مناتے۔ اس روز بھی غلام محمد دن کے دس بجے کے لگ بھگ میرے ساتھ موجود تھا جب اچانک باہر سے کسی نے گھنٹی بجائی اور اس کے ساتھ ہی رب نواز نے میرا نام لے کر کہا کہ ناہید دروازہ کھولو.....

غلام محمد اندر میرے ساتھ تھا۔ باہر نکلنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کرلیا اور غلام محمد سے کہا کہ ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ رب نواز کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے.....

''غلام محمد مان گیا۔ میں نے اسے دروازے کے پیچھے چھپنے کو کہا اور خود کنڈی کھول دی۔ جونہی رب نواز اندر داخل ہوا، دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے غلام محمد نے رب نواز کے گلے میں بازو ڈال کر جکڑ لیا۔ میں نے اس کی مدد کی اور ہم نے مل کر اس کا کام تمام کر ڈالا''۔

ناہید کے بیان کے بعد غلام محمد کو گرفتار کرنا ضروری تھا۔ غلام محمد بھی اسی یونٹ میں لانگری تھا، اس لئے فوراً ہی اسے گرفتار کرلیا گیا اور ہماری یونٹ کے کوارٹر گارڈ میں بند

فرمانِ قائداعظمؒ

''الفاظ کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو اعمال کو ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ملک کے دفاع اور قوم کی سلامتی کے لئے میدان میں اتریں گے تو اپنی روایات کو برقرار رکھیں گے۔''

کر دیا گیا اور اس کی نگرانی کے لئے گارڈ تعینات کر دی گئی۔ میں بھی اس گارڈ میں شامل تھا۔

کیس چلا۔ غلام محمد سے بھی کرنل صاحب نے تفتیش کی اور اسے اقبال جرم کرنے کو کہا لیکن غلام محمد نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے رب نواز کو قتل کیا ہے۔ پورا ایک مہینہ انکوائری چلتی رہی اور کرنل صاحب نے ہر حربہ استعمال کرلیا لیکن غلام محمد کا ایک ہی جواب تھا۔

''میں بے گناہ ہوں سر!'' غلام محمد ایک ہی بات کہتا تھا۔''میرا اللہ مجھے اس کیس سے ایسے نکالے گا جیسے مکھن میں سے بال''۔

جب کرنل صاحب نے اس سے پوچھا کہ ناہید نے اس کا نام کیوں لیا ہے اور یہ کہ ناہید کو اس کے ساتھ کیا دشمنی ہے تو اس کے جواب میں غلام محمد نے ایک اور ہی بات سنا دی۔ غلام محمد نے بتایا کہ ناہید رب نواز کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ غلام محمد کو بڑی لگاوٹ بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی اور اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ غلام محمد ایک شریف اور نیک انسان تھا اس لئے اس نے پہلے تو ناہید کو نظر انداز کیا مگر جب وہ بے شرمی پر اتر آئی تو غلام محمد نے اس کی خوب بے عزتی کی اور یہ بھی کہا کہ اگر وہ باز نہ آئی تو وہ اس کے کرتوت سے رب نواز کو آگاہ کر دے گا۔

ناہید جتنی کوتاہ قامت تھی اتنی ہی فتنہ پرور تھی۔ اس نے اس بات کا بدلہ لینے کے لئے غلام محمد کو پھنسانے کی کوشش کی تھی۔

یہ تو غلام محمد کا بیان تھا۔ اصل حقیقت کیا تھی، یہ کسی کو معلوم نہ تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ کرنل صاحب کو اللہ نے بہت فہم و فراست عطا کی تھی وہ غلام محمد کے اعتماد اور اطمینان سے سمجھ گئے کہ ضرور غلام محمد بے گناہ ہے مگر اس کی بے گناہی ثابت کیسے ہو۔ بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کرنل صاحب اس بات کی کھوج میں لگ گئے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

بالآخر کرنل صاحب نے ناہید کو دوبارہ تفتیش کی چکی میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ صرف وہی ایک تھی جو اصل بات جانتی تھی۔ اگر غلام محمد کا بیان درست تھا تو پھر ناہید کا بیان سراسر جھوٹ پر مبنی تھا۔ ایک رات میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ کرنل صاحب دفتر آ گئے اور مجھے بلا کر کہا کہ BHM کو کہو کہ وہ اسی وقت گارد ساتھ لے کر جائے اور ناہید کو دفتر لے آئے۔

ہم سب حیران تھے کہ یہ رات کے وقت کرنل صاحب کو کیا سوجھی ہے اور پتہ نہیں کیا مسئلہ بن گیا ہے۔ فیملی کوارٹرز نزدیک ہی تھے جہاں ناہید کو نگرانی میں رکھا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ناہید کو کرنل صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ کرنل صاحب نے ہم سب کو دفتر سے باہر کھڑا ہونے کو کہا۔ ہم باہر کھڑے ہو گئے جہاں سے اندر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''مجھے یقین ہے کہ غلام محمد بے گناہ ہے''۔ کرنل صاحب کی آواز آئی۔ ''جو سچ ہے وہ اُگل دو، میں تمہیں اس کیس میں سہولت دوں گا...... اور کان کھول کر سن لو اگر میں نے خود حقیقت معلوم کر لی تو پھر تمہارا بہت بُرا حال کروں گا''۔

''آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟'' ناہید کی نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔ غالباً کرنل صاحب نے جان بوجھ کر یہ وقت چنا تھا پوچھ گچھ کے لئے۔ اس وقت ملزم سے اگلوانا آسان ہوتا ہے۔

''مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے ناہید!'' کرنل صاحب نے کہا۔ ''دفتر سے باہر چار جوان پہرے پر کھڑے ہیں۔ اگر تم نے زبان نہ کھولی تو میں تمہیں ان کے حوالے کر کے خود چلا جاؤں گا۔ پھر جو تمہارے ساتھ ہوگا، خود ہی سوچ لو۔ اگر تم مر بھی جاتی ہو تو مجھے کوئی پروا نہیں''۔

میں جانتا تھا کہ کرنل صاحب ایسا کبھی بھی نہیں کریں گے۔ وہ نہایت سلجھے ہوئے اور دیندار آدمی تھے۔ وہ صرف ناہید کو ڈرانے کے لئے ایسا کہہ رہے تھے...... اور ناہید واقعی خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس نے جو بیان دیا اوہ میں مختصراً بیان کر رہا ہوں۔

شادی سے پہلے ناہید کے اپنے گاؤں کے ایک لڑکے دلدار کے ساتھ مراسم تھے اور وہ دلدار سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے گھر والے نہیں مانتے تھے۔ انہوں نے زبردستی اس کی شادی رب نواز کے ساتھ کر دی جسے ناہید نے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ ناہید کے والدین کو چونکہ اپنی بیٹی کے چال چلن کا علم تھا، اس لئے انہوں نے شادی کے بعد رب نواز کو کہا کہ وہ ناہید کو اپنے ساتھ یونٹ میں لے جائے۔ رب نواز نے فیملی کوارٹر کے لئے درخواست دے دی اور جلد ہی اسے کوارٹر مل گیا۔

رب نواز ناہید کو یونٹ کے فیملی کوارٹر میں لے آیا۔ ابھی ان کو آئے دس دن ہی گزرے تھے کہ ناہید نے رب نواز سے کہا کہ یہاں اس کا دل تنگ پڑ گیا ہے اور وہ والدین سے ملنے گاؤں جانا چاہتی ہے۔ والدین کا تو بہانہ ہی تھا، وہ دلدار کے بغیر اداس ہو گئی تھی۔

خیر رب نواز نے دو دن کی چھٹی لی اور ناہید کو اس کے گاؤں چھوڑنے کے بعد اپنے گھر چلا گیا۔ ناہید نے فوراً ایک عورت کے ذریعے دلدار کو پیغام بھجوا دیا کہ آ کر ملے۔ دلدار سر کے بل چل کر پہنچ گیا۔ ناہید نے اسے ساری صورتحال بتائی اور اسے اپنے کوارٹر کا پتہ سمجھا دیا

اور کہا کہ رب نواز صبح سویرے کام کے لئے یونٹ چلا جاتا ہے اور مغرب سے پہلے واپس نہیں آتا۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی دلدار!" ناہید نے دلدار سے کہا۔ "تم ہفتے میں ایک دو دن لازماً گاؤں آ کر مجھے مل جایا کرو"۔

اب رب نواز کی عین ناک کے نیچے گناہ کا یہ کھیل ہونے لگا۔ ناہید دلدار کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی اور جب شام کو تھکا ہارا رب نواز گھر آتا تو کسی نہ کسی بیماری کا بہانہ بنا لیتی۔ سادہ دل رب نواز اس کی بات پر یقین کر لیتا۔ وہ الٹا پریشان ہو جاتا اور ناہید سے کہتا چلو تمہیں ہسپتال لے چلتا ہوں۔ اس کے جواب میں ناہید اسے پھر کسی دن جانے کا کہہ کر ٹال دیتی۔

ناہید رب نواز کے سامنے برف کی چٹان بن جاتی جسے سر کرنے کی کوشش میں بے چارہ ناکام ہی رہتا۔ وہ اس صورت حال سے پریشان ہوتا مگر ناہید کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ دلدار کی دلداریوں میں مست تھی۔

ایک دن دلدار آیا تو کچھ فکر مند تھا۔ اس نے ناہید سے کہا کہ اب وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

"ہم کب تک چوری چوری ملتے رہیں گے؟" دلدار نے ناہید سے کہا۔ "کچھ ایسا کرو کہ ہمارے درمیان سے رب نواز کا کانٹا نکل جائے اور ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں"۔

ناہید تو خود بھی یہی چاہتی تھی۔ اس نے دلدار سے کہا کہ وہ کل اس کے پاس آ جائے پھر مل کر اس مسئلے کا حل کرتے ہیں۔ اس دن دلدار چلا گیا اور اگلے دن حسب وعدہ پھر آ گیا۔ ناہید شیطانی ذہن کی مالک تھی۔ اس نے رات کو رب نواز سے کہا کہ کل وہ یونٹ سے جلدی چھٹی لے کر آ جائے، اسے ہسپتال جا کر اپنا چیک اپ کرانا ہے۔ یہ سن کر رب نواز خوش ہو گیا اور ناہید سے وعدہ کیا کہ وہ کل دوپہر تک چھٹی لے کر گھر پہنچ جائے گا۔

رب نواز صبح سویرے یونٹ میں چلا گیا تو نو بجے کے قریب دلدار آ گیا۔ اس نے آتے ہی ناہید سے پوچھا کہ کیا پروگرام ہے۔ ناہید نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ رب نواز کے آنے پر وہ دروازہ کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو جائے اور جونہی وہ اندر داخل ہو وہ پیچھے سے اس کو جکڑ لے۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ رب نواز اپنی موت سے بے خبر جونہی کمرے میں داخل ہوا، پیچھے سے دلدار نے اس کی گردن جکڑ لی اور ناہید نے اس کی ٹانگیں کھینچ کر گرا دیا۔ وہ دو تھے اور رب نواز اکیلا تھا اور بے خبر بھی۔ دونوں نے مل کر اس کا گلا دبا کر ہلاک کر دیا۔

"اب تم آرام سے یہاں سے کسی کی نظر میں آئے بغیر نکل جاؤ"۔ ناہید نے دلدار سے کہا۔ "باقی کا کام میں نمٹا لوں گی"۔

ناہید پر اس وقت شیطان کا غلبہ تھا، اس کا دل پتھر بن چکا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کی لاش پر مٹی کا تیل چھڑکا اور اسے آگ لگا دی۔ لاش جب اچھی طرح جھلس گئی تو ناہید نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر سب سے پہلے کوارٹر میں پہنچنے والا شخص غلام محمد تھا۔ اس نے آگ بجھانے کی کوشش کی اور بڑی مشکل سے آگ بجھائی مگر اتنی دیر میں لاش بری طرح جھلس چکی تھی۔

ناہید کا بیان لکھنے کے بعد کرنل صاحب نے رات کے اسی وقت حکم دیا کہ فوراً تین آدمی گاڑی لے کر جائیں اور دلدار کو اٹھا کر لے آئیں۔ بڑی تیز رفتاری سے سفر کر کے فوجی جوان منہ اندھیرے دلدار کے گاؤں پہنچ گئے اور اسے سوتے سے اٹھا کر گرفتار کر لیا اور لا کر یونٹ کوارٹر گارڈ میں بند کر کے پہرا لگا دیا گیا۔

کرنل صاحب کو اطلاع دی گئی تو وہ فوراً پہنچ گئے اور دلدار سے کہا کہ ناہید نے اقبالی بیان دے دیا ہے اس لئے بہتر ہے کہ وہ بھی بیان دے دے۔ پہلے تو دلدار نے

کرنل صاحب کو چکر دینے کی کوشش کی لیکن کرنل صاحب کے حکم پر دو فوجیوں نے اس کی مرمت کی تو وہ برداشت نہ کرسکا اور بیان دینے پر آمادگی ظاہر کردی۔ کرنل صاحب کے حکم پر ناہید کو بھی اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اب ولدار کے پاس انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے بھی اپنا بیان لکھوا دیا جو ناہید کے بیان کی تائید میں تھا۔ اسے ہماری کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا۔

وہ عمر میں ناہید سے چھوٹا تھا۔ معلوم نہیں ناہید نے اس پر کیا جادو چلایا تھا کہ وہ اس کے عشق میں پاگل ہوگیا تھا اور جلد ہی اس بے لگام عشق کی سزا بھی پالی۔

اسی دوران رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوگیا۔ غالباً دوسرا تیسرا روزہ تھا۔ سحری کے وقت تمام جوان سحری کھانے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ صرف ایک سپاہی اور ایک حولدار عالم جان کوارٹر گارڈ پر ڈیوٹی پر تھے۔ حوالدار عالم جان بہت شریف اور نرم خو تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ ڈیوٹی دینے والے سپاہی کو بھی بھیج دیا کہ وہ بھی سحری کھا آئیں انہوں نے سپاہی سے کہا کہ وہ خود کھا آئے اور میرے اور قیدی کے لئے کھانا لے آئے۔ سپاہی چلا گیا۔

اب کوارٹر گارڈ میں صرف عالم جان اکیلے رہ گئے تھے۔ کام تو انہوں نے قانون کے خلاف کیا تھا مگر وہ بڑے متوکل آدمی تھے۔ ولدار بڑا کائیاں آدمی تھا۔ وہ عالم جان کی نفسیات سمجھ گیا کہ یہ آدمی نرم طبیعت اور رحم دل ہے۔ اس نے عالم جان سے پوچھا کہ باقی آدمی کدھر گئے ہیں؟

''سب لنگر پر سحری کھانے گئے ہیں''۔ عالم جان نے اسے بتایا اور کہا۔ ''کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ''۔

''مجھے حاجت ہورہی ہے''۔ ولدار نے کہا۔ ''کیا تم مجھے غسل خانے تک لے جاسکتے ہو؟''

کمرے کی چابیاں عالم جان کے پاس تھیں، اس وقت وہی انچارج تھا۔ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر غسل خانہ تھا۔ عالم جان نے رائفل ایک طرف رکھی اور تالا کھول دیا کہ ولدار کو غسل خانہ تک لے جائے۔ ولدار تو موقع کی انتظار میں تھا۔ اس نے عالم جان کو ایک طرف دھکا دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ عالم جان پہلے تو گھبرا گیا پھر اس نے شور مچادیا کہ ''پکڑو پکڑو قیدی بھاگ رہا ہے''۔ عالم جان عجیب کشمکش دبیج میں پڑ گیا تھا۔ وہ نہ کوارٹر گارڈ چھوڑ سکتا تھا اور نہ قیدی کو۔ خوش قسمتی سے اس کے ساتھیوں نے اس کا شور شرابہ سن لیا اور وہ ادھر ادھر پھیل کر ولدار کو تلاش کرنے لگے۔

ادھر ولدار تھوڑی دور تک ہی گیا تھا کہ اسے ایک نالہ نظر آیا۔ وہ فوراً اس نالے میں چھپ گیا۔ ابھی سحری کا اندھیرا تھا اس لئے اس کے دیکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ نالہ یونٹ کے نزدیک ہی تھا۔ چند سپاہی بھاگتے ہوئے اس نالے کی طرف آئے تو نالے میں چھپا ہوا ولدار گھبرا گیا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے، وہ گھبرا کر باہر نکلا اور دوڑ لگا دی مگر فوج کے سپاہیوں سے بچ کر کہاں جاتا انہوں نے لمحوں میں اسے جالیا اور پکڑ کر دوبارہ لے آئے۔

یہ عالم جان کی نیک نیتی اور خوش قسمتی تھی کہ ولدار دوبارہ پکڑا گیا ورنہ اس کے خلاف سخت کارروائی ہونی تھی۔

اس کے بعد ضروری کارروائی کے بعد کرنل صاحب کے حکم پر ناہید اور ولدار کو سول جیل بھجوادیا گیا۔ اس کے بعد میری اس یونٹ سے کراچی ٹرانسفر ہوگئی۔ ایک ساتھی نے بتایا تھا کہ ولدار اور ناہید کو چودہ چودہ سال سزائے قید ہوگئی تھی۔

بزرگوں کی ایک کہاوت ہے کہ مونچھوں والی عورت اور کوتاہ قد عورت پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔

(واللہ اعلم)

دنیا بھر سے دلچسپ و عجیب حیران کن خبریں

مرسلہ: رانا محمد شاہد
0345-7094506

200 سال سے جنگ نہ لڑی گئی

جدید دنیا کی تاریخ میں دنیا کے ہر ملک نے کبھی نہ کبھی جنگ کا مزہ ضرور چکھا ہے لیکن دنیا کا ایک ملک ایسا بھی ہے جس نے گزشتہ 200 سال سے کسی بھی ملک سے جنگ نہیں لڑی۔ یہ ملک سکینڈے نیویا میں واقع سویڈن ہے۔ آخری بار اس ملک نے 1814ء میں روس کے ساتھ جنگ لڑی تھی جو 14 اگست 1814ء کو ختم ہوئی لیکن اس کے بعد سویڈن نے کسی بھی جنگ میں حصہ نہ لیا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں یورپ کے تمام ممالک جنگ میں کسی نہ کسی طرح شامل ہوئے لیکن سویڈن وہ واحد ملک تھا جس نے کسی بھی قسم کی جنگ میں شامل ہونے سے مسلسل انکار کیا۔ یہ بات نہیں کہ سویڈن کے پاس فوج یا جنگی ساز و سامان کی کمی ہے بلکہ اس ملک کے فوجیوں نے اقوام متحدہ کے امن دستوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن کسی بھی قسم کی مہم جوئی سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے۔ سویڈن کے وزیر خارجہ کارل بلڈٹ کا کہنا ہے کہ ان کے ملک نے ہمیشہ امن کو ترجیح دی اور یہی عمل آگے بڑھایا جائے گا۔

ہوا خوری کرنے کے چند حیرت انگیز فوائد

موجودہ دور میں انسان کی مصروفیت بہت بڑھ گئی

ہے۔ صبح کی سیر اور ورزش کے لئے وقت نکالنا اس کے لئے کافی مشکل ہوتا رہا ہے اور انسان چار دیواری کے اندر ہی زیادہ وقت گزارنے کا عادی ہو چکا ہے لیکن ایک نئی تحقیق کے مطابق گھر سے باہر نکل کر ہوا خوری کے فوائد حیرت انگیز ہیں۔ تحقیق کے مطابق ہوا خوری سے ہمارے پھیپھڑے صحت مند ہو جاتے ہیں اور سانس کے امراض میں مبتلا افراد کو انتہائی فائدہ ہوتا ہے۔ چہل قدمی سے جسم کے اندر مضر صحت خلیات کو ختم کرنے والے سیلز کی تعداد بڑھتی ہے جو ہمیں مختلف بیماریوں سے بچاتے ہیں۔ گھاس پر چہل قدمی سے مزاج پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہوا خوری سے جسم میں توانائی کا لیول بھی بڑھ جاتا ہے جس سے انسان خود کو صحت مند محسوس کرتا ہے۔

جامنی گھر

گھر تعمیر کرنے کے بعد اسے مختلف رنگوں سے مزین کیا جاتا ہے۔ اس گھر میں رہائش پذیر افراد اپنے کمرے میں اپنی پسند کا رنگ و روغن کرواتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو پورے گھر کو ایک رنگ میں ہی رنگ دیتے ہیں۔ لندن میں بھی ایک ایسا گھر ہے جو باہر سے دیکھنے میں تو عام سا ہی لگتا ہے مگر اس کے مالک نے اندر سے اس کا نقشہ بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس گھر کے مالک نے پورے گھر کو جامنی تھیم سے سجا دیا ہے۔ اس گھر میں فرنیچر، پردے، وال پیپرز، کارپٹ سمیت تمام اشیاء جامنی رنگ کی ہیں اور تو اور اس گھر کے مالک کو جامنی رنگ اتنا پسند ہے کہ اس نے کار بھی جامنی رنگ کی ہی لی ہے۔

24 سال سروس میں 23 سال غیر حاضری

بھارت کی ریاست مدھیا پردیش کے اندور شہر کی ایک ٹیچر نے الگ طرح کا ریکارڈ بنایا ہے، وہ 24 سال کی سروس میں گزشتہ 23 سالوں سے اپنے سکول سے غائب ہے۔ 46 سالہ سنگیتا کشیپ اندور کے اہلیا آشرم سکول نمبر 1 میں حیاتیات پڑھاتی تھیں لیکن گزشتہ 23 سالوں میں شاید ہی کبھی سکول میں نظر آئی ہوں۔ سکول کی پرنسپل سشما ویلشانے نے بتایا کہ سنگیتا کشیپ 1990ء میں دیواس مہارانی رادھا بائی کنیا سکول میں بطور ٹیچر مقرر ہوئی تھیں۔ وہ 1991ء سے 1994ء تک چھٹی پر چلی گئیں۔ واپس آنے پر ان کا تبادلہ اندور کے اس اسکول میں کر دیا گیا۔ سشما ویلشانے نے بتایا کہ سنگیتا کی گیارہویں اور بارہویں کلاس کی حیاتیات کی ٹیچر کے طور پر سکول میں تقرری ہوئی لیکن آتے ہی وہ بچے کی پیدائش کے لئے چلی گئیں اور پھر لوٹ کر نہیں آئیں۔ انہیں کام پر بلانے کے لئے کئی خط بھیجے گئے جو واپس لوٹ آئے۔

قوانین کے مطابق کوئی بھی استاد پانچ سال سے زیادہ اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر نہیں رہ سکتا۔ اندور کے محکمہ تعلیم کے افسر سنجے گوئل کہتے ہیں۔ سال 2006-07ء میں بھی ان کو ہٹانے کے لئے بھوپال کے محکمہ تعلیم کو لکھا گیا لیکن کارروائی نہیں ہوئی۔ پرنسپل کہتی ہیں کہ سکول میں حیاتیات کے اور بھی استاد تھے۔ اس لئے بچوں کی پڑھائی متاثر نہیں ہوئی ہے۔

اب جی بھر کے دھرنا دیں

دھرنا دینے والوں کے لئے ایک اچھی خبر ہے کہ انہیں اب کسی عارضی بستر کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ ان کا لباس ہی یہ کام کرے گا۔ کوٹ نما انوکھا بستر جاپانیوں کی سوچ کا نتیجہ ہے۔ جسے پہننے والا سخت سے سخت زمین پر بھی مزے کی نیند لے سکتا ہے۔ فیوتون ارمیٹ لیٹ نامی یہ لباس نما بستر جاپانی کمپنی کنگ جم کی تخلیق ہے جو مختلف قد کے حامل لوگوں کی گردن اور

ناپوں کے مطابق خود کو ایڈجسٹ کر کے آرام دہ بستر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسے موسم کے مطابق کوٹ کی شکل بھی دی جا سکتی ہے۔ اس کے اندر موجود انر میٹ کمبل اور نرم گدے کا مزا دیتا ہے۔ اس کا وزن بھی صرف 700 گرام ہے۔ اس لیے اسے پہننا اور کہیں لے جانا کوئی مشکل نہیں۔ اس کی قیمت صرف 40 ڈالر ہے۔

کھیرا کھانے کی شوقین گلہری

کھیرا صحت کے لیے بے حد مفید ہے جسے بڑے بچے دونوں ہی شوق سے کھاتے ہیں لیکن امریکہ میں تو ایک ننھی گلہری بھی کھیرا کھانے کی بے حد شوقین ہے۔ چھوٹی سی پالتو گلہری ایک آواز پر دوڑی دوڑی آتی ہے اور کھیرا لے کر مزے سے کھانا شروع کر دیتی ہے۔ کھیرا کھانے میں مصروف ننھی گلہری کی ایسی تیزی دیکھنے میں آئی کہ جیسے اس کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو جو ایک سیکنڈ بھی رکے بغیر تمام کھیرا دیکھتے ہی دیکھتے ہڑپ کر جاتی ہے۔

آنکھوں کو تیز حرکت دینا

امریکہ میں کی جانے والی ایک نئی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ ایسے افراد جن کی آنکھیں بہت تیزی کے ساتھ ادھر ادھر حرکت کرتی ہیں۔ وہ بے صبرے اور جلد بازی میں فیصلہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ تحقیق کے دوران ان لوگوں کی آنکھوں کی تیز حرکات کا جائزہ لیا گیا جس میں یہ بات سامنے آئی کہ ایسے لوگ بہت بے صبرے ہوتے ہیں اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے انتظار کرنا پسند نہیں کرتے۔ تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کی آنکھوں کی حرکات کا ان کی فیصلہ سازی کی قوت اور اضطراب سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور اگر ان سے کوئی وقت طلب کام کروایا جائے تو اس میں ناکامی کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔ تحقیق کے مطابق لوگوں کی آنکھوں کی تیز حرکات سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دماغ میں اس وقت کیا چل رہا ہے اور وہ کیا سوچ رہے ہیں۔

اربوں روپے کی کتاب

کسی کتاب کی قیمت کروڑوں ڈالر بھی ہو سکتی ہے؟ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن دنیا میں ایسی کئی کتابیں ہیں جو کروڑوں ڈالرز میں فروخت ہوئیں۔ دنیا کی مہنگی ترین کتابوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام ہے "کوڈیکس لیسٹر" کا ہے اور یہ کتاب لیونارڈو ڈاونچی کی سائنسی تحریروں پر مشتمل ہے۔ لیونارڈو کے 30 سائنسی رسالوں میں سے کوڈیکس سب سے مشہور ہے۔ پہلی بار ایک انگریز رئیس لینڈ لارڈ تھامس کاک نے 1719ء میں یہ نادر دستاویز خریدی۔ تھامس کاک کو "ارل آف لیسٹر" کا خطاب ملا تو اسی مناسبت سے کتاب کا نام بھی کوڈیکس لیسٹر ہو گیا۔ 11 نومبر 1994ء کو معروف سافٹ ویئر کمپنی مائیکروسافٹ کے مالک بل گیٹس نے نیویارک میں فائن آرٹس آکشن ہاؤس "کرسٹیز" (Christie's) سے یہ کتاب تین کروڑ آٹھ لاکھ دو ہزار پانچ سو ڈالر میں خریدی اور اس طرح کوڈیکس لیسٹر دنیا کی مہنگی ترین کتاب بن گئی۔ پاکستانی روپوں میں اس کی مالیت سوا تین ارب روپے کے لگ بھگ بنتی ہے۔

"سلوتھ" میں چھپا خزانہ

درختوں پر بے حد سست رفتاری سے چڑھتے ہوئے اور اترتے ہوئے جانور "سلوتھ" کو سب نے ہی دیکھا ہے۔ یہ جانور اپنی سست رفتاری کی وجہ سے زیادہ توجہ حاصل نہیں کر پایا لیکن اب سائنسدانوں کو یقین ہے کہ اس کے بالوں میں ممکنہ دواؤں کا ایک خزانہ چھپا ہے۔ جس میں کینسر سے لڑنے والے مرکبات اور اینٹی

بائیوٹکس تک شامل ہیں۔ اس جانور کے بالوں میں ایسی فنجائی موجود ہوتی ہے۔ جن میں بریسٹ کینسر، ملیریا اور بیماری پھیلانے والے پیرا سائٹ (طفیلیوں) کا علاج موجود ہو سکتا ہے۔ سائنسدانوں نے سلوتھ کی کھال میں چھپے 20 دیگر اہم اجزاء بھی معلوم کیے ہیں جن میں سے پانچ ایسے ہیں جو اینٹی بائیوٹکس بے اثر کرنے والے بیکٹیریا کو سبق سکھا سکتے ہیں۔ اس کے جسم سے ملنے والا ایک "کمپاؤنڈ" بیکٹیریا کو قدرے انوکھے انداز میں ختم کرتا ہے۔

کاغذ کے ملبوسات

فیشن کے رنگ ڈھنگ تو ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں مگر ایک جرمن ڈیزائنر نے تو اسے ایک بالکل نئی جہت دے دی ہے۔ جی ہاں، جولی دیلی نامی ڈیزائنر نے صرف عام کاغذ کی شیٹوں کے ذریعے خوبصورت ملبوسات اور دیگر لوازمات تیار کر کے لوگوں کو حیران کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے کام واٹر پروف کاغذ کی شیٹوں کے ذریعے کیا۔ یعنی ان کپڑوں کو بارش یا پانی کی بوچھاڑ سے کوئی خطرہ نہیں بلکہ یہ پانی کو قطرات کی شکل میں اڑا دیتے ہیں۔

چلتا پھرتا گھر

کس کو معلوم تھا کہ جدید ٹیکنالوجی کی بدولت گھر اور گاڑی ایک ہی کچ پر جا پہنچیں گے لیکن آسٹریا سے تعلق رکھنے والی ایک آٹو موبائل کمپنی نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ ایک ملین 374 ہزار یعنی (1,374,451) ڈالر کے سونے اور سفید قیمتی دھات سے بنے ایلیمنٹ پلازو نامی اس دلکش موبائل ہوم میں خوبصورت بیڈ روم اور چالیس انچ کے ٹی وی سمیت زندگی کی تمام تر آسائشیں موجود ہیں۔ 40 فٹ لمبے اس دلکش گھر میں ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے نہ صرف فرش پر قیمتی ماربل

کی تہہ لگائی گئی ہے بلکہ ایسی آٹومیٹک قیمتی کرسیاں بھی لگائی گئی ہیں جو بٹن دباتے ہی چھت سے اوپر کی جانب باہر آ جاتی ہیں۔ اب چاہیں تو وہاں بیٹھ کر چائے پئیں یا قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوں۔

ہوا میں معلق ریسٹورنٹ

بلجیم کی ایک کمپنی نے حال ہی میں چین کے شہر شنگھائی میں فضا میں معلق ریسٹورنٹ قائم کر کے ضیافت اڑانے کا دلچسپ طریقہ متعارف کرایا ہے لیکن یہ ضیافت ہر کسی کی پہنچ میں نہیں۔ 165 فٹ کی بلندی پر کھلی فضا میں کرین کے ذریعے معلق اس ریسٹورنٹ میں ایک ٹیبل کے گرد 22 افراد کے بیٹھنے کی گنجائش موجود ہے۔ ریسٹورنٹ میں 8 گھنٹے کا کرایہ 11 ہزار 44 ڈالر ہے۔ تاہم اس میں کیٹرنگ چارجز شامل نہیں جبکہ فی بندہ اس ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھنے کی فیس 303 ڈالر سے ایک ہزار 400 ڈالر تک ہے۔ یہاں ایک ٹیبل پر مہمانوں کی تواضع کے لئے 3 افراد پر مشتمل سٹاف جس میں شیف، ویٹر اور انٹرٹینرز کی خدمات حاصل ہیں۔ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ 350 افراد کے لئے اس ریسٹورنٹ میں ظہرانے کے علاوہ ناشتہ، عشائیہ اور بزنس میٹنگ کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے۔

مسلسل جھگڑنا

ڈنمارک کے محققین کے مطابق میاں بیوی، پارٹنر دوستوں یا رشتے داروں کے ساتھ اکثر ہونے والی بحث اور جھگڑوں سے وسط عمری میں موت کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ تحقیق کے مطابق مسلسل ہونے والی بحث سے مردوں اور بے روزگار لوگوں کو زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ دباؤ سے نمٹنے کی ہر شخص میں مختلف صلاحیت ہوتی ہے۔ اس سے متاثر ہونا انسان کی شخصیت پر منحصر ہے۔ کوپن ہیگن

یونیورسٹی کے محققین کے مطابق مسلسل بحث اور جھگڑے سے موت کی شرح میں دوگنا یا تین گنا اضافہ ہوسکتا ہے۔ ویسے وہ اس بات کی وضاحت کرنے کے قابل نہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مطالعہ میں 36 سے 52 سال کے تقریباً 19875 مردوں وخواتین کو شامل کیا گیا۔

10 گھنٹے کی دلہن

محبت اندھی ہوتی ہے۔ اس محاورے کو فلپائن کی ایک جواں سال لڑکی نے سچ کر دکھایا جو صرف دس گھنٹے کے لئے دلہن بنی اور اس کے بعد بیوہ ہوگئی۔ ہوا کچھ یوں کہ فلپائن سے تعلق رکھنے والا 29 سالہ راؤڈ نگو پینگ نامی شخص کینسر کا مریض تھا۔ مئی میں اسے علم ہوا کہ اس کے جگر کا کینسر آخری اسٹیج پر ہے جبکہ وہ جولائی میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شادی کا ارادہ رکھتا تھا۔ راؤڈ نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی محبوبہ لائزل سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب لائزل کو اس بات کا علم ہوا تو وہ اس شادی پر راضی ہوگئی۔ راؤڈ کی خواہش کو پورا کر دیا گیا اور شادی کے دس گھنٹے بعد لائزل بیوہ ہوگئی۔ اس شادی کے لئے چرچ کا سارا عملہ ہسپتال آیا۔

فٹ بالر بکرا

نیدرلینڈ میں ایک ایسا باصلاحیت بکرا موجود ہے جو ایک بہترین فٹ بالر بھی ہے۔ یہ بکرا سامنے سے اپنی جانب اچھالے گئے فٹ بال کو اپنے سر اور سینگوں کی مدد سے کسی ماہر فٹ بالر کی طرح روکتا اور ہٹ کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر فٹ بال اونچائی پر ہو تو یہ اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر بھی کھڑے ہو کر فٹ بال کو ہٹ کرتا ہے اور اپنے مالک کا اس کھیل میں ساتھ دے کر محظوظ بھی ہوتا رہتا ہے۔ بکرے کی اس ویڈیو کو انٹرنیٹ پر اب تک دنیا بھر میں لاکھوں افراد دیکھ کر اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو چکے ہیں۔

کھانے کا ضیاع

ایک فرانسیسی ریستوران نے کھانے کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے ایک انوکھا طریقہ اپنایا ہے۔ لوزون میں واقع ریستوران پٹزیریا نا میں گاہکوں کو اپنی پلیٹوں میں کھانا بچانے پر بل کے ساتھ اضافی طور پر پانچ فرانک جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ ریستوران کے مالک جیوانی نافورو نے ایک مقامی روزنامہ کو بتایا کہ انہیں فوراً ہی احساس ہوگیا تھا کہ لنچ ٹائم بوفے میں بہت زیادہ کھانا ضائع ہو جاتا ہے۔ میں اس اقدام کے ذریعے ایک سخت پیغام دینا چاہتا ہوں کیونکہ میں اتنا زیادہ کھانا ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ جرمانہ کل سے نافذ العمل ہو چکا ہے۔ صارفین کو اس حوالے سے پیشگی اطلاع دی جائے گی۔ نافورو کا کہنا ہے کہ پانچ فرانک کا جرمانہ علامتی نوعیت کا ہے اور ان کا بنیادی مقصد اس حوالے سے شعور اجاگر کرنا ہے۔

دوڑنے کے بعد چیری کا جوس پینا

امریکہ میں ہونے والی ایک تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ دوڑنے اور دیگر جسمانی مشقوں یعنی ورزش کے بعد چیری کا جوس پینا انتہائی صحت بخش ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ چیری کا جوس پینے سے نہ صرف تھکان کا احساس کم ہوتا ہے بلکہ دوڑنے کی وجہ سے پٹھوں میں ہونے والے درد سے بھی نجات ملتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ چیری میں قدرتی طور پر موجود Antioxidants قوت مدافعت مضبوط بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

صحرا میں سوئمنگ پول

صحرا میں ہر طرف ریت ہی ریت نظر آتی ہے۔

چلچلاتی دھوپ میں صحرا کے اندر ایک منٹ بھی کھڑا ہونا کسی مصیبت سے کم نہیں ہوتا لیکن آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے آرٹسٹ کو داد دینی پڑے گی جس نے اپنے انٹرایکٹو آرٹ پراجیکٹ کے لئے امریکن صحرا میں سوئمنگ پول تیار کر ڈالا۔ امریکی ریاست کیلیفورنیا کے صحرا میں موجود سوئمنگ پول Majaue نامی یہ سوئمنگ پول 11 فٹ لمبا اور 5 فٹ چوڑا ہے۔ شمسی توانائی والا فلٹر اور کلورینیشن سسٹم لئے اس پول تک پہنچنے کے لئے خواہش مند حضرات سے باقاعدہ دستاویزات پر دستخط لئے جاتے ہیں کہ وہ اس کا راز پوشیدہ رکھیں گے۔ جس کے بعد انہیں ایک چابی دی جاتی ہے تاکہ وہ پول تک پہنچ پر اسے کھول کر استعمال کر سکیں۔

ہوا میں چلنے کا مظاہرہ

ماہر جادوگر ایسے ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ لوگ حیران ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنے فن میں اتنی مہارت حاصل ہوتی ہے کہ با آسانی شائقین کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتے ہیں۔ برطانیہ سے تعلق رکھنے والے ایک ماہر جادوگر نے نظر بندی کی تکنیک کا سہارا لیتے ہوئے ہوا میں چلنے کا ایسا شاندار مظاہرہ پیش کیا کہ دیکھنے والوں کو حیران بلکہ پریشان بھی کر ڈالا۔ اسٹیون فریئن نامی یہ جادوگر لندن میں 15 فٹ اونچی ڈبل ڈیکر بس کی چھت کے ساتھ بغیر کسی سہارے کے اس طرح ہوا میں معلق ہو گیا ہے کہ دیکھنے والوں کو لگا جیسے یہ ہوا میں اڑ رہا ہے۔ اب جہاں جہاں بس سفر کرتے ہوئے پہنچتی ہے تو لوگوں کو یہ نظارہ حیران کر ڈالتا ہے۔

لکڑی کے ملبوسات

ہر گھر میں لکڑی سے بنا فرنیچر موجود ہوتا ہے۔ لکڑی سے بنی آرائشی اشیاء بھی مارکیٹ میں موجود ہیں لیکن کیا آپ نے لکڑی سے بنے ملبوسات دیکھے ہیں؟ برطانیہ میں ایک ایسا باصلاحیت آرٹسٹ موجود ہے جو لکڑی کے ملبوسات بناتا ہے۔ فریزر سمتھ نامی آرٹسٹ لکڑی کی آرائشی اشیاء بنانے میں تو کافی مشہور ہے لیکن فریزر نے لکڑی سے ملبوسات بھی بنانے شروع کر دیئے ہیں۔ لکڑی سے بنا کوٹ، شرٹ، شال اور ہیٹ دیکھنے میں بالکل اصلی لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا لیدر کا کوئی کوٹ ہینگر میں لٹکا ہوا ہے لیکن یہ ملبوسات پہننے کے لئے نہیں ہیں بلکہ آرائشی ہیں۔ فریزر کے لکڑی سے بنائے گئے ملبوسات کافی مہنگے داموں بکتے ہیں۔

خاتون نے اپنے بالوں سے کوٹ بنالیا

میاں بیوی ایک دوسرے کو پیار کرنے والے اور سمجھنے والے ہوں تو گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ چین میں ایک خاتون نے اپنے شوہر کے لئے اپنے ہی بالوں سے کوٹ اور ٹوپی بنا ڈالی۔ بتایا گیا ہے کہ ژیانگ نامی خاتون ایک ریٹائرڈ ٹیچر ہے اور اس کے لمبے بال علاقے بھر میں مشہور تھے۔ ژیانگ نے بتایا کہ اس کی سہیلیاں اور سکول میں ساتھی اساتذہ ان کے لمبے بالوں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک دن انہیں انوکھی ترکیب سوجھی کہ ان بالوں سے اپنے شوہر کے لئے کوٹ بناؤں۔ بس پھر ژیانگ نے گیارہ سال کی محنت کے بعد اون کی سلائیوں کی مدد سے اپنے بالوں سے کوٹ بنا۔ کوٹ مکمل ہونے کے بعد ژیانگ نے ایک ٹوپی بھی بنی۔ ژیانگ نے گیارہ سال کے عرصے میں اپنے بال لمبے کئے اور پھر انہیں کاٹ کاٹ کر جمع کرتی گئی تاکہ کوٹ اور ٹوپی مکمل کی جا سکے۔

میانہ روی زندگی کے ہر معاملے میں سنہری اصول ہے۔
اس شخص کا عبرت ناک قصہ جو محبت اور نفرت دونوں میں انتہا پسند تھا۔

ایسی محبت ایسی نفرت

تحریر: شکیل شہزاد
0300-9667909

سعادت بلوچ اپنے کنبے کے ساتھ اشرفی ٹاؤن میں رہتا تھا۔ اس کے باپ احمد طاہر غیر ممالک میں مین پاور سپلائی کرتے تھے۔ سعادت کے علاوہ ان کا ایک دوسرا بیٹا لیاقت بلوچ اور اکلوتی بیٹی تاشہ تھی۔ سعادت شروع ہی سے پڑھائی میں تیز اور دماغ کا ذہین تھا۔ سعادت کی محنت اور ذہانت کے معیار کا اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے دو بار پنجاب میں ٹاپ کیا۔ ایف ایس سی کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد سعادت نے سافٹ ویئر انجینئر بننے کی سمت میں قدم بڑھائے تو اس کی قابلیت کے مدِنظر ایک انسٹیٹیوٹ میں آسانی سے اس کا داخلہ ہو گیا۔

ایک دن ریسٹورنٹ میں سعادت کی ملاقات عرفہ سے ہو گئی۔ وہ ایم فل کر رہی تھی۔ عرفہ کا کنبہ آبائی طور سے گجرانوالہ کا رہنے والا تھا۔ کئی سال قبل اس کے والد ڈاکٹر فرمان چوہدری لاہور آ کر اسلام پارک میں بس گئے تھے۔ عرفہ کے علاوہ ڈاکٹر عرفان کے دو بیٹے تھے۔

گوہر چوہدری اور یاسر چوہدری۔ گوہر کی جنت کالونی میں بائیو کیمیکل فیکٹری تھی اور وہ اپنے کنبے کے ساتھ خیابان ٹاؤن میں رہتا تھا جبکہ یاسر کا سنگاپور میں ذاتی بزنس تھا۔ سب سے چھوٹی ہونے کے سبب عرفہ سب کی لاڈلی تھی۔ بھائیوں کی طرح وہ بھی اپنے بل بوتے پر کچھ کر دکھانا چاہتی تھی لیکن اس دن ریسٹورنٹ میں ایک دوست کے ذریعے سعادت سے ملاقات کیا ہوئی۔ عرفہ کی زندگی میں خوشگوار موڑ آنا شروع ہو گئے۔

ملاقات پہلی تھی لیکن دونوں نے ہی محسوس کیا کہ ان کا تعارف صدیوں پرانا ہے۔ چہرے تو نہیں پہچان سکے مگر روح نے پہچان لیا ہے۔ محبت، محبت ہے اسے کسی لفظ تصور یا خیال میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ہر طرف ہے، ہر جگہ ہے۔ اسے خود میں سمونا ہوتا ہے۔ محبت کو لفظ نہیں وجود چاہئے ہوتا ہے بھر جانے کے لئے یہ جیسے جیسے بوند بوند بھر جاتی ہے۔ تعصب، غصہ، نفرت، دبے چینی، ملامت، بے چارگی اور کرب سب کچھ دھلتا جاتا ہے۔ نکھر جاتا ہے اور وجود مجتمع ہو جاتا ہے۔ پھر انسان جدھر دیکھتا ہے۔ انسان جسے چھوتا ہے محبت ہو گی، سب اداسیاں محبت ہوں گی، تنہائیاں بھی محبت، ایک ملاقات نے آئندہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سعادت اور عرفہ تقریباً روز ہی ملتے۔ باتیں کرتے اور پوری پوری رات جاگ کر تارے گنتے رہتے۔ ہر تارے میں انہیں محبوب کا عکس نظر آتا تھا۔ آخر ایک دن دونوں طرف سے اظہار ہو گیا۔ ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی گئیں۔ وہ روز ملتے فون پر لمبی لمبی باتیں کرتے لیکن چاہت کو دونوں نے ہی بے لگام نہیں ہونے دیا۔ پیار اپنی جگہ تھا اور تعلیم اپنی جگہ۔

وقت پر لگا کر اڑا۔ ایم فل کی ڈگری عرفہ کے ہاتھ میں آ گئی اور سعادت کمپیوٹر انجینئر بن گیا۔ سنہرے مستقبل کے بند دروازے کی چابی اب دونوں کے ہاتھ میں تھی

اس لئے ایک دن سعادت بولا۔ ”عرفہ اب ہمیں شادی کر لینا چاہئے“۔

”ٹھیک ہے“۔ عرفہ نے عزم کے ساتھ کہا۔ ”تم اپنے کنبے سے بات کرو میں اپنے گھر والوں کو اس رشتے کے لئے راضی کرنے کی کوشش کرتی ہوں“۔

”اگر ہمارے گھر والے راضی نہ ہوئے تب؟“ سعادت کے ذہن میں اندیشے کے ناگ نے سر اٹھایا۔

”ہم بالغ ہیں“۔ عرفہ نے اسے تسلی دی۔ ”اگر ہماری بات نہ مانی گئی تو ہمارے سامنے دوسرے متبادل راستے بھی کھلے ہوئے ہیں“۔

اسی شام عرفہ اور سعادت نے اپنے اپنے گھر پر بات کی۔ ڈاکٹر فرحان چوہدری ہوں یا احمد طاہر بلوچ دونوں ہی بھڑک گئے۔ ”ہمیں کسی بھی قیمت پر یہ شادی منظور نہیں“۔

سعادت کے پیار میں عرفہ پاگل تھی تو عرفہ کے لئے سعادت دیوانہ۔ انہوں نے اپنے اپنے گھر والوں کو شادی کے لئے راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ روئے، گڑگڑائے، پیار کی دہائی دی، بھوک ہڑتال کی لیکن اس رشتے سے نہ ڈاکٹر فرحان خوش تھے نہ احمد طاہر خوش تھے۔ ادھر سعادت کو انہی دنوں میں امریکا میں واقع ایک کمپنی میں پرکشش نوکری بھی مل گئی۔ نوکری جوائن کرنے سعادت امریکا گیا تو عرفہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ کمپنی نے سعادت کو رہنے کے لئے شاندار فلیٹ دیا تھا۔ اس لئے ان دونوں کو کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ سعادت کام پر چلا جاتا تو عرفہ گھر میں اکیلی بند رہ کر بور ہو جاتی۔ اس لئے اس نے خود بھی نوکری ڈھونڈنا شروع کر دی۔ سعادت کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بھڑک اٹھا۔

”عرفی! کیا میں تمہیں خرچ کے لئے پیسے نہیں دیتا جو تم خود کمانا چاہتی ہو؟“ شوہر کی بات سن کر عرفہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ دقیانوسی خیالات کا تھا اور اس سے نوکری

نہیں کرانا چاہتا تھا۔ وہ ضدی تھا تو عرفہ بھی کم ہٹیلی نہیں تھی۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ نوکری کرے گی تو اب اپنا فیصلہ بدلنے کو تیار نہیں تھی۔ آخر کار کئی دنوں کی بحث اور لڑائی جھگڑوں کے بعد جیت عرفہ کی ہوئی۔ کچھ شرائط کے ساتھ سعادت نے اسے نوکری کرنے کی اجازت دے دی۔ عرفہ کے ملازمت کرنے سے آمدنی تو ضرور بڑھ گئی مگر گھر کا سکھ چین جاتا رہا۔ گھر کا کوئی کام ہونے سے رہ جاتا تو سعادت چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔

"میں نے تمہیں نوکری کرنے کی اجازت اسی شرط پر دی تھی کہ گھر کا سارا کام تمہیں ہی کرنا ہوگا"۔ سعادت اسے یاد دلاتا۔ "تم شرط نہیں پوری کر پا رہی ہو۔ اس لئے تمہیں نوکری کرنے کا حق نہیں ہے۔ آج ہی استعفیٰ دے دو"۔

عرفہ نوکری چھوڑنے کے موڈ میں قطعی نہیں تھی اس لئے آئے دن ہونے والے شوہر بیوی کے جھگڑے نے سنگین رُخ اختیار کر لیا جس کے نتیجے میں کچھ عرصہ قبل جو عرفہ سعادت کے سپنوں کی رانی تھی اس سے اب وہ بور ہونے لگا تھا۔ عرفہ کے کاموں میں مین میخ نکالتے رہنا بھی اس کی عادت بن گئی۔ عرفہ کو بھی لگنے لگا کہ سعادت کو دل کی رانی کی نہیں بلکہ گھریلو نوکرانی کی ضرورت ہے۔

جھگڑوں کے نتیجے میں میاں بیوی میں جب زیادہ اختلاف ہو گئے تو عرفہ نے نوکری چھوڑ دی۔ اس کے بعد اس نے اپنا سارا سامان سمیٹا اور سعادت کو بائی بائی کہہ کر لاہور لوٹ آئی اور سعادت سے اس کا رابطہ قطعی ٹوٹ گیا۔ عرفہ نے اپنے مستقبل کے بارے میں نئے سرے سے سوچنا شروع ہی کیا تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد سعادت روٹھی ہوئی بیوی کو منانے آ پہنچا۔

سعادت نے اپنے بُرے برتاؤ کے لئے عرفہ سے معافی مانگی تو اس نے بھی ازدواجی زندگی کی تلخی کو دھو [illegible] سعادت کے

ساتھ امریکا چلی گئی۔ پھر عرفہ نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا۔ بیٹے کا نام انہوں نے علی حسن اور بیٹی کا نام اینیلا۔ عرفہ کو یقین تھا کہ جڑواں بچوں سے اس کی ازدواجی زندگی کی ڈور اور مضبوط ہوگی لیکن ہوا اس کے الٹ۔

سعادت کے رویے اور دقیانوسی سوچ کی وجہ سے لڑائی جھگڑے نہیں رکے اور عرفہ گھریلو تشدد کا شکار ہوتی رہی۔ اسی طرح دن گزرتے رہے۔ کل کی محبت نے پل بھر میں کئی صدیاں سمیٹ کر قدموں میں ڈال دیں۔ ان پر نہ دھول تھی نہ کوئی نشان.... دیکھتے ہی دیکھتے اچانک وہ آج سے گلے مل کر الگ ہو گئیں۔ عرفہ ساکت رہتے ہوئے بھی پیچھے بھاگی لیکن روکنے میں ناکام رہی۔ آنسو پیتی ہوئی وہ باہر کو دیکھتی تو اس وقت باہر کی فضا میں اندر سے بھی زیادہ گھٹن تھی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ کاروباری مندی کی آندھی چلی تو امریکہ بھی اس سے بچا نہیں رہا۔ لہٰذا سعادت کی نوکری چھوٹ گئی اور اسے بیوی بچوں سمیت لاہور لوٹنا پڑا لیکن امریکا سے واپسی سے کچھ ہی دنوں بعد سعادت کو رائے ونڈ میں واقع ایک کمپنی میں نوکری مل گئی۔ بیوی بچوں کو لاہور چھوڑ کر سعادت اکیلا ہی رائے ونڈ چلا گیا۔

سعادت جس کمپنی میں نوکر ہو کر رائے ونڈ گیا تھا اس میں انسہ جبیں نامی لڑکی بھی کام کرتی تھی۔ شوہر سے اس کی بنتی نہیں تھی اس لئے آپسی اتفاق سے دونوں میں علیحدگی ہو گئی تھی لیکن طلاق نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد انسہ نے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ وہاں رہنے لگی تھی۔ سعادت بیوی سے دور تھا تو انسہ شوہر کو ٹھکرا آئی تھی۔ مکمل وجود کے ہوتے ہوئے بھی انسہ اور سعادت ادھورے تھے۔ لہٰذا دونوں کی دوستی جلد ہی گل کھلانے لگی۔ سعادت نے اپنا کرائے کا فلیٹ چھوڑ دیا اور انسہ کے گھر میں اس کے شوہر کی حیثیت سے رہنے لگا۔ [illegible]

رکھنے کے لئے ان دونوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ انہوں نے کورٹ میرج کر لی ہے۔

ادھر کسی بہی خواہ نے عرفہ کو فون کر کے اس آشنائی کی اطلاع دے دی تو وہ تلملا گئی۔ اس نے شوہر کے سامنے دو متبادل راستے رکھے۔ یا تو بچوں سمیت میں تمہارے ساتھ رہنے کے لئے رائے ونڈ آ جاتی ہوں یا پھر تم نوکری چھوڑ کر لاہور لوٹ آؤ۔ حالات اس قسم کے ہو گئے تھے کہ بیوی بچوں کو ساتھ رکھ پانا سعادت کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس لئے اس نے نوکری چھوڑ کر لاہور لوٹ آنے کا فیصلہ کر لیا۔ لاہور لوٹ کر اس نے عرفہ پر احسان جتانے کے لئے کہا تمہارے کہنے پر میں نوکری چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔ کیا یہ بات مجھے دودھ کا دھلا ثابت کرنے کو کافی نہیں۔ سعادت لاہور لوٹ آیا تھا۔ کسی بھی قیمت پر عرفہ اب اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ اسے لے کر گنگوا ٹاؤن چلی گئی۔ وہاں انہوں نے شیر گڑھ میں واقع مغل اپارٹمنٹس میں ایک فلیٹ لے لیا اور وہیں پر سعادت نے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔

چونکہ اس میں قابلیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لئے اسے جلد ہی ایک بڑی کمپنی میں پرکشش نوکری مل گئی لیکن خوشحالی کی یہ عمر زیادہ لمبی نہیں رہی۔ سعادت نے پھر وہی اپنا پرانا رویہ اختیار کر لیا۔ عرفہ پھر سے گھریلو تشدد کا شکار ہونے لگی۔ جب اس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا تو ایک دن اس نے گھریلو تشدد کی شکایت حقوق انسانی کمیشن میں کر دی۔ چونکہ عرفہ کو سعادت پر اعتبار نہیں رہا تھا اس لئے وہ خفیہ طریقے سے اس کی جاسوسی کرتی رہی تھی۔ اسی سے اسے معلوم ہوا کہ انسہ جبیں کی اپنے شوہر سے دوبارہ ان بن ہو گئی تھی اس بار آپسی رضامندی سے نہیں بلکہ قانونی طور پر طلاق لے کر اس سے ہمیشہ کے لئے تعلق توڑ لینا چاہتی تھی کہ سعادت پھر سے اس کی زندگی میں آ جائے [illegible] تھا۔

عرفہ نے سعادت سے جواب طلب کیا تو وہ پھر سے گھریلو تشدد کا شکار ہونے لگی۔ میاں بیوی کا جھگڑا اسی طرح چلتا رہا اور اپنے موبائل سے عرفہ اپنے دکھوں کو میکے والوں کو بیان کرتی رہی۔

پھر ایک جب عرفہ کے فون آنا بند ہو گئے تو اس کا بھائی گوہر پریشان ہو گیا۔ وہ کال کرتا، گھنٹی بجتی لیکن کال ریسیو نہیں کی جاتی تھی۔ اس لئے مایوس ہو کر گوہر نے عرفہ کے موبائل پر پیغام بھیجنا شروع کر دیے۔ کافی دنوں کے بعد اسے میسج کا جواب میسج سے ملا۔

"میں سکھی اور خوشحال ہوں۔ مصروفیت کے باعث کال ریسیو کرنے یا کال بیک کرنے کا وقت نہیں مل رہا ہے۔ اس لئے اپنی خیریت کا پیغام بھیج رہی ہوں۔ میری طرف سے آپ لوگ بالکل پریشان اور فکرمند نہ ہوں۔"

عرفہ کے پیغام سے گوہر مطمئن نہیں ہوا۔ اس لئے اس نے عرفہ کو موبائل پر مسلسل فون کرنا جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرفہ کی بجائے سعادت نے کال ریسیو کرنا شروع کر دی اور عرفہ سے بات کرانے پر بہانے بنانے لگا۔ اس پر گوہر کو دال میں کچھ کالا نظر آیا تو وہ امرسدھو میں رہنے والے ایک دوست کو ساتھ لے کر گنگوا ٹاؤن جا پہنچا۔ عرفہ کا پاسپورٹ گوہر کے پاس تھا۔ اس لئے پاسپورٹ لوٹانے کے بہانے گوہر نے اپنے دوست کو عرفہ کے گھر بھیجا۔ گھر میں سعادت اور دونوں بچے تو موجود تھے لیکن عرفہ نہیں تھی۔ سعادت نے بتایا عرفہ شاپنگ کرنے بازار گئی ہوئی ہے جبکہ بچوں کا کہنا تھا ماں بہت دنوں سے اپنی نانی کے گھر گئی ہوئی ہے۔ دوست نے واپس آ کر یہ ساری باتیں گوہر کو بتا دیں تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس لئے وہ فوراً شیر گڑھ کی پولیس چوکی بندال پہنچا۔

چوکی کے انچارج اکرام اللہ کو اس نے حالات سے

آگاہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ اس کی بہن عرفہ کے بارے میں سعادت سے پوچھ گچھ کریں۔

اکرام اللہ کچھ ماتحت پولیس والوں کو ساتھ لے کر بلاتاخیر سعادت کے فلیٹ پر پہنچے۔ گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ فلیٹ کے مالک احمد جاوید نے بتایا کہ سعادت اپنے دونوں بچوں کو اپنی کار میں لے کر کہیں گیا ہے۔ اکرام اللہ نے موبائل فون سے سعادت سے رابطہ قائم کیا تو وہ فیروز پور روڈ پر مل گیا۔ اسے فوراً فلیٹ پر آنے کے لئے کہا گیا۔ سعادت فلیٹ پر آیا تو اس کا استقبال پولیس نے کیا۔ پولیس کو دیکھ کر سعادت گھبرا گیا۔ اکرام اللہ نے اس کو پوچھ گچھ کی چکی میں ڈالا تو اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور جلد ہی وہ اپنے جھوٹے الفاظ کی یہ جنگ ہار گیا اور اعتراف کرلیا کہ اس نے عرفہ کو قتل کردیا ہے۔

ایک دن شاپنگ کے لئے عرفہ مجھ سے چالیس ہزار روپے مانگ رہی تھی۔ جبکہ میں اسے بیس ہزار روپے سے ایک پیسہ بھی زیادہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ اسی بات پر جھگڑا ہوگیا۔ غصہ میں اس نے اس کا خون کردیا۔

"عرفہ کی لاش کہاں ہے؟" اکرام اللہ نے پوچھا۔

"اس کے اندر"۔ سعادت نے پاس رکھے ڈیپ فریزر کی طرف اشارہ کیا۔ اکرام اللہ نے فریزر کا ڈھکن کھولا تو اس میں پولی تھین بیگ میں عرفہ کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ حیوانیت کی انتہا تھی۔

سعادت نے اقبال جرم کرتے ہوئے بتایا کہ عرفہ کو قتل کرنے کے بعد اس نے لاش باتھ روم میں رکھ کر باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اگلے دن پاور ہاؤس فیروز پور روڈ پر واقع ایک دکان سے پتھر کاٹنے کی مشین اور سریا کاٹنے والے کچھ بلیڈ خریدلایا۔ انہی اوزاروں سے اس نے عرفہ کی لاش کے 72 ٹکڑے کیے۔ اب اس کا منصوبہ ایک ایک کرکے ان ٹکڑوں کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ ان میں سے آٹھ دس ٹکڑوں کو وہ ٹھکانے لگا بھی چکا تھا۔

گمشدگی کا معمولی سا دکھائی دینے والا معاملہ ایسا لرزہ خیز نکلے گا، اکرام اللہ نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس سنسنی خیز واقعہ سے اعلیٰ پولیس افسران کو بھی آگاہ کردیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی متعلق اپارٹمنٹ پولیس چھاؤنی میں تبدیل ہوگیا۔

دراصل سعادت عرفہ سے اوب چکا تھا اور اس سے نجات پاکر دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ سعادت کی دوسری بیوی انسہ جبیں بھی بن سکتی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں بچوں کو لے کر امریکہ بھاگ جانے کا بھی منصوبہ تھا۔

اگلے ہی دن گوہر کی رپورٹ کی بنیاد پر سعادت کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرلیا گیا اور سعادت کو چار ایام کے ریمانڈ پر پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اب پولیس کے سامنے سب سے اہم کام عرفہ کی لاش کے ٹھکانے لگادیئے گئے ٹکڑوں کو برآمد کرنا تھا۔ سعادت نے پولیس کو بتایا کہ اس نے پولی تھین بیگ میں رکھ کر لاش کے ٹکڑے الرحیم پارک کی کھائی میں اور کچھ راوی کی جھاڑیوں میں پھینکے تھے۔ سعادت کی نشاندہی پر پولیس نے عرفہ کی ٹانگ کا پنجہ برآمد کرلیا۔ اس کے علاوہ پولیس کو اور کچھ نہیں ملا تھا۔ بعد میں عدالتی حکم پر پولیس نے عرفہ کے دونوں بچوں کو ان کے ماموں گوہر کو سونپ دیا تھا۔ سو ہی سعادت جو عرفہ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس کے لئے اپنے گھر والوں کو ناراض کرلیا۔ وہ اس کو دیکھ کے جیتا تھا اور اس کے لئے پوری دنیا سے ٹکرانے کو تیار تھا پھر وہی سعادت اس سے نفرت کرنے پر اترا تو تمام حدیں پار کرگیا۔ اب وہ بدنصیب سزائے موت کی کوٹھری میں زندگی کی گھڑیاں گن رہا ہے۔

❁◆❁

وہ آپریشن کے لئے مریض کی کھوپڑی کھول کر پھر مریض کے لواحقین سے سودے بازی کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرتا تھا جو اس نازک موقع پر متعلقہ لوگوں کو دینی پڑتی تھی۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

رُسوا کن سزا

راؤ یعقوب میرے پرانے دوست ہیں۔ کسی زمانے میں ہم دونوں ایک سیاسی ہفت روزے میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ 1970ء میں میں لیکچرار بن کر سرکاری ملازمت میں چلا گیا اور یعقوب صاحب اسلام آباد کے ایک علمی، مذہبی ادارے میں گزٹیڈ آفیسر بن گئے جہاں سے وہ 1999ء میں بیسویں گریڈ سے ریٹائرڈ ہوئے۔ موصوف بہت اچھے قلمکار ہیں اور کئی وقیع انگریزی کتابوں کا انہوں نے خوبصورت اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ آج کل وہ علامہ اقبال ٹاؤن کے سامنے ملتان روڈ پر لاہور کی ایک معروف بستی میں رہائش پذیر ہیں۔

موصوف نئے نئے لاہور منتقل ہوئے تھے کہ ایک روز اخبار میں پڑھا کہ راؤ یعقوب کا بیٹا جو ایک سال پہلے ہندوستان میں گرفتار ہو گیا تھا، رہا ہو کر آ گیا ہے۔ افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ ملاقات ہوئی تو انہوں نے بڑا ہی عجیب قصہ سنایا۔ کہنے لگے:

میرے سسرال ہندوستان کے ضلع اعظم گڑھ میں ہیں۔ تقریباً چار سال پہلے کی بات ہے، میں اسلام آباد ہی میں تھا جب میری بیگم نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ بھائی سے ملے بہت لمبا عرصہ ہو گیا ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ آپ انتظام کر دیں اور میں بیٹے جی اس سے ملاقات کر آؤں۔ میرا ایک بیٹا یوسف قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں پڑھتا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں بھی امی کے ساتھ جاؤں گا۔ ماموں سے مل بھی آؤں گا اور ہندوستان کی سیر بھی کر آؤں گا۔ چنانچہ میں نے بھی یہ سوچ کر بیٹے کی تجویز سے اتفاق کیا کہ بیگم کو تنہا سفر نہیں کرنا چاہئے اور دونوں ماں بیٹے کے پاسپورٹ اور ویزوں کا انتظام کر دیا۔ وہ دونوں ایک دن ہوائی جہاز سے ہندوستان چلے گئے۔

لیکن یہ کیا؟ وہ آج گئے اور دوسرے ہی روز شام کو

ہوائی جہاز سے واپس اسلام آباد آ گئے۔ ہم سب ہکا بکا رہ گئے۔ خیال آیا کہ شاید کسی شک کی بناء پر ہندوستان والوں نے دلی سے آگے نہیں جانے دیا لیکن ایسا ممکن نہ تھا کہ ہم نے بھارتی سفارت خانے سے قواعد و ضوابط کے مطابق باقاعدہ ویزہ حاصل کیا تھا۔ بیگم کا برا حال تھا، اس کی رو رو کے آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ کیا حادثہ ہوا ہے؟ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس نے ہچکیوں کے ساتھ بتایا کہ آپ کے بیٹے نے وہاں ضد اور ہٹ دھرمی کی انتہا کر دی۔

بیگم نے بتایا کہ میرے بھائی جس گاؤں میں رہتے ہیں وہاں بجلی نہیں ہے، وہ بڑا ہی پسماندہ علاقہ ہے۔ پھر سب لوگوں نے بھینسیں پال رکھی ہیں۔ گھر کے ساتھ ہی مویشیوں کا باڑہ ہے اور گوبر، سبزے اور گندے پانی کی کثرت کی وجہ سے گاؤں میں مچھر بڑی کثرت سے ہیں اور خوب پلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ رات کو جب ہم سوئے تو یوسف پر تو مچھروں نے گویا یلغار کر دی۔ گاؤں کے لوگ تو اس صورت حال کے عادی تھے مگر یوسف کے لئے یہ بالکل نیا، بڑا ہی تکلیف دہ تجربہ تھا۔ ساری رات مچھر اسے کاٹتے رہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی سو نہ سکا۔ جاگتا رہا اور روتا رہا اور صبح ہوتے ہی اس نے چیختے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ وہ اس گاؤں میں مزید ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ٹھہرے گا اور لازماً آج ہی واپس جائے گا۔ وہ بار بار چلا رہا تھا اور اس مطالبے کی تکرار کئے جا رہا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ اس کے ماموں کا بارہ تیرہ سالہ بیٹا قریبی ندی میں مچھلیاں پکڑنے گیا اور ڈوب کر مر گیا۔ اب میت صحن میں پڑی تھی، سارا گاؤں اظہار غم کے لئے جمع ہو گیا تھا بلکہ قرب و جوار کے رشتہ دار بھی اکٹھے ہو گئے تھے لیکن یہ لڑکا اس انتہائی سوگوار فضا سے مکمل بے نیاز مسلسل باآواز بلند چیختا جا رہا تھا کہ میں یہاں ہرگز نہیں ٹھہروں گا اور ابھی واپس جاؤں گا۔ سارے رشتہ دار اسے منانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ماں نے اس کی منتیں کیں، اپنا دوپٹہ اس کے قدموں پر رکھ دیا۔ ماموں نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑے کہ مجھے معاف کر دو۔ میں آج کوئی نہ کوئی ضرور انتظام کر دوں گا۔ شہر سے مچھر دانی لے آؤں گا اور مچھر والا تیل بھی خرید لوں گا۔ بس تھوڑا صبر کرو، حوصلے سے کام لو، میری بہن کئی سالوں کے بعد آئی ہے، اسے چند روز میرے پاس رہ لینے دو اور اب تو ہمارے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے، اس کا ہی کچھ لحاظ کرو، آج ہی واپسی کی ضد نہ کرو۔

لیکن آفرین ہے اس لڑکے پر کہ اس نے کسی کی منت سماجت اور آہ و زاری کی پروا نہ کی۔ ماں کا دوپٹہ اٹھا کر دور پھینک دیا اور ماموں کے اشک آلود ہاتھوں کو جھٹک دیا اور ایک ہی ہٹ پر قائم رہا کہ میں یہاں ہرگز نہیں رکوں گا اور آج ہی واپس جاؤں گا اور ہر قیمت پر جاؤں گا...... چنانچہ تنگ آ کر، زچ ہو کر ماموں نے کمال ایثار سے کام لیا، بیٹے کا جنازہ مؤخر کیا اور بہن اور بھانجے کو ساتھ لے کر خود علی گڑھ گیا اور دونوں کو ٹرین پر بٹھا دیا۔ یہ دلی آ گئے اور شام کی فلائٹ سے واپس اسلام آباد پہنچ گئے۔

راؤ یعقوب صاحب نے بتایا کہ اس صورت حال نے مجھے غم اور غصے کی شدید ترین کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں اور بیٹے سے کیا سلوک کروں؟ وہ جوان تھا، بے حد ضدی اور اکھڑ مزاج تھا۔ سختی کرتا تو پتہ نہیں وہ کیا کر گزرتا۔ زجر و توبیخ کا وہاں کوئی فائدہ نہ تھا۔ چنانچہ بے بسی کے عالم میں میں بے اختیار رو پڑا اور دیر تک روتا رہا۔

راؤ یعقوب صاحب نے بتایا: اس واقعے کو دو سال گزرے، میرے اس بیٹے نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم بی اے کا کورس مکمل کر لیا اور ایک بینک

الاقوامی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہو کر اس کے لاہور آفس کا منیجر بن گیا۔

ملازمت حاصل ہوئے بمشکل ایک سال گزرا تھا کہ اس کمپنی نے دلی میں ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کرانے کا پروگرام بنایا اور اپنے لاہور آفس کو پابند کیا کہ وہ بھی اپنا ایک مندوب سیمینار میں شرکت کے لئے بھجوائے چنانچہ راؤ یوسف اس میں شمولیت کے لئے تیار ہو گیا۔

راؤ یعقوب صاحب نے بتایا کہ جب میرے بیٹے نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ ہماری کمپنی کا دلی میں سیمینار ہے اور میں اس میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں تو میں نے اسے لعن طعن کی کہ اب تم کس منہ سے ہندوستان جاؤ گے۔ پہلے تم نے کیسا کارنامہ انجام دیا تھا تو وہ ہنس کر کہنے لگا کہ میں نے وہاں ماموں کے گاؤں تھوڑی جانا ہے؟ خدا کی پناہ کہ میں دوبارہ وہاں کبھی جاؤں...... میں دلی جاؤں گا، وہاں ہوٹل میں ٹھہروں گا، سیمینار اٹینڈ کروں گا۔ دلی اور آگرہ کی سیر کروں گا اور واپس آ جاؤں گا۔

میں نے اسے کہا کہ دیکھو احتیاط کرنا، فراڈ بہت ہو رہے ہیں کسی پرائیویٹ منی چینجر سے کرنسی تبدیل نہ کرانا۔ کسی بنک یا رجسٹرڈ منی چینجر ہی سے رقم تبدیل کرانا۔ مگر بدقسمتی سے اس نے میرے مشورے اور نصیحت کی پروا نہ کی۔ وہ لاہور سے سمجھوتہ ایکسپریس پر سوار ہوا تو ٹرین میں ایک منی چینجر آ گیا۔ اس نے جھانسا دیا کہ میں عام بنکوں کے مقابلے میں زیادہ ہندوستانی کرنسی دوں گا۔ چنانچہ میرے بیٹے نے اسے ایک ہزار کا پاکستانی نوٹ دے کر ہندوستان کے سو سو کے نوٹ حاصل کر لئے۔

واہگہ سے آگے ہندوستان کی سرحد شروع ہوئی۔ راؤ یوسف بارڈر کراس کر کے اٹاری پہنچا اور ریلوے بکنگ آفس پر دلی کا ٹکٹ لینے کے لئے ایک سو روپے کا نوٹ متعلقہ کلرک کو دیا تو اس نے ٹکٹ دینے کی بجائے نوٹ کو جعلی قرار دے دیا اور فوراً ہی پولیس بلا لی۔ راؤ یوسف کو گرفتار کر لیا گیا اور ہتھکڑی لگا کر حوالات پہنچا دیا گیا۔

راؤ یعقوب صاحب نے بتایا: دوسرے روز مجھے امرتسر سے فون آیا، میں سردار بھگت سنگھ وکیل بول رہا ہوں۔ آپ کا بیٹا راؤ یوسف جعلی کرنسی کے کیس میں گرفتار ہو گیا ہے اور وہ حوالات میں ہے، آیئے اور اس کی ضمانت کرا لیجئے۔

یعقوب صاحب نے بتایا: آپ میری پریشانی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ صدمے سے برا حال ہوا لیکن ظاہر ہے بیٹے کا معاملہ تھا جینا تو نہیں جاتا تھا۔ میں اسلام آباد میں تھا اور صحافتی حلقوں میں میرے وسیع مراسم تھے۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے ہندوستان کا ایمرجنسی ویزہ حاصل کیا۔ زر مبادلہ میں ایک لاکھ روپے کا انتظام کیا اور دوسرے ہی روز ہوائی جہاز سے دلی پہنچ گیا۔ وہاں سے پہلے اعظم گڑھ گیا، اپنی بیگم کے بھائی کو ساتھ لیا اور امرتسر پہنچ گیا۔ وہاں بھگت سنگھ وکیل سے ملا۔ پہلے ہی روز میرے ساٹھ ہزار روپے خرچ ہو گئے، خدا کا شکر ہے بیٹے کی ضمانت ہو گئی اور ضمانت اسی ماموں نے دی جس کے گھر میں راؤ یوسف نے مزید ایک دن بھی ٹھہرنا گوارا نہ کیا تھا۔

عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ اگرچہ ملزم کو ضمانت پر رہا کیا جا رہا ہے لیکن جب تک مقدمے کا فیصلہ نہیں ہو گا وہ ہندوستان سے باہر نہیں جا سکتا...... اس طرح راؤ یوسف کو گیارہ مہینے تک انتہائی ذلیل و خوار ہو کر ماموں کے اسی گھر میں رہنا پڑا جہاں تین سال پہلے اس نے سنگدلی اور سفاکی کی انتہا کر دی تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس گاؤں میں وہ ذہنی اور عملی طور پر کس اذیت اور ذلت کی کیفیت میں جلا رہا ہو گا...... عجیب بات یہ ہے کہ ان تین سالوں میں گاؤں میں مثبت انداز کی کوئی بھی

تبدیلی نہیں آئی تھی۔

اللہ نے حیرت انگیز طور پر اپنی صفت انتقام کا کرشمہ دکھا دیا تھا۔

ڈاکٹر جمعہ اور ڈاکٹر منیر کا عبرتناک انجام

"مکافات عمل" کے حوالے سے کراچی کے ڈاکٹر جمعہ کا ذکر مختلف محفلوں میں اس تواتر سے سنا کہ مجھے اس کی ثقاہت پر یقین آ گیا لیکن کوئی ٹھوس شہادت سامنے نہیں آ رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ "نوائے وقت" کے سنڈے میگزین (19 جولائی 2009ء) میں فلوریڈا، امریکہ میں مقیم ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی نے اپنے کالم میں اس جانب اشارہ کیا۔ انہوں نے لکھا کہ لیاقت میڈیکل کالج جامشورو، حیدر آباد سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد انہیں 1968ء میں جناح ہسپتال کراچی میں ڈاکٹر جمعہ کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ڈاکٹر جمعہ اس زمانے میں کراچی ہی میں نہیں بلکہ پاکستان بھر میں واحد نیورو سرجن تھے۔ وہ دماغی امراض اور حادثات کے بے حد ماہر اور لائق سرجن تھے اور بقول ڈاکٹر شبیر احمد "وقت لینے کے لئے لوگ ان کے پاؤں پڑا کرتے تھے (چنانچہ) ان کی مہارت، تجربے اور اہمیت نے انہیں سخت مزاج بنا دیا تھا۔ (لیکن) پھر ایک روز خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ان کا اپنا فرزند موٹر سائیکل کے حادثے میں سخت زخمی ہو گیا۔ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی اور وہ بے ہوش تھا۔ سخت دماغ باپ نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنے بیٹے کی سرجری شروع کی لیکن وہ اس کی جان نہ بچا سکے"۔

ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی چونکہ ڈاکٹر جمعہ کے ایک تو مشق معاون یا شاگرد تھے، اس لئے انہوں نے موصوف کے بارے میں خاصا نرم اور رعایتی انداز اختیار کیا، ورنہ زبان زد خاص و عام جو بات ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر جمعہ انتہائی سفاک، بداخلاق اور بے رحم سرجن تھا۔ وہ پیسے کا پجاری تھا اور انسانی اخلاقیات سے قطعی عاری تھا۔ سنا یہ ہے کہ وہ آپریشن کے لئے مریض کی کھوپڑی کھول کر پھر مریض کے لواحقین سے سودے بازی کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرتا تھا جو اس نازک موقع پر متعلقہ لوگوں کو دینی پڑتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رات ایک خداترس آدمی نے سڑک پر ایک نوجوان کو بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا۔ اس کی موٹر سائیکل پاس گری ہوئی تھی۔ اس شخص نے اس نوجوان کو اپنی گاڑی میں ڈالا اور ڈاکٹر جمعہ کے کلینک پر لے گیا اور ڈاکٹر صاحب سے مل کر اس نے بتایا کہ میں نے ایک خوبصورت نوجوان کو سڑک پر بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا، کوئی گاڑی والا اس کی موٹر سائیکل کو ٹکر مار کر چلا گیا تھا۔ میں اسے اٹھا کر آپ کے پاس لے آیا ہوں، براہ کرم اسے جلد دیکھئے، ہو سکتا ہے آپ کی کوشش سے اس کی جان بچ جائے۔

لیکن ڈاکٹر جمعہ نے حسب عادت کمال بے نیازی سے کہا: صاحب میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں ایسے ہی مریضوں کو بے مقصد دیکھتا رہوں... میں پچاس ہزار روپے فیس لوں گا، نہیں ہے تو جائیے، اسے کسی دوسرے ہسپتال میں لے جائیے۔

اس شخص نے بڑی آزردگی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، اتنی بڑی رقم تو میں نہیں دے سکتا، یہ لڑکا میرا عزیز نہیں ہے، میں تو محض انسانی ہمدردی کے تحت اسے آپ کے پاس لایا ہوں، آپ اسے دیکھ تو لیں۔

لیکن ڈاکٹر جمعہ نے انکار کر دیا کہ میں مریض کو نہیں دیکھ سکتا، پہلے رقم طے کیجئے اور ادائیگی کیجئے، پھر میں مریض کو دیکھوں گا۔

اس خداترس آدمی نے بالآخر ڈاکٹر جمعہ سے وعدہ کر لیا کہ وہ چالیس ہزار روپے (1968-69ء میں) ادا

کر دے گا، تب ڈاکٹر اپنے دفتر سے باہر نکلا اور لاؤنج میں سٹریچر پر خون میں لت پت بے ہوش نوجوان کو دیکھا تو اس کی چیخیں نکل گئیں، اس نے بُری طرح سر پیٹ لیا۔ یہ نوجوان اس کا اپنا ہی لختِ جگر...... اکلوتا بیٹا...... تھا۔ بہرحال اپنے نوجوان بیٹے کا ڈاکٹر نے بہتے آنسوؤں اور لرزتی انگلیوں کے ساتھ آپریشن کیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا اور اس کی نظروں کے سامنے، اس کے ہاتھوں میں دم توڑ گیا۔

اس طرح اللہ کی بے نیازی نے ایک سفاک، بے رحم اور زر پرست ڈاکٹر کو اس کی زندگی ہی میں نقد اور کڑی سزا دے دی۔

درست فرمایا مولانا ظفر علی خاں نے!

نہ جا اس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

●●●

اپنے اسی مضمون میں ڈاکٹر شبیر احمد صاحب نے امریکہ میں مقیم ایک اور نیورو سرجن کا ذکر کیا ہے جو وہاں جا کر دولت اور عورت کے چکر میں اس بُری طرح گرفتار ہوا کہ اپنی زبان، تہذیب اور مذہب سب کچھ بھول گیا اور بڑے ہی دردناک انجام سے دوچار ہوا۔

ڈاکٹر شبیر احمد لکھتے ہیں کہ منیر عباسی لیاقت میڈیکل کالج میں ان کا کلاس فیلو تھا۔ یہ 1963ء میں حیدرآباد بورڈ میں اوّل آیا تھا اور بہت ذہین اور لائق نوجوان تھا۔

منیر عباسی نے ایم بی بی ایس سے فارغ ہو کر نیورو سرجری میں تخصص (Specilisation) کیا اور پھر امریکہ چلا گیا۔ وہاں اس نے نیورو سرجری میں کمال حاصل کیا اور بڑی شہرت اور دولت پائی۔ اس نے میساچوسٹس میں ایک محل نما مکان خرید لیا۔ بقول ڈاکٹر شبیر احمد "منیر اپنا ذاتی ہوائی جہاز اڑا کر امریکہ بھر میں نیورو سرجری کرتا۔ دماغ کے مشکل ترین آپریشن کرنا اس کا خاص شوق تھا۔ دماغی امراض، فالج، کینسر، جمے ہوئے خون وغیرہ کے آپریشن کے معاملات میں اس نے بلند مقام حاصل کیا۔ یہاں تک کہ اس نے سپرمین کرسٹوفر ریوز کا بھی معائنہ کیا"۔ ڈاکٹر شبیر احمد کے بقول منیر عباسی کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ وہ امریکہ کے سابق صدر جان ایف کینیڈی کے بیٹے جان ایف کینیڈی جونیئر کا قریبی دوست بن گیا۔

لیکن ڈاکٹر شبیر احمد صاحب کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر منیر عباسی اس دولت و حشمت کے نتیجے میں بہک گیا، وہ دولت اور عورت کا رسیا ہو گیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین امریکی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور تینوں کو طلاق دے دی اور قانونی جھگڑوں نے اس کی دولت کا بیشتر حصہ غارت کر دیا حتیٰ کہ اسے اپنا شاندار گھر اور ہوائی جہاز فروخت کرنا پڑے اور وہ ایک اپارٹمنٹ میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ڈاکٹر شبیر احمد کے بقول اس کی ذہانت زندگی کی تعمیر میں کچھ کام نہ آ سکی۔ غلط فیصلوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ کسی معاملے پر بھرپور توجہ مرکوز کرنے کے قابل جنہ رہا۔

ڈاکٹر شبیر احمد لکھتے ہیں: 28 جولائی 2001ء کو شام پانچ بجے وہ ایک آپریشن کر کے (کرائے کے) ایک جہاز پر واپس میساچوسٹس آ رہا تھا۔ اس نے جہاز رن وے پر اتار لیا تھا لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہوا ہوائی جہاز بے قابو ہو گیا اور ائرپورٹ کی عمارت سے جا ٹکرایا۔ دماغ کے ماہر سرجن کو دماغ پر چوٹ لگی اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔

کاش! ذہین اور لائق لوگ اپنے انجام کا بھی کچھ خیال کر لیا کریں۔

(مصنف کی کتاب "مکافاتِ عمل" سے ماخوذ)

◆■◆

مالکن

چودھری گلاب کنویں سے نکالے بھی گئے مگر وہ تو اُسی وقت مر چکے تھے،
جب اپنے بیٹے کے منہ سے اپنی مالکن کے ساتھ اپنے تعلق کی بات سنی تھی۔

قاضی عبدالستار

1950ء میں جو سیلاب آیا تھا، اس نے سیتا پور سے لے کر لکھیم پور کھیری تک سارے گانجر کا علاقہ تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا لیکن گھاگھرا نے تو کمال ہی کر دیا۔ صدیوں کا بنا بنایا راستہ چھوڑ کر سات میل پیدل چل کر آئی اور سڑک کوٹنے والے انجن کی طرح چھوٹے موٹے دیہات زمین کے برابر کرتی ہوئی رونق پور میں داخل ہوگئی۔ رونق پور پہلے ہی سے خالی ڈھائی کی طرح ننگا پڑا تھا۔ سارے گاؤں میں بس حویلی کھڑی تھی۔ حویلی کی کھڑکیوں سے اکا دکا بدحواس آدمیوں کے چہرے نظر آ جاتے تھے جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے لٹک رہے ہوں۔ حویلی کچی تھی لیکن کوئی سو برس سے گھنگھور برساتوں کے خلاف سینہ تانے کھڑی تھی۔ اس کی دیواروں کی چوڑان پر جہازی پلنگ بچھائے جا سکتے تھے۔ مشہور تھا کہ ایک نوکھیا چور رونق پور کے خاندانی چوروں کا مہمان ہوا۔ رال ٹپکاتی نظروں سے حویلی دیکھ کر ہتھیلیاں کھجانے لگا اور سنکھیوں سے ہاتھ کی صفائی دکھانے کی اجازت مانگنے لگا۔ گھر والے کو دل لگی سوجھی، اس نے کچھ اتا پتہ بتا کر آدھی رات کو روانہ کر دیا۔ مہمان چور ایک دیوار پر سابر لے کر جٹ گیا۔ کھودتا رہا۔ یہاں تک کہ سویرا ہو گیا مگر دیوار اسی طرح کھڑی تھی، اسی ٹھاٹ باٹ سے کھڑی تھی۔ وہ بے چارا ناکام واپس ہوا۔

لیکن بنانے والوں نے حویلی بنائی تھی، جل بھون نہیں بنایا تھا۔ اوپر سے جنتھیا نکھت برس رہا تھا اور نیچے سے بڑھائی ہوئی مست ہتھنی کی طرح گھاگھرا چوٹیں کر رہی تھی۔ پہلے پھاٹک گرا، پھر دیوان خانہ، جب ڈیوڑھی گر گئی اور اندر کے کئی درجے بیٹھ گئے تو چودھری گلاب رائے کی نمک حلالی کو غیرت آئی۔ علاقے بھر کے نامی نامی کہاروں اور مچھیروں کی چھوٹی سی فوج بنائی اور ان کے بازوؤں کے بجرے پر چڑھ کر تھان گاؤں سے نکلے اور رونق پور کی حویلی میں اتر گئے۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی مالکن کو کانپتی ہوئی آواز سے مخاطب کیا۔

''حضور! اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ حکم دیجئے تو جان پر کھیل کر پانی چڑھا لاؤں۔ اگر سرکار کی جوتیاں تک بھیگ جائیں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔''

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ گھاگھرا کی پاگل موجوں کی دل ہلا دینے والی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ چودھری گلاب رائے نے دھیرے سے کچھ اور کہا تو جواب ملا۔ ''تم کیسی چھوٹی باتیں کرنے لگے ہو چودھری گلاب! خدا نہ کرے میری زندگی میں وہ دن آئے کہ میں حویلی کے باہر پاؤں نکالوں اور مرنے والے کے نام پر بٹا لگاؤں۔ کوئی سو برس پہلے یہاں جہاں اب حویلی ہے، رونق پور کا قلعہ تھا۔ انہی دنوں گھاگھرا کی موجوں کی طرح انگریزوں کی توپیں آئی تھیں، ان سے آگ برسی تھی اور قلعہ جل کر راکھ ہو گیا تو کیا ہم بھاگ گئے تھے؟ ہم مٹ گئے تھے۔ ہم آج پھر مٹ جائیں گے''۔ چودھری گلاب کھڑے رہے، مالکن کے پیچ وان کی گڑگڑاہٹ سنتے رہے۔

ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ میر محمد علی بیگ مر چکے تھے۔ میر محمد علی بیگ کی بیوہ پر کسٹوڈین کی مصیبت نازل ہو چکی تھی۔ میر محمد علی بیگ نے نقدی میں چھوڑا ہی کیا تھا اور انہیں چھوڑنے کی پڑی بھی کیا تھی نہ آل نہ اولاد۔ ایک میاں بیوی اور اتنی بڑی جائیداد مالکن نے کیسے پاپڑ بیچ کر حکومت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں، قبرستان ہی گئے ہیں۔ برسوں کی لکھا پڑھی، یقین دہانی کے بعد ایک رات چودھری گلاب الہ آباد سے یہ پروانہ لائے کہ سرکار نے مان لیا ہے میر محمد علی بیگ قبرستان ہی گئے ہیں۔ وہ عجیب رات تھی۔ مالکن ساری رات جانماز پر بیٹھی رہیں، ساری رات شکرانے کی نماز پڑھتی رہیں۔ عورتیں ساری رات پیچ وان تازہ کرتی رہیں، چلمیں بھرتی رہیں جو سلگ سلگ کر جلتی رہیں۔ صبح ہوتے

ہی پٹواری نے حویلی کے پھاٹک کے سامنے ڈگی پیٹ کر زمین داری کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ پھر تو جیسے ٹسں بچ گئی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی زمینیں، باغ اور درخت سب کھیا بتاشے کی طرح بٹ گئے، اڑ گئے۔ جیسے بندوق کا فائر ہوتے ہی چڑیوں کے غول اڑ جاتے ہیں مگر مالکن نے ہمت نہ ہاری۔ چودھری گلاب کو حکم دے دے کر ان گنت مقدمے لڑاتی رہیں۔ حضرت محل نے 1857ء میں فوجیں لڑائی تھیں۔ حضرت محل کی طرح، رونق پور کی مالکن بھی ہار گئیں لیکن حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالکن نے ہار مانی نہیں مگر کب تک؟ ایک ایک کر کے آدمی بکھرنے لگے۔ عورتیں نکلنے لگیں۔ آخر چودھری گلاب نے بھی آنا جانا کم کر دیا اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے تیرے میرے مقدمے لڑانے لگے۔ عید بقر عید اور ہولی دیوالی پر آتے، سیر دو سیر مٹھائی کا دونا اندر بھیج کر وضع داری نبھائے جاتے۔

مقدمے جونک کی طرح لگ گئے۔ مالکن کا ایک ایک قطرہ چوس لیا۔ اندر سے باہر تک سب اجڑ گیا۔ گائے بیل، ادھے، پالکی، خیمے، شامیانے، دری قالین، کرسی میزیں اور دیگ پتیلے سب باورچی خانہ زندہ رکھنے کے لئے جل مرے۔

ایک دن وہ نماز پڑھ کر اٹھیں۔ مونج کی پٹاری کے پان وہاں سے کھجوری گٹھلیوں کے دوہرے اور تمباکو کی چی کی چٹکی کا پھنکا لگایا اور کھنڈر کے اس حصے کی طرف چلیں جو کسی زمانے میں باورچی خانہ کہلاتا تھا اور بغیر دروازوں کے لمبے چوڑے کمرے کے کونے میں لڑھکی ہوئی مٹی کی ہانڈیوں کے منہ دیکھے جو ان کے پیٹ کی طرح خالی تھے۔ تو گھٹنوں پر ہتھیلیاں جما کر دھیرے دھیرے جھکتی ہوئی وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ جیسے جواری سب کچھ ہار کر بیٹھ رہے۔ ان کی لنگراتی ہوئی نگاہیں اس ویران سنسان لق و دق کھنڈر میں گھومتی رہیں جس کی چھتیں گر چکی تھیں، دھنیاں نکل چکی تھیں اور دروازے کی جوڑیاں بک چکی تھیں اور جس کی فضا پر جھینگروں کی طرح چیختے پھرتے حکم کے پابند نوکروں چاکروں کے رت جگوں کو ترس چکی تھی اور ترستے ترستے شاید فراموش کر چکی تھی۔ ان کی بھوکی آنکھوں سے میلے میلے دو آنسو ٹپک کر پیوند لگے موٹی تن زیب کے کھینے دوپٹے میں کھو گئے۔ پھر انہوں نے ایک جانی بوجھی پُر جلال آواز محسوس کی اور کسی نے ان کے ادھیڑ کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ کانپنے لگیں لیکن دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سینے سے ٹکراتی ہوئی مقدس آواز سنتی رہیں، جو محبت کی خلعت پہنے تھی اور ریاست کا چھتر لگائے تھی۔

"زیب النساء بیگم! تم ان درویشوں کی بچی ہو جن کے قلم نے تخت و تاج کے فیصلے کئے ہیں۔ تم تلوار نہیں اٹھا سکتیں، تم قلم نہیں چلا سکتیں لیکن سوئی تو پکڑ سکتی ہو۔ تمہارے ہاتھ کے انگرکھے پہن کر میں نے چھتر منزل کلب کی میموں کے ساتھ ڈنر کھائے ہیں۔ اب کوئی انگرکھے نہیں پہنتا تو کوئی نہ کوئی کرتے ضرور پہنتا ہوگا۔ میں نے لکھنؤ سے کتاوے کے جو کرتے سلوائے تھے، ان کی سلائی اس سستے زمانے میں کیا تھی؟ پانچ روپے فی کرتہ۔ تم ویسا کرتہ تین دن میں سی سکتی ہو۔ نہیں، اس سے اچھا کرتہ دو دن میں سی سکتی ہو بصرف دو دن میں۔"

جب وہ اٹھیں تو ان کی بے پناہ بے قراری کو قرار آ چکا تھا جیسے ایک بھیانک خواب دیکھ کر جاگ اٹھی ہوں، جیسے دن بھر کی سخت محنت کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں خوب دیر تک نہا کر نکلی ہوں۔ وہ بڑے حوصلے سے قدم اٹھا رہی تھیں کہ اس طرف سے آواز آئی جہاں کبھی ڈیوڑھی ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے دوپٹا اس طرح ہٹا کر اوڑھا کہ پیوند ادھر ادھر ہو گئے اور کچے آنگن میں چپلیاں دھیرے دھیرے رکھتی ہوئی اس پھاٹک کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں جو کبھی ڈیوڑھی کے لمبے چوڑے نقشین دروازے کا سہارا

تھا۔

"میں ہوں مالکن! گلاب دین"۔

"اچھے ہو چودھری گلاب؟"

"مالکن کی دعا ہے"۔

"کیسے آ گئے؟"

ایک سندیسا آیا ہے"۔

"کیا؟"

"پاکستان سے خاں صاحب آئے ہیں، وہ جو بڑی مسجد کے پچھواڑے رہتے تھے"۔

"وہ منے خاں؟ جن کا ایک بھائی ہمارے ہاں سپاہیوں میں تھا"۔

"جی ہاں۔ موٹر پر آئے ہیں وہ لکھنؤ سے، کہتے ہیں کہ آپ کے بھائی افضال علی صاحب جو سندھ میں بڑے کمشنر ہیں انہوں نے پتا کر کہلا بھیجا ہے کہ آپ پاکستان چلی آویں"۔

"افضال علی میرا بھائی تھوڑی ہے، رشتے کے چچا کا بیٹا ہے"۔

"انہوں نے آپ کو بلایا ہے بلکہ خاں صاحب تو کہتے تھے کہ ان کو پرمٹ بھی کمشنر صاحب نے اسی شرط پر بنوا کر دیا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ ہی لے کر جائیں"۔

"مجھ نصیبوں جلی پر اب ایسا بھی کیا وقت آن پڑا ہے کہ موئے سپاہی پیادوں کے ساتھ دوسرے ملک میں ماری ماری پھروں۔ اس مائی ملے سے کہنا کہ اپنے ہوتوں سوتوں کو سمیٹ لے جائے اپنے پاکستان کو۔ مجھے تو اب ایک ہی جگہ جانا لکھا ہے۔ جب تک حکم نہیں ہوتا تبھی تک بیٹھی ہوں"۔

"وہ کہہ رہے تھے......"

"گولی مارو چودھری گلاب! کہنا سننا کا ہے کا"۔

"جی بہتر ہے"۔

"ہاں، میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی"۔

"حکم!"

"یہاں رونق پور میں یا کسی اور گاؤں میں کوئی؟"

"جی، میں نے کہا سرکار! میں سمجھا نہیں؟"

"کوئی گرتے پہنتا ہے؟" مالکن نے ایسی بھرائی ہوئی چیخ مارتی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سن کر پھٹ پڑی ہو۔

بوڑھا اور مزاج داں چودھری گلاب اس عجیب و غریب سوال کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ "گرتے؟"

"ہاں، تم سے کیا چھپانا چودھری گلاب! تم تو اس حویلی کے تنکے تنکے سے واقف ہو۔ تم تو اس حویلی کی دائی گیری کر چکے ہو اور دائی سے کیا پیٹ چھپانا۔ آدمی، جن، سب چلے گئے۔ عورتیں اپنے گھر بار کی ہو گئیں۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی بیٹھی لوٹے بڑایا کرتی ہوں۔ رات تو روتے گزر جاتی ہے لیکن دن، یہ پہاڑ ایسے دن چھاتی پر سوار رہتے ہیں۔ ٹالے نہیں ٹلتے ہیں۔ کوئی گرتہ اترتا ہو تو سینے پرونے میں دل اٹک جائے"۔ حویلی کے بوڑھے رازدار کی تصور کی آنکھیں بھولی مالکن کو بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں اور اس کے کانوں میں بے آواز سسکیاں زہر کی بوندیں ٹپکا رہی تھیں۔ "تم کھڑے کھڑے تھک گئے ہو گے چودھری گلاب؟"

"نہیں مالکن! میں شام تک حاضر ہو جاؤں؟"

"مگر دیکھو، کسی رسے چلاہے کا گرتہ نہ لے آنا میرے پاس"۔

"نہیں مالکن!"

"میرا نام نہ لینا کسی سے"۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے سرکار! میں کوئی آج نوکر ہوا ہوں حویلی میں؟"

سڑک کے کنارے املی کے پیڑ کی جڑ سے چودھری گلاب نے اپنا ٹٹو کھولا۔ سوار ہو کر خاں صاحب سے ملے بغیر تھان گاؤں چلے گئے۔ گھر پہنچ کر دیر تک چوپال کے

تکے کھردرے تخت پر بیٹھے سلفہ پیتے رہے۔ جب سورج سر پر آ گیا تب چودھرائن نے دروازے سے جھانک کر چوکے کے تیار ہونے کی خبر دی۔ وہ اونگھتے ہوئے اٹھے۔ آنگن میں نیم کے چھتنار درخت کے نیچے بنے ہوئے پکے کنوئیں کی چبوتریا پر کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ نہائے اور سر جھکا کر چوکے پر بیٹھ گئے۔ چودھرائن روٹی سینک کر رکھتی جا رہی تھیں مگر وہاں پہلا ہی نوالہ ہاتھ میں جھوٹ رہا تھا۔ ”کا تمرا کچھ جی ماندا ہے؟“

”ہاں“۔

”تھوڑا بہت تو کھائے لیو“۔

”تمرے پاس بھلا کچھ روپے ہیں؟“

”روپے؟ مورے پاس تو ایک چھدام نا ہیں ہے“۔

بڑکئو کے کچھ دام دھرے ہیں؟“

”ہیں، کوئی دس کم پچاس“۔

”لئی آؤ“۔

”ابھیں؟“

”ہاں“۔

”پہلے روٹی تو کھائے لیو“۔

”پہلے لئی آؤ“۔

چودھری گلاب نے مارکین کی تھیلی سے چالیس روپے کے کاغذ نکال کر گنے اور تھالی چوم کر کھڑے ہو گئے۔ چودھرائن پہلے تو آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہیں پھر بکنے جھکنے لگیں لیکن چودھری نے اُن کی بکواس پر کان نہ دھرے۔ الگنی سے اپنا کرتا اتار کر پہنا، دھوتی بنا کر باندھی، ٹوپی سر پر اور انگوچھا کندھے پر رکھ کر باہر نکل آئے۔ گھاس کھاتے ہوئے ٹٹو کے منہ پر لگام چڑھا دی اور اُچک کر سوار ہو گئے۔ بھورا ٹٹو اپنی چال پھر چل رہا تھا لیکن گلاب کے ذہن میں آٹا پیسنے والے کئی انجن ایک ساتھ دھڑ دھڑا رہے تھے۔ چودھری گلاب میر محمد علی بیگ کے زمانے میں منشی تھے مگر جب حویلی اجڑنے لگی اور بڑے چھوٹے دونوں مختار شہد کی مکھیوں کی طرح دوسرے باغوں کی طرف سدھار گئے تو مالکن نے اپنے ایک ٹکے کی ذمے داری چودھری گلاب کو سونپ دی۔ چودھری اُن لوگوں میں تھے جو اپنا پیٹ کاٹ کر آنے والے بُرے دنوں کا منہ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ بچا رکھتے ہیں لیکن لڑکوں کی شادی بیاہ کے جھمیلوں میں سب جمع جتھا پر لگا کر اڑ گیا۔ اُن کا بڑا لڑکا تحصیل میں اور چھوٹا نہر کے محکمے میں چپڑاسی تھا دونوں خود تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ دونوں مڈل پاس تھے لیکن چودھری کی لاکھ دوڑ دھوپ کے باوجود نہ کوئی پٹواری ہو سکا نہ پٹرولر۔ مجبوراً انہوں نے چپڑاسیوں میں بھرتی کرا دیا اور وہ آئے دن منہ پھاڑے، ہاتھ پسارے ان کے سامنے کھڑے رہتے چودھری خود ہی کنگھ بیٹھے تھے، ان کا بھرنا کہاں سے بھرتے۔ اس وقت گھر والی کی بات سے وہ چکر میں پڑ گئے۔ بڑکوا اتنا گرہست اور سگھڑ کیسے ہو گیا، کب سے ہو گیا، یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بکی سب الا بلا سوچتے رونق پور کے گنج میں آ گئے۔ بزاز بے کی دکان پر انہوں نے اپنا ٹٹو روکا اور اتر کر بہت بڑھیا والی تن زیب کا تھان پر کھنے لگے۔ دو کرتوں کا کپڑا بغل میں مار کر وہ سیدھے حویلی پہنچے۔ دل ہی دل میں اپنے باپ منشی چودھری شتاب رائے کی پڑھائی ہوئی فارسی کا سارا آموختہ دہرا کر مالکن سے مخاطب ہوئے۔ انہیں یقین دلایا کہ پوری رازداری کے ساتھ وہ چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے کرتوں کا کپڑا لے آئے ہیں۔ یہ کہتے کہتے اُن کا حلق سوکھ گیا، کانٹے اُگ آئے۔ ساری جان پسینے میں شرابور ہو گئی۔ اُن کی مٹھی میں دبی ہوئی پچیس روپیوں کی پڑیا بھیگ گئی مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ کر، کیا بہانہ بنا کر یہ پچیس روپے مالکن کے ہاتھ پکڑا دیں۔ آخر وہ ہار کر اپنے لکڑی کے پیروں پر اپنے جسم کا منوں بوجھ گھسیٹتے ہوئے رونق پور کے بنیے کی دکان

پر آگئے۔

رام پرشاد گدی پر بیٹھا گاہکوں کو پڑیاں بانٹ رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے مالکن کا حساب مانگا تو پتہ چلا وہ سو سے اوپر پہنچ چکا ہے اور اسی لئے رام پرشاد نے مالکن کا سودا بند کر دیا ہے اور مالکن کا رو رو کر جلتا ہوا چولھا بجھ گیا ہے۔ وہ رام پرشاد کی دکان کے تختے پر بیٹھے پچیس روپیوں کی پڑیا کو نہارتے رہے۔ بیٹھے رہے پھر اٹھ کر اپنے ٹٹو پر سوار ہو گئے جیسے لڑائی میں ہار مان لی ہو۔

مالکن دیر تک کپڑا لئے جھلنگے کھٹولے پر پڑی رہیں انہیں پہلی بار یہ معلوم ہوا تھا کہ کرتا سینے کے لئے صرف چٹکی کا ہنر اور آنکھوں کی روشنی ہی کی نہیں، سوئی اور دھاگے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جتنے پیسوں میں سوئی دھاگا آتا ہے، اتنے میں ایک وقت کے آلو اور دو وقت کے چنے آجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خدا نے ان کی سن لی اور ان کی ناؤن ناخن کاٹنے آگئی۔ وہ ہڑبڑا کر اپنے خیالوں کی پکی نیند سے چونک پڑیں اور ناؤن سے ایسے لہجے میں مخاطب ہوئیں کہ اس لہجے میں اگر اپنے سنہرے دنوں میں مخاطب ہوئی ہوتیں تو وہ سارے رونق پور میں اپنی خوش نصیبی کا ڈھنڈورا پیٹ آتی۔ "ارے اے قادر کی بٹیا!"

"جی جی جی؟"

"میرا ایک کام کر دے گی اتنے وقت؟"

"بتائیے"۔

"ذرا لپکی ہوئی رام پرشاد کی دکان چلی جا۔ ایک مہین سوئی اور ایک چھوٹی چپک تو لے آ لیکن بٹیا اس سے میرا نام نہ لینا نہیں تو ٹکا سا جواب پکڑا دے گا۔ کل میں نے ایک پیسے کا نمک...... خیر چھوڑو تم ذرا لپکی جاؤ"۔

قادر کی لڑکی اپنی دھنی کنپٹی پر لیکھ ٹٹولتی ہوئی دلہنوں کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی ہوئی آنگن سے نکل گئی۔ مالکن بیٹھی سوچتی رہیں۔ معلوم نہیں کیا سوچتی رہیں۔ جب ناؤن سوئی تاگا لے آئی تو اسی سے اس کی قینچی منگوا کر کرتا بیونتنے بیٹھ گئیں۔ قینچی چلاتے چلاتے خیال آیا کہ چودھری چیت پور کے ٹھاکر کی ناپ تو لی لائے ہی نہیں، کرتا کیسے کاٹا جائے۔ وہ بجھ کر رہ گئیں۔ تھان گاؤں اچھا خاصا تین چار میل دور تھا، اب ایسا آدمی اس وقت کہاں جڑتا جو اسی وقت چودھری کو بلا کر لاتا۔ پھر انہوں نے دیوار پر چڑھتی ہوئی دھوپ دیکھی اور یاد کیا کہ آج منگل ہے اور ہر منگل، اتوار کو رونق پور میں بازار لگتا ہے۔ ممکن ہے ٹھاکر بازار کرنے آجائیں۔ اپنے اس وہم پر بھروسا کر کے وہ ایک بار پھر بڑے حوصلے سے اٹھیں۔ بدھنے میں گھڑے سے پانی انڈیلا، وضو کیا اور نماز کے لئے وہ چٹائی بچھائی جس میں کپڑے کے پیوند لگے تھے۔ جیسے تیسے نماز کا فرض ادا کیا۔ گھڑی بھر وظیفہ پڑھا اور ایک لمبی سی دعا مانگی۔ "اے پاک پروردگار! اپنے حبیب کے صدقے میں چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے دل میں نیکی ڈال دے کہ وہ خود آکر اپنے کرتے کی ناپ دے جائیں اور میری خوشامد کریں کہ میں کل تک ان کا کرتا سی دوں۔ اے پروردگار عالم! مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ساری رات بیٹھ کر لالٹین کی روشنی میں کرتا سی سکوں"۔

وہ گڑگڑاتے گڑگڑاتے نڈھال ہو گئیں اور اسی جانماز پر دوہری ہو کر پڑ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی مہترانی دو وقتی کمانے آئی تھی۔ وہ نئی امید سے تازہ دم ہو کر اٹھیں۔ "بانکے کی بہو!"

"جی جی!"

"بانکے ہے گھر پر؟"

"ہیں تو بی بی"۔

"ذرا جلدی سے جا کے بلا تو لا۔ کہیو، کوئی کام نہیں ہے۔ بس ایک بات پوچھنا ہے"۔ وہ الٹے پیروں چلی گئی۔

پھر دروازے سے آواز آئی۔ "سرکار کی جے ہو۔ چوپاٹ بنار ہے"۔

"بانکے!"

"مالک!"

"چیت پور تمہاری جمانی ہے؟"

"ہے سرکار!"

"ٹھاکر گھنشیام سنگھ کو جانتے ہو؟"

"اُن کا سرکار کون ناہیں جانت ہے۔ دور دور تک اُن کا نام باجت ہے۔"

"بازار تو آتے ہوں گے؟"

"برابر مالک! برابر"۔

"تو ذرا تم خیال کر کے اُن کو میرے پاس بلا لانا۔ مجھے ایک کام ہے اُن سے"۔

"بہت ٹھیک حجور! اکھیں لیو آپ"۔

بانکے تو اپنا چہرہ دھا جوتا بجاتا ہوا اور زنی ہوئی دعائیں دیتا ہوا چلا گیا لیکن مالکن اُسی جگہ کھڑی ہوئی اپنی زبان کی ذرا کی پر پچھتاتی رہیں اور دعا مانگتی رہیں کہ خدا کرے ٹھاکر دروازے پر نہ آئیں بلکہ کسی نوکر کے ہاتھ کہتا بھیج دیں ورنہ میں کس طرح اُن سے بات کروں گی، کیا کہوں گی۔ یا اللہ، کچھ ایسا کیجو کہ مرنے والے کے سامنے میری آنکھیں نیچی نہ ہوں۔

بانکے نے اپنے سوپ پیٹھ پر باندھے اور اس نکڑ پر بیٹھ رہا جہاں ادھے کھوسلے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بیلوں کے گھنگرو بجاتا اور دھول کے بادل اڑاتا ٹھاکر کا ادھا آ گیا۔ وہ اپنے سوپ سنبھال کر اٹھا ہی تھا کہ ایک گاہک پھانس پڑا۔ اُس نے گاہک کو ٹالنے کے لئے بڑی نرمی زبان میں بات کی لیکن گاہک نے پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر پیسے گنتا ہوا بانکے ٹھاکر کی طرف لپکا۔ ٹھاکر آدمیوں کو چیرتے ہوئے رام پرشاد کی دکان پر پہنچے۔ رام پرشاد نے [illegible] بیٹھ کر

تولیے سے اپنا منہ پونچھا، اُسی سے پاؤں جھاڑے۔ نگاہ اٹھائی تو سامنے بانکے جھکا ہوا ڈنڈوت کر رہا تھا۔

"کا ہے رے؟"

"ایک اجر (عذر) ہے۔"

"ہاں۔"

"مائی آپ کو بلائین ہیں۔"

"مالکن؟"

"ہاں، یہاں کے سرکار کی مالکن۔"

"اچھا، کا ہے بلائی ہیں؟ کچھ اتا پتہ ہے بھلا؟"

"یو سرکار آپ جان سکت ہو۔ ہم تو حکم کے تابع دار ہیں۔"

ٹھاکر تحصیل کے بڑے زمیں داروں اور میر محمد علی بیگ کے دوستوں میں تھے اور مرنے والے کے برفاتے میں شریک ہوئے تھے لیکن اس کے بعد بھول کر بھی ڈیوڑھی کے سامنے سے نہ گزرے تھے، اب آج اس اچانک طلبی پر گھبرا گئے تھے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ چودھری گلاب پر نظر پڑ گئی۔

"اے چودھری! اے مالکن کا ہے بلائی ہیں ہم کا؟"

چودھری کا خون خشک ہو گیا۔ ٹوپی کا زاویہ ٹھیک کر کے الفاظ چبانے لگے۔ "وہ...... وہ دراصل مالکن نے آپ کو اس لئے تکلیف دی تھی کہ ایک کام کے سلسلے میں اُن کو میری ضرورت پڑ گئی تھی اور کسی نے ان کو خبر دی تھی کہ آپ کی سواری تو تھان گاؤں سے گزرے گی ہی...... اس لئے آپ کو"۔

"اچھا، اچھا تو مطلب یہ ہے کہ اب وہاں میرے جانے کی ضرورت نہیں رہی؟"

"آپ اب کیا کیجئے گا تکلیف کر کے"۔

ٹھاکر کے ذہن سے بوجھ ٹل گیا اور چودھری کو ایسا لگا جیسے ریل گاڑی سے گرتے گرتے بچ گئے ہوں۔

مالکن چودھری گلاب کا دیا ہوا کرتہ دیکھتی رہیں جو

سن لائٹ صابن سے پیچھا گیا تھا اور سن لائٹ صابن کی بدبو میں بسا ہوا تھا۔ شکنیں تک برابر نہیں ہوئی تھیں پھر یہ سوچ کر بیٹھ رہیں کہ جب رونق پور پر یہ قیامت بیتی ہے تو چیت پور پر بھی کچھ نہ کچھ گزر رہی گئی ہو گی۔ پھر وہ کرتا تراشنے لگیں۔ جب تک اندھیرا نہ ہو گیا اور اُن کو سوئی نظر آتی رہی، وہ اسی طرح بھیگی آنکھیں جھکائے اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرتی رہیں۔ روٹی دال کے خواب دیکھتی رہیں۔

مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے پیتل کی وہ لالٹین جلائی جس کی چمنی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور تھوڑی دیر بعد بھک اٹھی تھی جیسے مالکن کی چتا پر روتے روتے اُس کی ہچکیاں بندھ گئی ہوں۔ دھکتے ہوئے سر پر چیتھڑے کی پٹی باندھے غمگین آنکھوں سے کپڑا ہڑبڑائے وہ سیتی رہیں۔ جھاگ ایسی سفید تن زیب کے ویرانے میں لکڑیاں بجتی رہیں، دال چنتی رہیں۔ کندن کے دانوں جیسے گیہوں کا اجلا اجلا آٹا گوندھنے کا ارمان کرتی رہیں۔ پھر سر چکرانے لگا، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے سدھ ہو کر بانس کے کھٹولے پر ڈھیر ہو گئیں۔

جیسے جیسے چودھری گلاب کے ٹین کے بکس میں پھول جیسی سلائی کے تل کرتوں کی تعداد بڑھتی گئی، ویسے ویسے اُن کے چہرے کی جھریوں کا جال اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ کھچڑی بال ایک دم سے پک گئے جیسے پلاؤ کے چاول دودھ میں ابال کر پیالے میں چوٹی تک بھر دیئے ہوں۔ گھر پر اداسی چھا گئی پہلے خود چودھرائن نے گلاب کو سمجھایا پھر لڑکوں کو حلقے سے بلا کر اس مورچے پر لگا دیا۔ پھر تینوں نے مل کر ایک دوپہر کو گھر کے آنگن میں مہابھارت چھیڑ دی۔ دھیرے دھیرے بات بڑھتی گئی اور خون گرم ہوتا گیا۔ چھوٹے نے جو تاڑی کے ایک ہی گھونٹ میں بورا گیا تھا کڑک کر کہا۔ ''ارے اماں! تم کا جانو۔ یہ بڑھوا اوئی سکینہ بیٹی سے پھنسا ہے''۔

بوڑھے چودھری گلاب رائے جن کی جوانی ان کے اپنے سر کی طرح بے داغ تھی، یہ بھیانک الزام سن کر دیوانے سے ہو گئے۔ وہ جہاں کھڑے ہوئے چوکھی لڑ رہے تھے، وہیں دھپ سے زمین پر بیٹھ گئے یا اس طرح گرے کہ بکھر نہ سکے۔ چھوٹا لڑکا ثبوت دے رہا تھا۔

''جب بھیا (سیلاب) آئی ہے تب انہیں تو جان پر کھیل کے اوئی بدھا اس کا بچاوے گئے رہیں؟ گئے رہیں کہ نا گئیں گئے رہیں؟ تم اپنے منہ سے بتاؤ اماں!''

چودھری گلاب کی بے نور آنکھوں نے گھر والی کے چہرے پر یقین کی پرچھائیں دیکھ لی جیسے شکاری نے زخمی جانور پر دوسرا فائر کر دیا ہو۔ وہ اپنی کانپتی ٹانگوں پر اپنی لاش اٹھا کر اٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے دروازے سے نکلے۔ اپنی چوکھٹ، اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر میں ڈالی ہوئی چوکھٹ (دہلیز) دونوں ہاتھوں سے چھو کر چومی اور اپنے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر اپنی آنکھوں سے ایک آنسو بہائے بغیر چل کھڑے ہوئے۔ گاؤں کے باہر اس پکے کنوئیں پر چڑھ گئے جس کی جگت (منڈیر) آدمی بھر اونچی تھی اور اسی طرح ٹوٹ کر گرے جیسے گراری تک آئے ہوئے جھاڑی گھڑے کی رسی ٹوٹ جائے۔ اتنے زور کا دھماکا ہوا کہ سارا گاؤں ہل گیا گاؤں کا گاؤں الٹ پڑا۔ آدمی کنوئیں کے اندر اتر گئے۔ چودھری گلاب کنوئیں سے نکالے بھی گئے مگر وہ تو اسی وقت مر چکے تھے، جب اپنے بیٹے کے منہ سے اپنی مالکن کے ساتھ اپنے تعلق کی بات سنی تھی۔

کہانیوں سے پھیلی کہانیوں سے انسانوں، گاؤں کے ان انسانوں کو جن کی زندگی ہر طرح کی بھوک سے بلبلاتی رہتی ہے جو پیدائشی محبت ہوتی ہے، اُس محبت نے چودھری گلاب کی خودکشی کے خاکے میں رنگ بھر دیا۔ اپنی مرضی کے مطابق اپنے تصور کے چٹخارے کے مطابق گہرے سے گہرا رنگ بھر دیا اور مشہور ہو گیا کہ مالکن تو چودھری گلاب پر میر محمد علی بیگ کی زندگی ہی میں مرتی تھیں۔ اُن کے گزرنے کے بعد اور کھل کھیلیں۔ منے خاں

نے کتنا کتنا سمجھایا لیکن وہ چودھری کو چھوڑ کر پاکستان جانے پر رضامند نہ ہوئیں حالانکہ لوگ اپنی آل اولاد، اپنے محل دو محلے اور اپنے گاؤں گراؤں تک چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔

پھر مالکن کو علاقے کی وہ آوارہ عورتیں ناک پر انگلی رکھ کر گھورنے لگیں جن کی جوانی کی کالی رات جھوٹے عاشقوں کے گندے بوسوں کے چراغوں سے جگمگا چکی تھی۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ ادھیڑ مالکن کی کمر سیدھی تھی۔ ایک سفید لٹ چاندی کے جھومر کی زنجیر کی طرح ان کے ماتھے پر جھولتی رہتی، نازک ناک نقشے کے سفید چہرے پر بھوک نے سائے تو ڈال دیے تھے لیکن برسوں کی حکومت اور امارت کی بخشی ہوئی چمک ابھی مرجھی نہیں پائی تھی۔ ان گنت جاگتی راتوں نے اُن کی آنکھوں کا نشہ سکھا دیا تھا لیکن اب بھی جب وہ سیاہ پلکیں ہٹا کر آنکھیں پوری کھول دیتیں تو بات کرنے والے کی نظریں چوروں کی طرح راستہ ڈھونڈنے لگتیں۔ نوکرانیوں کے سے پھٹے پرانوں کپڑوں میں بھی وہ بیگموں کی طرح جگمگایا کرتیں۔ دل ہلا دینے والی یادوں کے زرنگار قافلے اُن کی افسردہ آنکھوں کے سامنے دبے پاؤں گزرا کرتے۔ چیت بیساکھ کو جلتے سلگتے دن، ساون بھادوں کی روتی دھوتی کلوٹی راتیں سب کھوٹے سکوں کی طرح ان کی زندگی کی گولک میں کھن کھنایا کرتیں اور وہ اُن سب کی طرف سے بے نیاز اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں اور تکلیفوں کے بھاری بوجھ تلے کراہتی رہتیں۔

اُس دن جب وہ چودھری گلاب کا انتظار کرتے ہوئے سوکھ چکی تھیں اور اُن بسیا تک دنوں کا انتظار کرنے لگی تھیں جو فاقوں کی سوغات لے کر آنے والے تھے کہ چودھری گلاب کی خودکشی کی کہانی ٹوٹی پھوٹی دیواریں پھلانگ کر کچے آنگن میں چڑیل کی طرح ناچنے لگی، قہقہے لگانے لگی، اُن کے منہ پر تھوکنے لگی۔ رونق پور کی مالکن کے اُس منہ پر تھوکنے لگی جس کے سامنے رونق پور کا سارا علاقہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جسارت نہ کر سکتا تھا۔ وہ اٹھ کر بغیر دروازے والی کوٹھری میں گر پڑیں۔ ننگی زمین کے ٹھنڈے فرش پر گھٹنے موڑ کر اُس خدا کے سامنے گڑگڑاتی رہیں جو اپنے پیارے بندوں پر اس لیے مصیبتیں ڈالتا ہے کہ اُن کا امتحان لے سکے اُن کے ایمان کو جگمگا سکے۔ اُسی دن انہوں نے رونق پور کی اپنی تمیں برس کی زندگی میں پہلی بار چودھری گلاب کو مرد کے روپ میں دیکھا کہ حویلی کے اندرونی حصے کے دوسرے درجے کے سیاہ ستونوں والے والان کے پیچھے لانبے کمرے میں جوٹ کی موٹی موٹی چٹائیوں پر فرشی قالین پڑے ہیں۔ تخت پر مسند لگائے میر محمد علی بیگ بیٹھے ہیں۔ دور کونے میں سلگتی ہوئی مہکتی ہوئی سلک کی کامدار نے ان کے زانو پر پڑی ہے۔ انگلیاں گنگا جمنی منہال سے کھیل رہی ہیں اور نگاہ دیوار گیری پر چڑھی ہوئی ہے۔ سامنے ہاتھی دانت کے کام کی بھاری میز ناشتے کی پلیٹوں کا بوجھ اٹھائے کسی خوب صورت کنیز کی طرح کھڑی ہے۔ وہ اپنی مسہری سے اٹھیں۔ ایک ہاتھ میں فرشی پائجامے کے پائنچے اٹھائے، دوسرے ہاتھ میں اصفہونی تیل کے بوجھ سے لٹکتے ہوئے دوپٹے کا پلو سنبھالا۔ موٹے موٹے زیوروں سے ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرتی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور ان کے ململ کے کرتے کی فی دلی آستین پر انگشتانوں اور انگوٹھیوں سے سجا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔

”تم اتنے اداس کیوں ہو؟“

”نہ تو تم نے غسل کیا نہ ناشتہ۔ کتنی دیر سے اسی طرح چپ چپ بیٹھے ہو۔“

”ہوں“۔

”ایک بات کہوں؟“

”ہوں“۔

”غصہ تو نہ کرو گے؟“

”اوں ہوں“۔

”حکیم ڈاکٹر دوا کرتے ہیں، نصیبا نہیں بناتے۔ مجھ

کوکھ جلی کے مقدر ہی میں اولاد نہیں تو حکیم ڈاکٹر کیا کرلیں گے۔ میری مانو تو دوسری شادی"۔

"چپ رہو"۔

وہ اتنے زور سے گرجے کہ باورچی خانے میں کام کرتی عورتوں کے ہاتھ سوکھ گئے۔ کتنی ہی دیر تک ویسی ہی پرجلال خاموشی چھائی رہی۔ پھر ایک عورت سائے کی طرح چلتی ہوئی آ کر تخت کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے اشارے سے پوچھا۔

"چودھری گلاب ڈیوڑھی پر کھڑے ہیں"۔

"بلاؤ"۔

والان کے پردے بندھے تھے۔ کمرے کے دروازوں پر چلمنیں پڑی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اوسط قد کا سوکھا سا کالا آدمی آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کرتے کے مونڈھے پر پیوند لگا تھا۔ دھوتی کرتے سے زیادہ اجلی تھی۔ دھوتی سے نکلی ہوئی سوکھی ماری پنڈلیاں دھول میں اٹی ہوئی تھیں۔ پنجے جوتوں میں بند ہونے کی وجہ سے صاف تھے، گھٹے ہوئے سر پر رکھی ہوئی ٹوپی میں میل کی گوٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ سہما ہوا کھڑا تھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک جھولا سنبھالے ہوئے تھا۔ "دوا لے آئے؟"

"ہاں سرکار!" اس آدمی نے گڑگڑا کر کہا۔

"دے دو"۔

اس نے دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو اس طرح جھولا پکڑا دیا جیسے وہ جھولا نہیں، شیشے کا پیالہ ہو اور اس میں لبالب عطر بھرا ہو۔ پھر آواز آئی۔ "چودھری گلاب کو دو آنے پیسے اور خوراک دلا دو"۔

اب ان کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے میلے میں کھو گئی تھیں۔ جب وہ اپنے آپ سے ملیں تو دھوپ آنگن میں اتر آئی تھی۔ رات وہاں میں آئے ہوئے جان و... بڑا لنے کے سارے منصوبے بوڑھی زخمی لالٹین کی طرح ... تھے۔ وہ باہر نکلی ہی تھیں کہ کمرے

ٹوکرے دھرے اور ہاتھ بھر کا گھونگٹ نکالے بانکے کی بہو کمانے آ گئی۔

"ارے تُو چیت پور جائے گی؟"

"ہاں بی بی!"

"تو ذرا ٹھاکر سے کہہ دینا کہ اگر بازار آ ویں تو مجھ سے مل لیں"۔

"بہت اچھا"۔

مالکن باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھی کہ دروازے پر تیز تیز آوازیں شریر لڑکوں کی طرح اچکنے پھاندنے لگیں۔ مالکن کا اشارہ پا کر بانکے کی بہو گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک لمبی دبلی عورت کے ساتھ واپس آئی۔ وہ لال کنارے کی سفید ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ مہترانی نے عورت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ "ای تھان گاؤں والے چودھری گلاب کی چھوٹی بہو ہیں، لیلا دھر کی دلہن"۔

مالکن چونک پڑیں۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر سوچنے لگیں کہ اسے کس طرح مخاطب کریں اور کیا خاطر کریں۔ چودھری گلاب کی چھوٹی بہو نے اپنی بغل سے مڑے ہوئے کرتے نکالے اور مالکن کے ہاتھ میں پکڑا کر تذلیل کرتی ہوئی آواز میں سنسنائی۔ "ای کرتے آپ دھر لیو"۔

جملہ ختم کرتے ہی وہ تیر کی طرح باہر نکل گئی۔ مہترانی تھوڑی دیر کھڑی رہی پھر دوسرا گھر کمانے چلی گئی۔ مالکن پھول سے کورے کرتے تھامے اسی طرح آنگن میں کھڑی رہیں جیسے زندگی کی لڑائی میں ہار مان لی ہو اور مصیبتوں کی فاتح فوجوں کے سامنے سفید جھنڈا کھول دیا ہو۔

شام کو ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے چیت پور کے ٹھاکر تمنشیام سے مالکن کہہ رہی تھیں۔ "اپنے کرتوں کی تن زیب آپ بھیجتے رہیے گا۔ فی الحال میرے یہ چاروں کرتے بکوا دیجیے"۔

ہمارے ملک میں گناہ اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ اللہ نے ہمارے ملک پر لعنت ڈال دی ہے۔

تیزاب

☆ نسیم سکینہ صدف

میں پچھلے مہینے اسلام آباد جا رہی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھی ہی تھی کہ ساتھ والی سیٹ پر ایک نوجوان لڑکی جس کی عمر 25 سال سے کچھ کم ہی ہوگی، آ کر بیٹھی۔ بڑی خوبصورت لڑکی تھی لیکن اس کا چہرہ ایک طرف سے ہی حسین تھا، دوسری طرف ایسا بھدا نشان تھا جیسے وہاں سے چہرہ جل گیا ہو۔

میرے ذہن میں اخباروں میں چھپنے والی خبریں گھومنے لگیں کہ لڑکے نے رشتہ نہ ملنے پر لڑکی کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا۔ ناکام عاشق نے محبوبہ کے چہرے پر تیزاب پھینک کر جلا دیا۔ مجھے یہ بھی کوئی ایسی ہی کہانی لگی۔

گاڑی چلی تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے..... وہ بھی اسلام آباد جا رہی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں اور پھر اُس سے پوچھا کہ اس کا چہرہ کس طرح جلا تھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر کچھ اور ہی تاثرات آ گئے تھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ اس سوال سے ڈر گئی ہو یا جیسے اس نے یہ محسوس کیا ہو کہ میں نے اس کی خوبصورتی پر طنز کی ہے۔

اُسے نارمل ذہنی حالت میں لانے کے لئے مجھے بہت سی باتیں کرنی پڑیں۔ میری باتوں میں اور میرے انداز میں جو خلوص اور ہمدردی تھی، وہ اس نے محسوس کر لی۔

"اگر آپ مجھ سے یہ سوال نہ ہی پوچھتیں تو اچھا تھا"۔ اس نے کہا۔

"مجھے غلط نہ سمجھنا میری بہن!" میں نے کہا۔ "یہاں عورتوں کے ساتھ بہت کچھ ہو جاتا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ اگر میں تمہیں ایسی عورتوں کی کہانیاں سناؤں تو تم اپنے چہرے کے اس زخم کو بھول جاؤ"۔ میں نے خلوص اور ہمدردی سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ کبھی میرے منہ کی طرف دیکھتی اور کبھی سر جھکا لیتی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ مجھے اپنے چہرے کے اس بھدے داغ کی کہانی سنائے یا نہ سنائے۔ میری حوصلہ افزائی اور میرے خلوص نے اُسے قائل کر ہی لیا۔ اُس نے جو بات سنائی وہ میں اُسی کی زبانی پیش کرتی ہوں۔

ہمارے ملک میں ایسا سسٹم چل رہا ہے کہ ایک آدمی کماتا ہے اور پورا کنبہ کھاتا ہے۔ یہ آدمی معذور ہو جائے یا دنیا سے اٹھ جائے تو پورے کا پورا کنبہ محتاج اور فاقہ کش ہو جاتا ہے۔ یہی حادثہ ہماری فیملی میں ہوا۔ ہمارے والد صاحب فوت ہو گئے۔ وہی صورت پیش آ گئی جو میں نے بتائی ہے۔ آمدنی کا یہ ایک ہی ذریعہ تھا جو بند ہو گیا۔ گھر میں نوبت فاقوں تک آ گئی۔

ہمارے ہاں رسم و رواج ایسے ہیں جن سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ گھر میں جو تھوڑے بہت پیسے تھے وہ والد صاحب کی وفات کے بعد کی رسموں میں خرچ ہو گئے۔ چالیسویں پر ہمیں کچھ رقم قرض لینی پڑی۔ رشتہ داروں اور برادری والوں میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ تمہارے پاس پلے کچھ نہیں، لو ہم تمہاری مالی مدد کرتے ہیں۔ اس کی بجائے برادری کے بزرگوں نے زور دے کر کہا کہ مرحوم اچھے نام والے تھے اس لئے ان کا چالیسواں پوری شان و شوکت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ ہم نے رشتے، برادری کی پابندیوں اور ان کی باتوں سے مجبور ہو کر قرض لیا اور چالیسویں کی رسم پوری کی۔ مجھے معلوم نہیں کہ خدا راضی ہوا یا نہیں، البتہ برادری والے خوش ہو گئے۔

یہ قرض ادا کرنا تھا لیکن سب سے بڑا اور سب سے زیادہ تلخ سوال یہ تھا کہ دو وقت کی روٹی کہاں سے ملے گی؟ میں گھر میں بہن بھائیوں سے بڑی ہوں۔ ان کی تعلیم کا مسئلہ بھی تھا۔ میری ماں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی تھی کہ لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھے اور جھاڑو پونچھا کرے۔ یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں صرف دس جماعتیں پڑھی ہوں۔ والد صاحب نے اس خیال سے آگے نہ پڑھنے دیا کہ لڑکی نے تو آخر ایک گھر بسانا ہے، زیادہ تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں۔

گھر میں میں ہی تھی جو کوئی کام کر سکتی تھی۔ میں نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ بات کی کہ وہ اپنے بھائیوں اور باپوں سے کہیں کہ مجھے کہیں جاب دلا دیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کے والد نے میرے لئے ایک جاب ڈھونڈ نکالی۔ یہ ایک بیوٹی پارلر تھا جس میں مجھے کام کرنا تھا لیکن پہلے اسی پارلر میں ٹریننگ لینی تھی۔

یہ صاحب مجھے وہاں لے گئے بہت بڑا پارلر تھا۔ میں تو اس کے اندر جا کر گھبرا گئی کہ یہ تو بہت ہی صاف ستھری اور ماڈرن جگہ ہے۔ مجھ پر کمتری کا احساس طاری ہو گیا۔ اس پارلر کی مالکن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ میری سہیلی کے والد نے اس خاتون کو بتایا کہ میری کیا مجبوری ہے اور مجھے جاب کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

مالکن کے ہونٹوں پر جو ہلکی سی مسکراہٹ آئی وہ کوئی عام سی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس نے مجھے خندہ پیشانی سے نوکری دے دی اور کہا کہ میں کل سے کام پر آنا شروع کر دوں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مجھے پانچ سال کے لئے ایک بانڈ بھرنا ہو گا جو ایک قانونی معاہدہ ہو گا کہ میں پانچ سال اس پارلر میں کام کروں گی۔ مطلب یہ کہ میں پانچ سال کے اندر اندر نوکری چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ ٹریننگ کے دوران تنخواہ کچھ کم تھی، اس کے بعد تنخواہ کا ریٹ اچھا تھا۔ میں نے بانڈ پر دستخط کر دیئے اور کام کرنے لگی۔ میں نے سوچا کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔

وہاں مجھ جیسی کچھ اور لڑکیاں بھی کام کرتی تھیں۔ وہ مجھے بڑے اچھے طریقے سے ملیں لیکن میں نے دیکھا کہ ان کا انداز ویسا نہیں تھا جیسا محلے کی گھریلو لڑکیوں کا

ہوتا ہے۔ میں نے جب وہاں کچھ دن کام کیا تو میں نے دیکھا کہ مالکن کا رویہ ایسا سخت اور بدبو والا تھا جیسے اس نے ہم سب لڑکیوں کو خرید رکھا ہو۔ میں نے دو تین لڑکیوں سے پوچھا کہ یہ کام کیسا ہے اور یہ مالکن اتنی بدتمیزی سے کیوں پیش آتی ہے؟

میں نے جس لڑکی سے بھی پوچھا، اس نے کہا کہ کام بہت اچھا ہے لیکن یہ خیال رکھنا کہ مالکن کوئی بھی فرمائش کرے یا کوئی کام بتائے تو وہ خندہ پیشانی سے کرنا۔ اس سے تمہاری آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہوگا۔

میں ان کی یہ بات ٹھیک طرح سے سمجھ نہ سکی۔ میں سمجھی کہ مالکن زیادہ سے زیادہ یہ حکم دے گی کہ آج رات تک کام کرنا ہے، میں رات تک رک جایا کروں گی۔ اس طرح مالکن کچھ اوور ٹائم دے دے گی۔

میں نے چار ساڑھے چار مہینے کام کیا اور لڑکیوں کے بال بنانے میں مجھے خاصی مہارت حاصل ہو گئی۔ ایک شام مالکن نے مجھے کہا کہ اوپر جاؤ، وہاں بہت اچھے کپڑے پڑے ہیں، وہ پہنو اور اس سے پہلے منہ دھو کر میک اپ کرلو اور بال اچھی طرح سنوار کر نیچے آؤ۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اوپر جا کر اسی طرح تیار ہوئی جس طرح اس نے کہا تھا۔ میں جب نیچے آئی تو وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے لباس اور انداز سے پتہ چلتا تھا کہ امیر کبیر آدمی ہیں۔ میں جب کمرے میں داخل ہوئی تو انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میں نے دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی۔

"ان کے ساتھ جاؤ"۔ مالکن نے حکم کے لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" میں نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"میں کہتی ہوں ان کے ساتھ جاؤ"۔ مالکن نے ... کل میں

تمہیں کچھ فالتو رقم دوں گی"۔

میں بچی تو نہیں تھی۔ اپنے معاشرے کی ایک بے شمار باتیں سن چکی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ اخباروں میں ایسے بھٹوں کی خبریں آتی رہتی ہیں کہ کس طرح سیدھے سادے اور ان پڑھ لوگوں کو ان کی نوجوان اور جوان سال عورتوں سے اشتمام پر انگوٹھے لگوا کر پابند اور مجبور کر دیتے ہیں اور ان کی عورتوں کو خود بھی استعمال کرتے ہیں اور دوستوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔

مجھے اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں کی یہ بات بھی یاد آئی کہ مالکن جو کام بتائے وہ خوشی سے کرنا اور تمہاری آمدنی میں بہت اضافہ ہوگا۔

میں سمجھ گئی کہ مالکن مجھے عصمت فروشی کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ مجھ میں یکلخت جرأت اور دلیری پیدا ہو گئی اور میں نے ان آدمیوں کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ پہلے تو اس نے مجھے پیار اور محبت سے راضی کرنے کی کوشش کی، جب دیکھا کہ میں اس کی بات نہیں مان رہی تو اس نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کا رعب بھی نہ مانا تو اس نے بلا خوف و خطر کہا یہ صاحب بیس ہزار روپے دے رہے ہیں جس میں تمہارا حصہ بھی ہے۔

مجھے پیسوں کی ہی ضرورت تھی۔ میں کہہ سکتی تھی کہ دس ہزار روپیہ مجھے ابھی ادا کر دو تو میں ان کے ساتھ چلی جاتی ہوں لیکن میرے اندر ایک طاقت پیدا ہو گئی تھی جس نے مجھے اپنے کردار پر ثابت قدم رکھا اور میں انکار پر قائم رہی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں اس نوکری پر لعنت بھیجتی ہوں اور میں جا رہی ہوں ... وہ دونوں آدمی ناراض ہو کر چلے گئے۔

"تم نوکری چھوڑ کر تو دیکھو"۔ مالکن نے کہا۔ "میں تمہیں کہیں بھی نوکری نہیں کرنے دوں گی۔ تم نے بانڈ دیا ہوا ہے۔ جاؤ گی کہاں؟"

میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ اس عورت کا چہرہ

اتنا خوفناک ہو گیا تھا کہ مجھے اس سے ڈر آنے لگا۔ ان ۔ارمہینوں میں مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ عورت بہت ہی اثر ورسوخ والی ہے اور اس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ جس نے اتنی دلیری اور ڈھٹائی سے مجھے ان آدمیوں کے ساتھ جانے کو کہا اور بیس ہزار پر سودا بھی کر لیا تھا، یہ ضرور اثر ورسوخ والی عورت تھی لیکن میں ایک شریف نوجوان اور غیرت مند لڑکی اپنی عصمت کا سودا کیسے قبول کر لیتی۔

میں اس کے کمرے سے نکل آئی اور پھر اس کے پارلر سے نکل آئی اور اگلے روز کام پر نہ گئی۔ خدا نے یہ مدد کی کہ مجھے ایک اور بیوٹی پارلر میں ملازمت مل گئی۔ کام تو میں نے سیکھ ہی لیا تھا اس لئے میری تنخواہ اچھی مقرر ہوئی۔ اس پارلر کی مالکن ذرا مختلف اور کردار والی عورت لگتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ فلاں بیوٹی پارلر میں مجھ پر کیا بیتی ہے۔ میری نئی مالکن نے مجھے بتایا کہ اس عورت کا تعلق اوپر تک ہے اور پولیس کے ساتھ بھی اس کے بڑے مضبوط مراسم ہیں۔ نئی مالکن نے یہ بھی بتایا کہ عصمت فروشی اکیلی عورت نہیں کرا سکتی۔ اس عورت نے تو غنڈے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اگر اس نے غنڈے نہیں رکھے ہوئے تو پولیس اس کی مدد کر سکتی ہے۔

میں نئے پارلر میں جاتی رہی لیکن پرانی مالکن کا خوف میرے دل پر سوار رہا۔ نئی مالکن نے مجھے دو چار مرتبہ کہا تھا کہ ذرا بچ بچ کر آیا جایا کرو لیکن میرے پاس اپنی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

آخر ایک روز میں پارلر پر جانے کے لئے بس سٹاپ پر کھڑی تھی تو ایک موٹر سائیکل جس پر دو لڑکے سوار تھے میرے قریب آ کر رکی۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے ایک شیشی میں سے پانی سا میرے چہرے پر پھینکا اور پیشتر اس کے کہ مجھے یا بس سٹاپ پر کھڑے لوگوں کو پتہ چلتا کہ کیا ہوا ہے، موٹر سائیکل نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مجھے فوراً ہی چہرے پر جلن محسوس ہوئی اور میں چیخنے چلانے لگی۔ کسی نے کہا کہ دو لڑکے اس کے منہ پر تیزاب پھینک گئے ہیں۔

اچھے لوگ بھی ہیں۔ سب میرے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ تم لوگ اس کا تماشہ دیکھ رہے ہو، اسے ہسپتال لے چلو۔ مجھے تو جیسے کچھ ہوش ہی نہیں رہی تھی۔ دو آدمیوں نے مجھے سہارا دے کر رکشہ پر بٹھایا اور میو ہسپتال لے گئے۔ وہاں میری مرہم پٹی ہوئی اور جب میں گھر واپس پہنچی تو میری ماں نے سر پیٹ لیا۔ بہن بھائیوں نے رونا شروع کر دیا۔ میری پہلی مالکن نے انتقام لے لیا تھا۔

میری مرہم پٹی کرنے والوں نے کہا تھا کہ خدا کا شکر ادا کرو کہ تیزاب بہت کمزور تھا، ورنہ پورا چہرہ برباد ہو جاتا۔

اس سے زیادہ اور بربادی کیا ہو گی کہ میرا چہرہ ایک طرف سے مسخ ہو گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں پلاسٹک سرجری کرا لو لیکن یہاں سب سے بڑا مسئلہ دو وقت کی روٹی اور چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم ہے۔ میں پلاسٹک سرجری کہاں سے کراؤں گی؟

اب میں پھر نوکری کی تلاش میں ہوں۔ میرے ایک قریبی عزیز نے اسلام آباد بلایا ہے۔ انہوں نے کسی شریفانہ نوکری کا بندوبست کیا ہے۔ اللہ کا نام لے کر جا رہی ہوں لیکن ایسے لگتا ہے جیسے ہمارے ملک میں گناہ اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ اللہ نے ہمارے ملک پر لعنت ڈال دی ہے۔ میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ ہمارے ملک میں عورت کی کوئی جگہ نہیں۔ عورت جہاں جاتی ہے اس کی قیمت لگائی جاتی ہے اور اس کے سودے ہوتے ہیں۔

میں نے اس لڑکی کو پھر کہیں نہیں دیکھا۔ ایکھانہ میں نے اس کا ایڈریس لیا تھا۔ معلوم نہیں اسے کہیں نوکری ملی ہے یا نہیں۔

◆✻◆

معاشرت

بلا عنوان

یہ لو لو لیٹر زری کو بھجوا دو، پڑھتے ہی بے قرار نہ ہو گئی تو کہنا!

☆ خادم حسین مجاہد

احمر کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا، تعلیم میں بھی اس کا دل نہ لگتا تھا لہٰذا اس نے والدین کی کوششوں اور اصرار کے باوجود میٹرک سے پہلے ہی سکول چھوڑ دیا اور آوارہ پھرنے لگا۔ اسے پڑھائی سے تو الرجی تھی لیکن رومانوی اشعار پڑھنے، زیب و زینت کے ساتھ ڈائری میں لکھنے اور دوستوں کو سنا کر ان پر رعب جمانے کا از حد شوق تھا۔ سکول میں بھی وہ بیت بازی کے مقابلوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تھا۔ اس کے پاس شعروں سے بھری کئی ڈائریاں تھیں اور ہزاروں شعر اسے زبانی یاد تھے جو وہ موقع بہ موقع دوستوں کو سنا کر داد سمیٹا کرتا تھا۔ وہ خود تو شاعر نہ تھا لیکن ہر اچھے شاعر کے شعر اسے ازبر تھے۔

شانی اس کا لنگوٹیا یار تھا۔ ایک دن وہ اسے ملا تو بڑا پریشان تھا۔ وجہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ "مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی ہے لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اظہار محبت کیسے کروں؟"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب موبائل فون ور کنار پی ٹی سی ایل کے لینڈ لائن فون بھی دفاتر اور امیر گھرانوں میں ہوا کرتے تھے۔

"اچھا کون ہے وہ؟" احمر نے اشتیاق سے پوچھا۔

"یار! وہ ہماری گلی کی نکڑ والا گھر نہیں ہے جس میں بیری کا درخت بھی ہے۔ انہی کی بڑی لڑکی زری ہے لیکن اس سے بات کرنا بڑا مشکل ہے۔ ایک تو وہ گھر سے نکلتی نہیں دوسرے انہوں نے خونخوار کتا بھی رکھا ہوا ہے"۔

"اچھا، تم کسی طرح رقعہ پہنچا سکو گے؟" احمر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں رقعہ تو میں کسی نہ کسی طرح پہنچا لوں گا مگر وہ لکھے گا کون؟ میں تو لکھ نہیں سکتا"۔ شانی نے فکر مند لہجہ میں کہا۔

"میں لکھوں گا اور کون لکھے گا تمہیں اس کا معاوضہ دینا ہوگا"۔ احمر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"یار! تم لکھ دو جتنا معاوضہ کہو گے دے دوں گا"۔ شانی نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا تو پھر کل لے لینا"۔ احمر نے اسے معاوضے کی رقم بتائی جسے شانی نے دینے کا وعدہ کر لیا۔

گھر جا کر احمر نے ایک بہترین محبت نامہ تیار کیا جس میں ہر ایک دو لائنوں کے بعد پھڑکتے ہوئے اشعار ڈالے اور دوسرے دن شانی کو دیتے ہوئے کہا۔

"یہ لو لو لیٹر اب اسے بے دھڑک ہو کر زری کو بھجوا دو، پڑھتے ہی بے قرار نہ ہوگئی تو کہنا"۔

شانی نے محبت نامہ پڑھا اور خوش ہو کر اسے معاوضہ دے دیا۔ محبت نامہ واقعی بے مثال تھا اور اس کا اثر بھی توقع کے مطابق ہوا۔ شانی کو مثبت جواب ملا تو جواب الجواب کے لئے اس نے پھر احمر کی خدمات حاصل کیں۔

پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا اور دوسرے دوستوں کو جب اس بات کا پتا چلا تو وہ بھی اپنی محبوباؤں کے لئے خط احمر سے ہی لکھوانے لگے بدلے میں اسے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی اور اسے جیب خرچ اور جوتوں کپڑوں کے لئے گھر والوں کی جھڑکیاں کھانے کی ضرورت نہ رہی۔ اب وہ دن رات مختلف قسم کے محبت نامے تیار کرتا رہتا جس میں وہ ناموں کی جگہ چھوڑ دیتا اور جس کو جس قسم کا رقعہ چاہئے ہوتا دے دیتا کہ نام خود لکھ لینا۔ یہ کام اس کے مزاج کے مطابق تھا اور اسے اس میں کافی مہارت ہوگئی تھی۔ اس کے دوست عموماً لڑکیوں کے جوابی خط جو لا کے اسے دیتے تھے اس میں لڑکیوں نے اپنے نام ڈر یا بدنامی کے خوف سے نہیں لکھے ہوتے تھے۔ پہلے پہل تو وہ جواب لکھنے سے قبل لڑکی کے بارے میں پوچھتا تھا اور اس کے مطابق جواب لکھتا تھا مگر اب اس نے اس کا تکلف بھی چھوڑ دیا تھا کیونکہ یہ اب اس کے لئے ایک روٹین کی کارروائی ہوگئی تھی۔

ایک دن احمر کی آنکھ فجر کے وقت گھر میں ہونے والے شور سے کھل گئی ورنہ وہ تو دن چڑھے اٹھنے کا عادی تھا۔ استفسار پر جب شور کی وجہ معلوم ہوئی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ دادی جب نماز کے لئے اس کی بہن کو اٹھانے گئی تو وہ موجود نہ تھی۔ تلاشی پر معلوم ہوا کہ گھر سے کچھ نقدی اور زیور بھی غائب تھا۔ ایک خیال کے تحت جب اس نے بہن کی چیزوں کی تلاشی لی تو کئی محبت نامے برآمد ہوگئے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا کیونکہ ان پر نام تو اس کے ایک دوست کا تھا مگر وہ لکھے ہوئے سارے کے سارے اس کے اپنے ہی ہاتھ کے تھے۔

☐

گناہ کی فصل

اس نے میرے نام اپنے آخری خط میں لکھا کہ گناہ کی فصل تیار ہو گئی ہے اور اس کے کٹنے کا وقت آ گیا ہے۔

تحریر: محمد حیات خان نیازی
راوی: امیر عبداللہ خان نیازی - ڈی ایس پی (ریٹائرڈ)

یہ کہانی جو میں پیش کر رہا ہوں مجھے میرے بڑے بھائی صاحب نے سنائی تھی جو محکمہ پولیس سے ڈی ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ یہ ہے تو جرم و سزا کی کہانی لیکن اس میں آپ کو ایک سراغرسانی اور تفتیش کے جوہر نہیں ملیں گے بلکہ مجرم کی چالاکی کے مقابلے میں تفتیشی افسر ناکام ہو گیا تھا۔ مجرم کو اپنی ذہانت اور عیاری پر ناز تھا مگر وہ بھول گیا تھا کہ دنیاوی قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکتی ہے مگر سب سے بڑا منصف اوپر بیٹھا ہے اور اس کی پکڑ بڑی سخت ہے۔

فیض آباد اناج کی ایک بڑی منڈی ہے۔ اس شہر کے چاروں طرف پھیلے ہوئے دیہات کافی زرخیز مانے جاتے ہیں۔ دیہاتی کسان اپنی پیداوار کو فیض آباد منڈی لے آتے ہیں۔ یہاں پر اناج کے کئی بیوپاری ہیں جو کسانوں سے اناج خرید کر دیگر شہروں کو منتقل کرتے ہیں۔ اس کاروبار میں ان کو کافی منافع ملتا ہے۔ یہاں کی زیادہ تر آبادی سرمایہ دار، دلال حمال (بوجھ اٹھانے والا) کمیشن ایجنٹ، ٹرک ڈرائیور، سوزوکی مالکان، ڈرائیور اور مکینک وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں لیکن پیسہ کمانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ میری ڈیوٹی ان دنوں وہیں پر لگی ہوئی تھی۔

وہ سردیوں کی ایک صبح تھی۔ ابھی قصبہ نما اس شہر کے لوگ پوری طرح بیدار بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک شخص تیزی سے دوڑتا ہوا پولیس اسٹیشن پہنچا اور اطلاع دی کہ گاؤں کے باہر بہنے والے نالے میں کسی عورت کی لاش تیر رہی ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں چند کانسٹیبلوں کو لے کر وہاں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ نالے کے کنارے خاصے لوگ جمع ہیں اور پانی کی سطح پر کسی عورت کی لاش تیر رہی ہے۔ میں نے کچھ لوگوں کو بلایا اور ان کے توسط سے احتیاط سے لاش کو نالے کے کنارے پر لے آیا۔ لاش پانی میں رہنے کی وجہ سے پھول چکی تھی۔ میں ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھا کہ اس لڑکی کی موت کے متعلق کوئی اندازہ قائم کیا جا سکے۔ لوگ آتے رہے اور لاش کو دیکھتے رہے۔

اتنے میں ایک شخص نے جو منڈی میں پانڈی تھا، اس لاش کو پہچان لیا۔ اس کے بیان کے مطابق وہ منشی عبدالجبار کی بہن صوفیہ تھی اور عبدالجبار سیٹھ عبدالصمد کے ہاں ملازم تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو اس پانڈی کے ساتھ عبدالجبار کے گھر روانہ کر دیا اور نعش نامہ تیار کرنے لگا۔ یہ کارروائی مکمل ہونے تک کانسٹیبل لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ منشی عبدالجبار کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا ہے اور اس کی بیوی نے کہا ہے کہ عبدالجبار کی بہن رات سے غائب ہے۔

لاش کو پہچاننے کے لئے میں نے عبدالجبار کی بیوی کو بلوایا۔ اتنے میں ایک آدمی بھیڑ کو چیرتا ہوا میرے سامنے آیا۔ اس نے خود کو سیٹھ عبدالصمد بتایا۔ وہ گٹھیلے جسم کا مضبوط انسان تھا۔ اس نے بتایا کہ کاروباری حسابات کے سلسلے میں وہ اپنے منشی کے گھر جاتا رہا ہے اس لئے وہ صوفیہ سے واقف ہے۔ اسے حیرت تھی کہ صوفیہ یہاں کیسے آئی۔

میں نے اس سے عبدالجبار کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں باہر چلا گیا ہے۔ اسے پتہ ہے کہ عبدالجبار اس وقت کہاں ہوگا۔ میں نے فوراً اسے عبدالجبار کو فون پر واپس آنے کی ہدایت دینے کے لئے بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد عبدالجبار کی بیوی برقعہ پہنے وہاں آ پہنچی۔ اس نے بھی لاش کو پہچان لیا۔ میں نے اس کا بیان لینے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیا۔

اس دن دوپہر کے قریب میں تھانے میں بیٹھا تھا کہ عبدالصمد آ گیا۔ اس نے اطلاع دی کہ عبدالجبار کو اس حادثے کی اطلاع دی جا چکی ہے اور وہ چند گھنٹوں بعد

یہاں آنے والا ہے۔

"آپ صوفیہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

میں نے اس سے پوچھا۔

"جناب!" وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "چار سال پہلے عبدالجبار نور پور گاؤں سے یہاں آیا تھا۔ میں نے اسے اپنی آڑھت کی دکان پر منشی رکھ لیا۔ بہت ہی شریف اور پڑھا لکھا ہے۔ بڑی محنت اور محبت سے کام کرتا ہے پھر وہ اپنی بیوی انوری کو لے آیا۔ میں نے اپنے گودام کے دو کمرے اسے رہنے کے لئے دیئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہ اپنی بہن صوفیہ کو بھی لے آیا۔ چونکہ اسے اپنی ملازمت کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر جانا پڑتا ہے اس لئے وہ گھر پر بیوی کے ساتھ بہن کو رکھ کر اپنی ڈیوٹی بے فکری سے انجام دیا کرتا تھا۔ صفیہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں وہ پریشان رہا کرتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ مجھ سے اس کا ذکر کیا۔ چونکہ اس کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اس لئے اس کا کوئی رشتہ نہیں آ رہا تھا"۔

میں نے اس سے چند اور سوالات کر کے اسے رخصت کر دیا۔ چار بجے کے قریب کوئی شخص تھانے میں آیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لمبی مسافت طے کر کے آیا ہو۔

"میں عبدالجبار ہوں"۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"آؤ بیٹھو"۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آخر اس نے اپنا فیصلہ خود کر لیا"۔ اس نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں اُسے تسلی دیتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ اُسے اپنی بہن کی شادی کی بہت آرزو تھی لیکن کہیں رشتہ جم نہیں سکا۔ صوفیہ نے بھی اپنی زندگی سے مایوس ہو کر یہ آخری قدم اٹھایا ہے۔ میں اُس کا بیان لینے کے بعد اُس کے گھر گیا۔ وہ مکان چار کمروں پر مشتمل تھا جو ایک ہی قطار میں تھے۔ پہلا کمرہ صوفیہ کا تھا۔ اس کے بعد کے دو کمرے گودام کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔ آخری کمرے میں انوری رہتی تھی۔

میں نے انوری سے کچھ سوالات کیے۔ اس نے بتایا کہ رات سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے سب کھانا کھا کر جلدی اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے گئے۔ اُسے پتہ نہیں کہ رات کے کس پہر صفیہ گھر سے نکلی اور کب وہ نالے میں چھلانگ لگا بیٹھی۔

میں نے گھر میں آنے والوں کے متعلق سوال کیا تو پتہ چلا کہ ایک ملازمہ جھاڑو برتن کے لئے آتی ہے۔ کبھی کبھی باندی آ جاتے ہیں۔ جبار کی موجودگی میں سیٹھ عبدالصمد آتے ہیں اور کبھی انوری کا بھائی جمال آتا ہے جو کسی دوسرے سیٹھ کے پاس ملازم ہے۔

یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد میں واپس آ گیا۔ شام تک پوسٹ مارٹم ہو گیا اور لاش ورثاء کے حوالے کر دی گئی۔ دوسرے دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ مل گئی جو چونکا دینے والی تھی۔ رپورٹ میں درج تھا کہ صوفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا۔ اس کا گلا گھونٹ کر پانی میں پھینکا گیا تھا اور مرنے سے پہلے اس کی عصمت دری بھی کی گئی تھی۔ اب میں چوکنا ہو گیا جسے میں سیدھا سادہ خودکشی کا کیس سمجھ رہا تھا، وہ قتل کا کیس بن گیا تھا۔ میں ایک بار پھر عبدالجبار کے گھر جا کر مقتولہ کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔

میں ابھی باہر نکلا بھی نہ تھا کہ عبدالجبار اور سیٹھ عبدالصمد آ گئے۔ انہیں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ خاندان کی عزت کو بچانے کے لئے اس معاملے کو دبا دینا چاہتے تھے۔ میں نے عبدالجبار کو سمجھایا کہ وہ اپنی بہن کے قاتل کو سزا دلوانا نہیں چاہتا؟ اور کیا اسے اپنی بہن سے محبت نہیں تھی؟ میں نے اُس سے کہا کہ یہ پولیس کیس ہے۔ قاتل کا پتہ چلانا ضروری ہے۔

وہ میری بات سمجھ گئے۔ میں اُن کے ساتھ ہی ان

کے گھر گیا۔ صوفیہ کا کمرہ کھلوایا۔ اس کمرے میں ایک پلنگ بچھا تھا۔ ایک جانب ایک میز رکھی تھی۔ چند صندوق تھے۔ میں نے سارے کمرے کی تلاشی لی۔ میز پر پرانے فلمی گانوں کی کتابیں اور ایک فلمی رسالہ تھا۔ اس پر شکیل کا نام لکھا تھا۔ میرے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ شکیل اسی محلے کا ڈرائیور ہے جو ٹرک چلاتا ہے۔ میں نے اس کا پورا پتہ نوٹ کرلیا۔

انوری بیگم نے بتایا کہ صوفیہ پڑھنے کی غرض سے کچھ رسالے شکیل ڈرائیور سے منگوایا کرتی تھی۔ میں نے بستر پر نظر ڈالی جو شکن آلود تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ رات کا کچھ حصہ اس نے اس بستر پر گزارا ہے۔ اسے پڑھنا لکھنا آتا تھا لیکن اس نے کوئی تحریر نہیں چھوڑی تھی۔

ضروری چھان بین کرنے کے بعد میں واپس آ گیا۔ میں نے اس گھر کی ملازمہ کو بلوایا۔ اس نے بتایا کہ اس گھر میں کچھ پانڈی اور انوری کا بھائی جمال اکثر آیا کرتے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ صوفیہ اسے ڈرائیور کے پاس سے کچھ کتابیں لانے پر مجبور کیا کرتی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ صوفیہ اور انوری کے تعلقات اکثر بگڑ جاتے تھے۔

اب میری نظروں میں شکیل ڈرائیور، انوری کا بھائی جمال، پانڈی اور سیٹھ عبدالصمد تھے۔ ان کے علاوہ انوری کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ قتل کے متعلق میں نے ایک اندازہ قائم کیا تھا۔ صوفیہ یہاں آنے کے بعد کسی سے دل لگا بیٹھی ہوگی۔ وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی تھی جہاں خواہشات شدید ہو کر ابھر آتی ہیں۔ اس طرح کسی کے ساتھ اس کے جسمانی تعلقات قائم ہوگئے لیکن اگلا سوال یہ تھا کہ وہ شخص کون ہے؟ میں نے سب سے پہلے انوری بیگم کو بلایا۔ اس کا شوہر اور عبدالصمد بھی اس کے ساتھ تھے۔ زیادہ سختی کرنے پر بھی وہ نہیں بتاسکی کہ صوفیہ کے تعلقات کس شخص کے ساتھ تھے۔ وہ اس بات سے انکار کرتی رہی کہ حادثے والی شب اس کے گھر کوئی آیا تھا۔

انوری بیگم کے بعد میں نے عبدالجبار سے کافی پوچھ گچھ کی۔ اس نے کسی پر بھی شک ظاہر نہیں کیا، وہ تو انوری اور صوفیہ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں سے بھی ناواقف تھا۔ اس کی آنکھوں سے ویرانی برس رہی تھی۔ ان لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے ڈرائیور شکیل کو بلایا لیکن مجھے پتہ چلا کہ وہ پچھلے دنوں سے ٹرک لے کر شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ میں نے پانڈیوں کو بلایا جو عبدالجبار کے گھر جایا کرتے تھے۔ ان پر بھی سختی کی گئی لیکن کوئی کام کی بات دریافت نہ ہوسکی۔ وہ صرف اناج کی بوریاں گودام والے کمروں میں رکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ گھر والوں سے ان کی گفتگو بہت کم ہوتی تھی۔

ان کے بعد میں نے انوری کے بھائی جمال کو بلایا۔ وہ اپنی بہن ہی کی طرح خوبصورت نوجوان تھا۔ میں نے اسے تھانے میں بند رکھا۔ مجھے شک تھا کہ اس کا اس قتل سے تعلق ہے۔ عبدالصمد اور عبدالجبار نے اسے رہائی دلانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ میں اس پر سختی کرتا رہا کیونکہ یہی وہ شخص تھا جو مقتول کے گھر میں بلا روک ٹوک آتا جاتا تھا۔ اس نے اس بات کو مان لیا کہ وہ اپنی بہن کے گھر ضرور جاتا تھا لیکن اس کا مقصد صرف یہی ہوتا تھا کہ اپنی بہن کو ملے اور کوئی ضروری سودا وغیرہ ہو تو لا دے۔ وہ صوفیہ سے کئی مرتبہ ملا تھا۔ اس سے باتیں بھی کی تھیں۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ صوفیہ سے کس حد تک قربت حاصل کر چکا تھا۔ ہر قسم کی سختی آزمانے کے بعد بھی اس نے کسی بات کا اقرار نہیں کیا۔ میں تو چاہتا تھا کہ ملزم کی حیثیت سے جمال کو عدالت میں پیش کردوں لیکن مشکل یہ تھی کہ صوفیہ کے قتل کی رات خود اس کی بیوی بیمار تھی اور وہ اسے علاج کی غرض سے دوسرے شہر لے گیا تھا۔ اس کے پورے ثبوت موجود

نے۔ میں اُسے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

اسی دن مخبر نے اطلاع دی کہ ڈرائیور شکیل واپس آ گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ پچھلے ہفتے سیٹھ ہارون کا مال لے کر ملتان چلا گیا تھا اور آٹھ دن سے باہر رہا ہے۔ یہاں واپس آنے پر اُسے معلوم ہوا کہ صوفیہ قتل ہو گئی ہے۔ میں نے اُس کے پروگرام کی جانچ پڑتال کروائی۔ قتل کی رات اس کی گاڑی ملتان غلہ منڈی میں موجود تھی۔

ایک مہینہ گزر گیا لیکن مجھے کوئی سراغ نہ ملا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ منڈی والے لوگ اس حادثے کو بھول گئے۔ بعض کیس ایسے ہوتے ہیں جو خود پولیس والوں کے لئے شرمندگی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس کیس میں میری نااہلی ابھر کر سامنے آئی تھی۔ میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کیس ہمیشہ کے لئے میرے دماغ کو پریشان رکھے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ مجھے اطلاع ملی کہ انوری نے خودکشی کر لی ہے۔

میں فوراً اس جگہ پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ جبار کے گھر کے سامنے لوگوں کا اژدہام تھا۔ مجھے دیکھتے ہی لوگ اِدھر اُدھر بکھر کر ٹولیوں کی شکل میں باتیں کرنے لگے۔ کانسٹیبل نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا۔ میں نے دیکھا کہ انوری کی لاش بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ اس کا سر پلنگ سے نیچے جھول رہا ہے تکیے کے پاس زہر کی شیشی رکھی ہے جو خالی ہے۔ منہ سے اس زہر کی باریک لکیر نکل کر چہرے پر پھیل گئی ہے۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ سانس کس قدر اکھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں ایک الماری، چند صندوق اور دو بستر تھے۔ میں نے فوٹو گرافر کو بلا کر لاش کے چند فوٹو لئے اور پھر پنچ نامہ تیار کیا جانے لگا۔

لاش کی ظاہری حالت سے تو اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ اُس نے زہر کھا کر خودکشی کی ہے۔ میں نے فنگر پرنٹ ایکسپرٹ کو بلوایا۔ کمرے کی حالت معمول کے مطابق تھی۔ کسی گڑبڑ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ کارروائی مکمل ہونے میں چند گھنٹے لگ گئے۔ چار بجے کے قریب عبدالجبار آیا لیکن عجیب حالت میں۔ دو آدمیوں نے اُسے پکڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کا زاویہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ انوری کی لاش کو دیکھ کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ اس اچانک صدمے سے اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔ لوگ اُسے باہر لے گئے۔ فنگر پرنٹس کے ماہرین اپنا کام کر رہے تھے۔

اس کارروائی کے بعد الماری کھولی گئی۔ الماریوں کی چابیاں تکیے کے نیچے سے برآمد ہوئیں۔ عبدالجبار کو اندر بلایا گیا اور اس کی موجودگی میں صندوق اور الماری وغیرہ کھولے گئے۔ اندر سے برآمد ہونے والی چیزوں میں چند کپڑے اور چند زیورات تھے۔ الماری کے سیف کو کھولا گیا تو اس میں نوٹ رکھے تھے۔ عبدالجبار جلدی سے نوٹوں پر جھپٹ پڑا۔ وہ سارے نوٹ لے کر باہر جانے لگا۔ میں نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ اس نے وہ سارے نوٹ لوگوں کی طرف اچھال دیئے اور قہقہے لگانے لگا۔ ظاہر ہے اُس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔ سیٹھ عبدالصمد بمشکل اُسے سنبھال رہا تھا۔ میں نے عبدالصمد کو اشارہ کیا کہ وہ اسے اپنے گھر لے جائے۔ وہ اُسے لے گیا۔

میں نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیا اور اس گھر پر پہرہ لگا دیا۔ میرا دماغ انوری کی خودکشی کو صوفیہ کے قتل سے جوڑنے میں مصروف تھا۔ کیا انوری صوفیہ کے قاتل سے واقف تھی یا اُس نے خود صوفیہ کو قتل کیا تھا؟ اس کی خودکشی سے صرف ایک ہی بات کا پتہ چلتا تھا۔ یا تو صوفیہ کے قتل میں انوری کا ہاتھ تھا یا پھر قاتل سے وہ واقف تھی۔

شام کو عبدالصمد تھانے آیا۔ اس نے بتایا کہ عبدالجبار بالکل پاگل ہو چکا ہے۔ اُسے بڑی مشکل سے کچھ کھلا پلا کر کمرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے

کہا ہے کہ اسے فوری طور پر دماغی امراض کے ڈاکٹرز کے پاس لے جایا جائے۔

دوسرے دن میری موجودگی میں ہی انوری کی تدفین ہوئی۔ لاش کو قبر میں اتارنے کے بعد جب عبدالجبار کو وہاں لایا گیا تو وہ خود بھی انوری کے ساتھ قبر میں لیٹنے کی ضد کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے اُسے ہٹایا گیا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے وہاں سے واپسی پر مجھے یوں لگا جیسے میں خود ہی اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے آرہا ہوں۔

تھانے میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ رپورٹ کے مطابق انوری کی موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ کسی کپڑے کی گرہ سے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ زہر مرنے کے بعد زبان پر ڈالا گیا جس کا اثر صرف منہ تک ہی محدود تھا اور مرنے سے قبل اس کی بھی آبروریزی کی گئی تھی۔

یہ بھی قتل کی واردات تھی۔ میں نے عہد کر لیا کہ مجرم کو ضرور گرفتار کروں گا۔ میں کئی بار عبدالجبار کے گھر گیا۔ کافی باریک بینی سے ہر چیز کو دیکھا۔ قتل کی صبح دروازہ اندر سے بند تھا۔ قاتل انوری کی مرضی سے ہی اندر داخل ہوا تھا اور قتل کے بعد دیوار پھاند کر چلا گیا تھا۔ میں نے محلے والوں سے بھی پوچھ گچھ کی۔ فنگر پرنٹ رپورٹ کا بھی بار بار مطالعہ اور مشاہدہ کیا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ کمرے کی ہر چیز پر انوری کی انگلیوں کے نشان تھے۔ زہر کی شیشی پر کوئی نشان نہیں تھا۔

میں نے صوفیہ کیس کے ہر مشتبہ شخص کو گرفتار کر لیا اور وقفے وقفے سے ان کو لاک اپ میں رکھ کر ان پر سختی کرتا رہا۔ میں نے سیٹھ عبدالصمد اور عبدالجبار کو بھی نہ چھوڑا لیکن میں جتنا اس کیس کو حل کرنے کی کوشش کرتا اتنا ہی کیس پیچیدہ بنتا چلا گیا۔ عبدالجبار کا خاندان اجڑ چکا تھا۔ اسے مینٹل ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں کے ڈاکٹروں سے سرٹیفکیٹ وصول ہوا کہ وہ حقیقی پاگل ہے۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے حوصلے بھی پست ہوتے گئے۔

ان واقعات کے چند مہینے بعد میرا تبادلہ کر دیا گیا اور وہاں اتفاقاً ایک بڑا سمگلنگ کیس ملا جس میں بھاری مقدار میں ہیروئن برآمد ہوئی۔ اس کامیابی کا سہرا میرے سر باندھا گیا اور مجھے انسپکٹر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ اب میں سرکل انسپکٹر کے درجے پر آگیا تھا۔ اس طرح ایک بار پھر فیض آباد کا علاقہ میری حدود میں شامل ہو گیا۔ میں جب بھی اس علاقے میں جاتا، وہی واقعات نظروں میں گھوم جاتے۔ ایک دن مجھے فیض آباد کے قریب ہی بس کے ایک حادثے کی اطلاع ملی۔ میں فوراً موقعہ واردات پر پہنچا۔ وہاں سب انسپکٹر راجہ صدیق منہاس موجود تھا جو ضابطے کی کارروائی مکمل کر رہا تھا۔ بس سڑک کے کنارے گہرے کھڈ میں گر گئی تھی۔ بس کے اندر بیٹھے پانچ افراد ہلاک اور باقی سب زخمی ہو گئے تھے۔ مرنے والوں کی لاشیں نکالی جا چکی تھیں۔

وہاں مجھے عبدالصمد نظر آیا جو زار و قطار رو رہا تھا، اس کا جوان بیٹا اس حادثے میں مارا گیا تھا۔ میں انسپکٹر کو چند ضروری ہدایات دے کر چلا آیا۔

اس حادثے کے چند دن بعد فیض آباد کے کسی سیٹھ کی دکان میں زبردست چوری کی خبر آئی۔ یہ عبدالصمد کی دکان تھی جہاں سے لاکھوں کی نقدی اور کاغذات چوری ہو گئے تھے۔ وہ اناج کی خریداری کے لئے بینک سے ساری پونجی نکال کر دکان کی تجوری میں بند رکھتا تھا۔ اب وہ بری طرح لٹ چکا تھا۔ اس قسم کے واقعات اس علاقے میں عام تھے اس لئے میں نے زیادہ توجہ نہ دی۔ سب انسپکٹر راجہ صدیق خود اس واردات کی تفتیش کر رہا تھا۔ اس واردات کے بعد ایک اور حادثے نے میرے ذہنی سکون کو درہم برہم کر دیا۔ اطلاع آئی کہ سیٹھ عبدالصمد کے گھر کو آگ لگ گئی اور اس کا سارا خاندان جل کر مر گیا ہے۔ اس

ئے میں صرف عبدالصمد زندہ بچا تھا۔

جب میں وہاں پہنچا تو آگ بجھائی جا چکی تھی۔ گھر جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ اندر سے چار جلی ہوئی ں برآمد ہوئی تھیں اور عبدالصمد پاگلوں کی طرح چیخ چلا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ میرے قدموں سے لپٹ گیا۔ آگ نے والوں کا کہنا تھا کہ بجلی کے شارٹ سرکٹ کی وجہ ت لگی ہے۔ میں بیچارے کی قسمت پر افسوس کرتا رہا۔ یک حقیقت ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی لیکن پے در پے قسمت کی مار ایک ہی شخص پر پڑے تو بیچارہ انسان کہاں ک تاب لا سکتا ہے۔

اس حادثے کے چند دن بعد مجھے عبدالصمد کا ایک تفصیلی خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ یہ خط مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے بہت دور جا چکا ہوگا۔ اس نے پچھلے واقعات کے متعلق لکھا تھا کہ عبدالجبار کو اس نے ہی ملازمت دی تھی۔ ابتدا میں عبدالجبار تنہا رہتا تھا۔ بعد میں اس نے عبدالجبار سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی بلا لے۔ اس نے ان کو رہنے کے لئے اپنے ہی گودام کے دو کمرے خالی کروا دیے۔ درمیانی دو کمرے گودام کے طور پر آسی کے قبضہ میں تھے۔ ان میں سے ایک کمرہ پیچھے سے بھی کھل سکتا تھا جو بظاہر باہر سے بھی بند رہتا تھا۔ وہ اکثر عبدالجبار کے پاس حساب کتاب کے سلسلے میں اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ وہیں پر اس کی نظریں پہلی مرتبہ انوری کے خوبصورت چہرے پر پڑیں۔ عورت اس معاملے میں حساس ہوتی ہے۔ وہ بات سمجھ گئی۔ ایک رات عبدالجبار شہر سے باہر تھا۔ عبدالصمد خفیہ راستے سے انوری کے پاس پہنچ گیا اور اُسے ورغلانے لگا کہ تمہاری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں اور تم ابھی تک ماں نہیں بنی ہو۔ اولاد کی خاطر عبدالجبار دوسری شادی کے چکر میں ہے۔ اگر تم چند مہینوں میں اولاد پیدا نہ کر سکیں تو وہ دوسری شادی کر لے گا۔ اس طرح انوری آسانی سے اس کے جال میں پھنس گئی۔ اسے

اولاد کی تمنا تھی اور وہ عبدالجبار سے مایوس ہو چکی تھی۔ عبدالصمد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح وقت گزرتا جا رہا تھا کہ ایک دن عبدالجبار کی بہن صوفیہ بھی آ گئی۔

صوفیہ کے آنے سے عبدالصمد نے انوری سے ملاقات میں رکاوٹ محسوس کی۔ اس نے انوری سے صاف کہہ دیا کہ اس راز میں صوفیہ کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔ اگر صوفیہ مان جائے تو یہ راز ہمیشہ راز ہی رہے گا۔ اس طرح اُس نے صوفیہ سے بھی تعلق قائم کر لیا۔ جب بھی عبدالجبار باہر جاتا، عبدالصمد کی راتیں کبھی صوفیہ اور کبھی انوری کے ساتھ گزرنے لگیں۔

عبدالصمد کو امید تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے راز کو راز ہی رکھیں گی لیکن چند دنوں بعد دونوں عورتوں میں رقابت پیدا ہو گئی۔ اتنے میں صوفیہ امید سے ہو گئی۔ عبدالصمد کسی طرح اس بلا سے چھٹکارہ دلانے کا مشورہ دیتا رہا لیکن وہ اڑ گئی۔ صوفیہ چاہتی تھی کہ عبدالصمد اس سے شادی کر لے۔ اسے خواہ کچھ نہ ملے لیکن اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تو پوری ہو گی۔ وہ اب صوفیہ کو راستے سے ہٹانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس بات کا انوری کو پتہ نہیں تھا۔ وہ اس رات صوفیہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے تفریح کی غرض سے باہر نکال لایا اور موقع پا کر اس کے دوپٹے سے اس کا گلا گھونٹ کر لاش نالے میں پھینک دی۔

پولیس کی انتھک کوششوں کے باوجود صوفیہ کا قاتل پکڑا نہیں گیا۔ انوری اس معاملے میں خاموش تھی لیکن وہ خوش تھی کہ اس کے راز کو فاش کرنے والی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ قتل کے چند دن بعد تک انوری سے ملاقاتیں بند رہیں۔ پھر حالات معمول پر آ گئے۔ وہ انوری کے پاس جانے لگا۔ اب انوری کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ بھی اسے اولاد نہیں دے سکتا۔ اس کے دل میں خوف ہوا کہ جبار اُسے چھوڑ دے گا، اس لئے انوری نے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کا پلان بنایا تاکہ دولت کے زور پر وہ اپنے شوہر کو بس میں رکھ سکے۔ وہ ہوشیار عورت تھی، اسے پتہ تھا کہ صوفیہ کے قتل میں سیٹھ کا ہاتھ ہے اس لئے وہ سیٹھ کو بلیک میل کرنے لگی۔ ابتدا میں تو وہ اسے ہزاروں روپے دیتا رہا، پھر جلد ہی اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اس نے سوچا کہ اگر اس رفتار سے انوری رقم کا مطالبہ کرتی رہی تو وہ بہت جلد کنگال ہو جائے گا، اس لئے وہ انوری کو بھی ٹھکانے لگانے کے امکانات پر غور کرنے لگا۔

ایک رات اس نے اس کی ساڑھی کے پلو سے اس کا گلا گھونٹ دیا اور اسے خودکشی کا رنگ دینے کے لئے زہر کی کچھ مقدار اس کے منہ میں ڈال دی اور بڑے اطمینان سے نشانات مٹانے کے بعد وہ خفیہ راستے سے باہر نکل آیا۔ پولیس چند دن تک قاتل کو تلاش کرتی رہی۔ پھر ہمت ہار دی۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ ذہین مجرم سمجھنے لگا جس کے کارناموں کا پولیس کے پاس کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ پر ناز کرنے لگا اور یہ بھول گیا کہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکتی ہے لیکن اوپر والا سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ اُس کی ذات باری نے اُس کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ پہلے اس کا جوان بیٹا مر گیا۔ پھر اس کا کاروبار لٹ گیا اور پھر اُس کا گھر جل گیا۔

عبدالصمد نے میرے نام خط میں لکھا کہ وہ اگر صوفیہ کے قتل کے بعد اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیتا تو شاید وہ آج خدا کے قہر سے محفوظ رہتا اور اس نے جو گناہ کی فصل بوئی تھی اسے نہ کاٹنا پڑتا۔ اب گناہ کی فصل تیار ہو گئی ہے، اس کے کٹنے کا وقت آ گیا ہے اس لئے وہ مکافات عمل کے تحت خودکشی کر رہا ہے اور......

میں ابھی خط پڑھ رہا تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ سیٹھ عبدالصمد نے خودکشی کر لی ہے۔

سر اٹھا کے جیو

خواب

انسان کی کامیابی کی بلندیوں کی وجہ اگر اس کی سوچ ہی ہے
تو پھر اکثر انسان 'محدود سوچ' پر اکتفا کیوں کر لیتے ہیں؟

☆ قیصر عباس

دو 'سر اٹھا کے جیو' کا پیغام صدیوں کی مسافت طے کرتا ہوا میرے ذہن کے دریچوں میں پڑاؤ ڈال چکا تھا۔

مجھے ایک لمحے کے لئے احساس ہوا کہ یہ پیغام کوئی عام پیغام نہیں ہے، اس پیغام کو عام کرنا بھی کوئی معمولی کام نہیں ہو سکتا۔ سر اٹھا کے جینے کی ترغیب، حوصلہ اور تعلیم دینا تو کسی مجھ جیسے کی نجات کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

سر اٹھا کے جینے کا ڈھنگ سکھانے کے لئے خود کا سر اٹھا ہوا ہونا کتنا ضروری ہے۔ کیا مجھے اس بات کی جسارت بھی کرنی چاہیے کہ میں دوسروں کو سر اٹھا کے جینے کی ترغیب دوں؟ کیا مجھے اس بات کا حق حاصل ہے؟ یہ حق مجھے کس نے دیا ہے؟ کیا مجھے جرأت کرنی چاہیے۔

شاید..... ضرور۔ کیونکہ 'جرأت' ہی اِک ایسا لفظ ہے جس کی پکڑ میرے ہاتھ نہیں آ رہی۔ جرأت ہی کی تو میری زندگی میں کمی رہی ہے۔ کتنے ہی مواقع آئے جہاں محض جرأت چاہیے تھی لیکن جرأت نہیں کر پایا اور میرا اپنا سر جھکا ہی رہا۔

کالج کا پہلا دن ہو یا یونیورسٹی کی تعارفی کلاس، میں 'سر جھکا کے جیو' کے نعرے پر ہی عمل پیرا رہا۔ نوکری کے لئے کسی کمپنی میں انٹرویو میں بیٹھا ہوں یا کسی پروفیشنل میٹنگ میں، سر تھا کہ کبھی اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ شرمیلا پن، خود اعتمادی کی کمی، اعزت نفس کا قحط، خود سے نفرت، اپنی شکل و صورت سے وابستہ "خود کش" خیالات، اذیت ناک سوچیں، خود تنقیدی کی بھرمار اور

زہریلے لفظوں کے وار...... اتنے طاقتور دشمنوں کے ہوتے ہوئے سر اٹھانے کی جرأت مجھ سے کبھی ہو ہی نہ پائی......

پھر ایک دن آیا، فیصلے کا دن، کر دکھانے کا دن، خود سے عہد نبھانے کا دن اور میں نے طے کیا کہ سر اٹھا کے جینا ہے۔ میں نے ٹھان لی کہ گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے زندگی نہیں گزارنی۔ میں نے ان لوگوں کو اپنا رول ماڈل بنایا جنہوں نے سر اٹھا کر جینے کی جاوداں مثالیں قائم کیں۔ ان میں سب سے بڑی مثال امام عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تھی جنہوں نے فسق و فجور کے سامنے سر جھکانے کی بجائے سر اٹھانے کی راہ چن لی۔ نواسہ رسول ﷺ سر اٹھا کے جینے کی قیمت جان لینے کے بعد بھی پیچھے نہ ہٹے۔ انہوں نے پوری پوری قیمت چکائی۔ گھبرائے نہیں، اپنے موقف سے، ہدف سے پھرے نہیں۔ سر جھکا کے جینے والے کروڑوں انسانوں کے لئے اُمید کا آفتاب بن کر چمکے اور ساری کائنات کو بتا دیا کہ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو کے مر جانا گھٹنوں کے بل زندہ رہنے سے بہتر ہے، سر اٹھا کے مر جانا قبول ہے۔ سر جھکا کے زندہ رہنا منظور نہیں ہے۔ امام عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ نیزے پہ سر بلند ہو کر سر جھکا کے جینے والوں کو سر اٹھا کے جینے کا ڈھنگ سکھا گئے۔

'سر جھکا کے' جیتے رہنے کی ہزار وجوہات پہ سر اٹھا کے جینے کی ایک وجہ بھاری ہوتی ہے۔ جس دن وہ وجہ آپ کے ہاتھ لگ گئی آپ کا سر خود بخود اٹھ جائے گا۔ سر اٹھا کے جینے کی سرشاری کیا ہوتی ہے آپ خود ہی جان جائیں گے۔ ایک بار آپ سر اٹھا کے جینے کے عادی ہو گئے تو سر جھکا کے جینے کا تصور آپ کے لئے ڈراؤنا خواب بن جائے گا۔ آپ حیران ہوں گے کہ سر جھکا کے جینا کتنا مشکل تھا، سر اٹھا کے جینا کتنا آسان ہے۔

سر اٹھا کے جینے کا ایک فیصلہ میری پوری زندگی بدل گیا۔ اس ایک فیصلے نے میری کایا پلٹ دی۔ تب سے میری زندگی کا مشن سر اٹھا کے جینے کا راز بتا کر دوسروں کی کایا پلٹنا ہے۔ راز جاننا چاہتے ہیں؟ اپنی کایا پلٹنی چاہتے ہیں؟

سر اٹھا کے جینے کے سفر میں آپ کو تین چیزوں کی ضرورت پیش آئے گی۔

سب سے پہلی چیز کا نام ہے 'بڑی سوچ'

سوچ کی بلندی ہی سر اٹھا کے جینے کی ابتدائی سیڑھی ہے۔ سوچ بلند رکھنے میں حرج ہی کیا ہے؟ میرے خیال میں سوچ پست یا بلند رکھنے میں دماغ کا ایک جتنا 'خرچ' ہوتا ہے۔ تو کیوں نہ سوچ اونچی ہی رکھی جائے؟ آپ سوچتے ہوں گے میں خواہ مخواہ آپ کو ہوائی قلعے بنانے پر اُکسا رہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی کامیابی کا سائز آپ کی سوچ کے سائز سے بڑھ نہیں سکتا۔ اگر آپ کی سوچ محدود ہے تو کامیابی بھی محدود ہی ہوگی۔

کیا آپ اپنے اردگرد کچھ ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جنہوں نے بڑی اور بلند سوچ رکھنے کی جرأت کی اور آج وہ اپنی اس سوچ کی عملی تصویر بن کر ابھرے ہیں؟

دنیا بھر میں جس تیزی سے آج لوگ کامیاب ہو رہے ہیں اس کی ماضی کے کسی دور میں مثال نہیں ملتی۔ 1950ء میں پوری دنیا میں چند سو افراد لکھ پتی تھے۔ آج صرف امریکہ میں لکھ پتیوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ مائیکروسوفٹ کے بل گیٹس سے نشاط گروپ کے میاں منشاء تک جس جس نے 'بلند سوچ' کا رستہ چنا سر اٹھا کے جینے کے اہل ٹھہرے۔

انسان کی کامیابی کی بلندیوں کی وجہ اگر اس کی سوچ ہی ہے تو پھر اکثر انسان 'محدود سوچ' پر اکتفا کیوں کر لیتے ہیں؟

انسان کی کامیابی کا سائز اگر اس کی سوچ کے سائز

کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی جتنی بڑی سوچ، اتنی ہی بڑی کامیابی۔ تو بڑا سوچنے میں کیا برائی ہے؟ بڑی سوچ رکھنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ کیا بلند سوچ پہ کوئی ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے؟ یا حکومت کی طرف سے کوئی پابندی ہے؟ کبھی کسی کو بلند و بالا سوچ رکھنے پر پولیس نے گرفتار کیا ہے؟

میں عجیب سے سوال پوچھ رہا ہوں؟ تو پھر آپ ہی بتا دیجئے کہ بڑی سوچ یا بلند تصور زندگی رکھنے سے ہم سب اتنے گھبراتے کیوں ہیں؟ کیوں ہم اپنی سوچ کو 'اوقات' میں رکھنے کی بات کرتے ہیں؟ ہم اپنی 'اوقات' کی حدود کو عمر بھر پھلانگنے کی ہمت کیوں نہیں کر پاتے؟ ہماری 'اوقات' طے کرنے کا اختیار کس کے پاس ہے؟ اسے یہ اختیار کس نے دیا ہے؟

ہماری صلاحیتوں کی حدود طے کرنے کا حق ہم کسی اور کو کیسے دے سکتے ہیں؟ کسی نے کہہ دیا کہ 'تم فلاں کام نہیں کر سکتے ہو' اور ہم نے اس جملے کو ہی اپنی تقدیر سمجھ لیا۔ ہمارے بارے میں کسی اور کی رائے ہماری 'تقدیر' کیسے بن سکتی ہے؟ کسی کا خیال ہماری مسلمہ حقیقت کیسے بن سکتا ہے؟

سر اٹھا کے جینے کیلئے دوسری ضروری چیز ہے 'یقین'

اپنی ذات میں یقین..... یہ یقین کہ جو بڑی سوچ میرے ذہن میں رنگ بھر رہی ہے یہ رنگ حقیقت کا روپ دھار سکتے ہیں۔

اگر کسی نہ کسی طرح ہم بڑی سوچ کی راہ پر چل بھی پڑیں، اپنی اوقات سے زیادہ بڑی سوچ، خواب، منزل کا اور کامیابی پر نظر رکھنا شروع کر بھی دیں تو اپنی ذات پر 'عدم اعتماد' سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیتا ہے۔ یقین کی فراوانی ہو گی تو بڑی سوچیں، بڑے نتائج پیدا کر پائیں گی۔ جتنی بڑی سوچ ہو گی اتنا ہی بڑا یقین درکار ہو گا۔ بے یقینی بلند سوچوں کو سرنگوں کر سکتی ہے۔ بے یقینی عمل کی

لوگ کیا کہیں گے؟

ہم کوئی بھی کام کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچتے ہیں "لوگ کیا کہیں گے؟، لوگ کیا سوچیں گے؟" یہ ایسی سوچ ہے جو روزانہ کروڑوں خوابوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔

(نبیلہ نازش-اوکاڑہ)

طاقت چھین لیتی ہے۔ بے یقینی بڑھتے قدم اکھیڑ دیتی ہے۔ بے یقینی جیتی ہوئی بازی ہرا دیتی ہے۔ بے یقینی ارادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ بے یقینی سوچوں کو بنجر کر دیتی ہے۔ بالآخر یہی بے یقینی آپ کو شکوک و شبہات کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیتی ہے۔

تو بے یقینی کا توڑ کیا ہے؟ "یقین"..... وہ یقین جو کوہ ہمالیہ کے پاؤں ہلا دے، اکھاڑ دے، اسے متزلزل کر دے۔

یقین کی کہانی سمجھنے کے لئے میں آپ کے سامنے فیکٹری کی مثال پیش کرتا ہوں۔ آپ کی زندگی کی تمام تر کامیابیاں یا ناکامیاں آپ کی اپنی فیکٹری کی پیداوار ہیں۔

کون سی فیکٹری؟

دماغ کی فیکٹری، ذہن کی فیکٹری۔

اس فیکٹری کی پروڈکشن کو مینج کرنے کے لئے آپ نے دو "منیجر" رکھے ہوئے ہیں۔ ایک کا نام ہے 'مسٹر فتح' اور دوسرے کا نام ہے 'مسٹر شکست'۔

مسٹر شکست کا ایک ہی کام ہے۔ ہر وقت منفی خیالات کو تقویت دینا، حوصلہ شکنی، ناکامی اور بے ہمتی جیسے خیالات کی حوصلہ افزائی کرنا۔ پروڈکشن کا پلان چاہے کچھ بھی ہو، آرڈرز کے مطابق 'ڈیلیوری' کی آخری تاریخ سر پر تلوار کی طرح لٹک رہی ہو، فیکٹری کی مصنوعات کو پھیلانے، پروموٹ کرنے کے چاہے کتنے

ہی زبردست مواقع ہوں، آپ کی صلاحیتوں کے خریدار 'ہیڈ آفس' میں آپ کی مصنوعات کا چاہے کتنی ہی بے تابی سے انتظار کیوں نہ کر رہے ہوں۔ مسٹر شکست آپ کی فیکٹری کے تمام ملازمین تک یہ منفی پروپیگنڈا پھیلائیں گے۔ "آج تو یہ ممکن نہیں ہے، یہ ہو نہیں پائے گا، مشکل ہے، ناممکن ہے" وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف مسٹر فتح کا کام حوصلہ بڑھانا، مثبت پیغامات کی اشاعت کرنا، توانائی کے انجکشن لگانا، تعریف اور ہمت افزائی کے میٹھے بول بولنا اور کر دکھانے کی لگن پیدا کرنا ہے۔ جب مسٹر فتح ایکشن میں ہوں تو کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے۔

آپ کے خیال میں کن صاحب کی پروموشن ہونی چاہئے اور کن صاحب کو گیٹ کی راہ دکھانی چاہئے؟

آپ کا جواب تو صحیح ہے لیکن جب آپ عملاً فیصلہ کر رہے ہوتے ہیں تو تالے بے چارے 'مسٹر فتح' کی زبان پر لگوائے جاتے ہیں اور پروموشن پہ پروموشن دیتے رہتے ہیں آپ 'مسٹر شکست' کو۔ یاد کیجئے، شروع میں مسٹر شکست ایک معمولی ورکر تھا جسے آپ نے اب فیکٹری منیجر کا درجہ دے دیا۔

ذرا سوچئے! جب کسی اہم جگہ پر آپ کا انٹرویو ہو، یا باس کے ساتھ اہم رپورٹ پر ڈسکشن ہو، یا کسی کسٹمر کے سامنے سیلز پلان رکھنا ہو، تو آپ کے اپنے ذہن کی اپنی فیکٹری میں کس طرح مسٹر شکست، مسٹر فتح کو چپ کرا دیتے ہیں۔

آپ اپنی زندگی میں جو بھی کامیابیاں چاہتے ہیں اُن کی 'مینوفیکچرنگ' اگر آپ کے ذہن میں ہوتی ہے تو پھر اس فیکٹری کا چارج کس کے ہاتھ میں ہونا چاہئے، مسٹر فتح کے یا پھر مسٹر شکست کے؟

مسٹر فتح جیسا یقین جہاں پہاڑوں کو ہٹا سکتا ہے وہاں مسٹر شکست جیسی بے یقینی خوابوں کے گھروندوں کو ملیامیٹ کر سکتی ہے۔

'یقین' آپ کی کامیابی کے لئے 'تھرمومیٹر' کی حیثیت کا حامل ہے۔ جن لوگوں نے زندگی میں کم حاصل کیا، ریسرچ کر کے دیکھ لیں انہوں نے زندگی میں خود پر یقین بھی کم ہی کیا ہے۔

سارا دن خود کو 'دبانے' والی سوچوں کی زنجیروں سے نکلئے اور خود کو 'اٹھانے' والی سوچ پہ بھی ذرا کان دھریئے۔

اپنے اندر سے اٹھتی ہچکتی آوازوں کو سنیں یہ آوازیں آپ کو کب سے 'یقین' دلانا چاہ رہی ہیں کہ آپ کتنے باصلاحیت ہیں۔ آپ میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے۔ خدا کے لئے اپنے اندر کی اصل شخصیت کو بننے، سنورنے، ابھرنے اور نکھرنے کا موقع دیجئے۔

سر اٹھا کے جینے، اپنی شخصیت کو نکھارنے کیلئے تیسری ضروری چیز ہے 'چیلنج'

کیا آپ کی زندگی میں کوئی بامعنی 'چیلنج' ہے؟

اگر چیلنج کے بغیر شخصیت بنتی اور نکھرتی نہیں تو چیلنج سے بچ کر بھاگ جانے والے، چھپ جانے والے، راستہ بدل جانے والے، آنکھیں چرا لینے والے لوگوں کی شخصیت کیا خاک نشوونما پائے گی؟

ہم سب ہی بھگوڑے ہیں۔ ہم اعتراف نہیں کرتے...... مانتے نہیں...... کیوں؟ اس لئے کہ مان جانے سے انا کو بڑی ٹھیس پہنچتی ہے۔ مگر میں مانتا ہوں ہزاروں لوگوں کو موٹیویشن کی چابی دینے والی کتاب "شاباش! تم کر سکتے ہو" لکھنے کے بعد بھی آپ شاید نہیں مانیں گے کہ میں 'بھاگتا' رہا ہوں، چیلنجز سے، مشکلات سے۔ کیا آپ مانیں گے کہ دوسروں کو ڈٹے رہنے کا حوصلہ دینے والا کئی بار ڈٹے رہنے کی بجائے 'فرار' ہونے

...سکون ڈھونڈتا رہا ہے؟
پتہ ہے کیوں؟ بات بڑی آسان ہے۔
ڈٹنے کی بجائے بھاگنا آسان ہے۔
بھاگنے سے ساری تکلیفیں چھٹ جاتی ہیں۔
...ارے 'تحفظ' کو کوئی خطرہ لاحق نہیں رہتا۔
اس کے برعکس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی صورت میں ...میں بے آرامی کو گلے لگانا پڑتا ہے۔ اپنے خوف کی ...آنکھوں میں آنکھیں ڈالنی پڑتی ہیں خود کو 'ٹیسٹ' کرنا ...تا ہے۔ اس سے کہیں آسان ہے کہ تصوراتی خوف کے ...پہاڑ کھڑے کردیئے جائیں، جنہیں عبور کرنا مشکل دکھائی ...دیتا ہے۔
جب ان تصوراتی پہاڑوں کے بارے میں اتنی ...کثرت اور خلوص سے سوچنا شروع کردیا جائے تو وہ حقیقی ...پہاڑوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔
...سر اٹھا کے جینے کے لئے 'چیلنج' لینا ضروری ہے۔

جتنا بڑا چیلنج ہوگا، اسے پچھاڑنے کی خوشی بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ چیلنج سے گھبرایئے نہیں، آگے بڑھ کر اس کا شکریہ ادا کیجئے، کیونکہ یہ چیلنج ہی تو ہے جو آپ کو آپ سے ملواتا ہے، چھپی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع دیتا ہے، خود اعتمادی سکھاتا ہے اور سب سے بڑھ کے خود اعتمادی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

تو پھر وعدہ کیجئے کہ سر اٹھا کے جینا ہے۔ سوچ کو بلند رکھنا ہے۔ یقین کو کامل رکھنا ہے اور اپنے لئے چیلنج ڈھونڈنا ہے۔ اپنے لئے ہر روز ایک نیا چیلنج رکھنے سے ہی زندگی آگے بڑھتی ہے۔ ہر چیلنج کو مات دینے سے ہی یقین افروز ہوتا ہے، سوچ خود بخود بلند سے بلندتر ہوتی جاتی ہے اور چیلنجز سے کھیلنا زندگی کا معمول بن جاتا ہے۔ پھر آپ کو خود بھی نہیں پتہ چلتا کہ کب دنیا آپ کو سر اٹھا کر جینے کے لئے اپنا رول ماڈل سمجھنے لگی ہے۔

آپ کون سا حج کریں گے؟

چونکہ عازمین حج، حج افراد، حج قران یا حج تمتع ہی کرتے ہیں۔
لہٰذا مضمون ہٰذا میں انہی تین اقسام کے حج کا مختصر بیان کیا گیا ہے۔

☆ ڈاکٹر [illegible]
E-mail: aap.haj_umrah@yahoo.com

حج دین اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے۔ حج کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم حج افراد، دوسری قسم حج قران، تیسری قسم حج تمتع ہے۔ ایک وقت میں صرف ایک ہی نوع کا حج ادا ہو سکتا ہے اور تینوں اقسام میں سے کوئی ایک حج ادا کرنے سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ بیک وقت تینوں اقسام کے حج ادا نہیں ہو سکتے۔ البتہ اگر کسی کو بار بار حج پر جانے کے مواقع نصیب ہوں تو تینوں قسم کے حج کی ادائیگی علیحدہ علیحدہ برسوں میں کی جا سکتی ہے۔ تینوں اقسام کے حج میں کیا فرق ہے ان کی ادائیگی کا کیا طریقہ کار ہے اور حج پر جانے کا ارادہ رکھنے والوں کو کس قسم کا حج ادا کرنا چاہیے مندرجہ ذیل سطور میں اسی موضوع پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

1۔ حج افراد:۔ اس سے مراد ایام حج میں احرام پہن کر صرف حج کرنا ہے اس میں عمرہ شامل نہیں ہوتا۔ حج افراد وہ لوگ کرتے ہیں جو مکہ معظمہ، حدود حرم اور حدود میقات (حل) کے اندر مستقل رہائش رکھتے ہیں، یا وہ لوگ جو حدود میقات سے باہر رہائش رکھتے ہوں اور حج بدل کے ارادہ سے مکہ معظمہ میں آئیں۔ حج بدل کرنے والے جس کی طرف سے حج کریں گے اس کا نام بھی نیت کے وقت زبان سے پکاریں گے کہ یہ حج فلاں بن فلاں کی طرف سے کروں گا۔ حج بدل کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس نے پہلے اپنا حج فرض کیا ہو حج افراد کرنے والے آٹھ ذوالحجہ کو یا اس تاریخ سے ایک آدھ دن پہلے (جیسی بھی صورت ہو) احرام باندھ کر حج کی نیت کریں گے۔ بہت زیادہ دن قبل حج کا احرام نہیں باندھا جاتا کیونکہ ایسی صورت میں احرام کی پابندیوں کی خلاف ورزی ہونے کا اندیشہ ہو جاتا ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں دم دینا پڑتا ہے۔ دم کا مطلب ہے حدود حرم میں ایک بکرا بکری، بھیڑ یا دنبہ کو ذبح کر کے کفارہ ادا کرنا۔ حج افراد کی نیت یوں کی جاتی ہے۔ "اے اللہ میں حج کا ارادہ کرتا ہوں تو اسے میرے لئے آسان فرما اور قبول فرما" نیت کرنے کے بعد لبیک یعنی تلبیہ پکارنا شروع کر دے گا۔ واضح رہے کہ حج کی نیت کرنے سے پہلے سر کو ڈھانپ کر احرام کے دو نفل ادا کئے جائیں گے اور پھر سر کو ننگا کر کے حج کی نیت کی جائے گی۔ حج افراد کرنے والے عمرہ نہیں کریں گے بلکہ طواف قدوم کریں گے اور منیٰ عرفات اور مزدلفہ میں سوائے قربانی کرنے

نے تمام ارکان حج ادا کریں گے۔ حج افراد کرنے والے پر قربانی واجب نہیں ہے۔ دس ذوالحجہ کو منیٰ میں بڑے شیطان کو سات کنکریاں مارنے کے بعد سر منڈوا کر احرام اتار کر عام کپڑے پہن لیے جاتے ہیں۔

2۔ حج قران:۔ اس سے مراد ایام حج میں ایک ہی دفعہ احرام میں عمرہ اور حج ادا کرنا ہے۔ حج کی تینوں اقسام میں حج قران، افضل بتایا گیا ہے۔ حدود میقات سے باہر رہائش رکھنے والے آفاقی لوگ ہی حج قران ادا کرتے ہیں۔ مکہ معظمہ حدود حرم اور حدود میقات میں رہنے والے حج قران نہیں کر سکتے تاآنکہ وہ آفاقی ہونے کی شرائط پوری نہ کرلیں۔ حج کے دن سے چند یوم قبل حج قران کی نیت کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اتنا عرصہ تک احرام کی پابندیاں برقرار رکھی جاسکیں۔ اس دوران احرام کی چادریں ناپاک یا میلی ہونے پر تبدیل بھی کی جاسکتی ہیں۔ حج قران میں عمرہ اور حج کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے اور سر ڈھانپ کر احرام کے دو نفل پڑھے جاتے ہیں۔ سلام پھیر کر سر ننگا کر کے حج قران کی نیت ان الفاظ میں ادا کی جاتی ہے۔ ''اے اللہ میں عمرہ اور حج دونوں کا ارادہ رکھتا ہوں تو ان دونوں کو میرے لئے آسان فرما اور دونوں کو قبول فرما'' نیت کے بعد تلبیہ پکاری جاتی ہے۔ احرام کی پابندیاں قارن یعنی حج قران کرنے والا پہلے عمرہ ادا کرتا ہے مگر عمرہ کے بعد نہ سر منڈاتا ہے اور نہ احرام کھولتا ہے اور اسی احرام میں منیٰ عرفات اور مزدلفہ میں تمام ارکان حج ادا کرنے کے بعد دس ذوالحجہ کو منیٰ میں بڑے شیطان کو سات کنکریاں مارنے کے بعد قربانی کرتا ہے اور سر منڈوا کر احرام کھول دیتا ہے حج قران والا حج مکمل ہونے تک نفلی عمرے نہیں کرسکتا۔

3۔ حج تمتع:۔ اس سے مراد ایام حج میں احرام پہن کر عمرہ کرنا سر کے بال منڈوا کر احرام کھول دینا اور آٹھ ذوالحجہ کو دوبارہ احرام باندھ کر حج کرنا ہے۔ حج تمتع کرنے والے پہلے احرام باندھ کر احرام کے دو نفل سر ڈھانپ کر پڑھیں گے پھر سر کو ننگا کر کے عمرہ کی نیت ان الفاظ میں کریں گے ''اے اللہ میں نے عمرہ کا ارادہ کیا ہے تو اسے میرے لئے آسان فرما اور قبول فرما'' نیت کرنے کے بعد لبیک یعنی تلبیہ پکاریں گے اور مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ ادا کریں گے۔ آٹھ ذوالحجہ کو مکہ معظمہ میں دوبارہ حج کا احرام باندھ کر دو نفل پڑھنے کے بعد حج کی نیت ان الفاظ میں کریں گے ''اے اللہ میں نے حج کا ارادہ کیا ہے تو اسے میرے لئے آسان فرما اور میری جانب سے قبول فرما '' پھر لبیک پکارنا شروع کریں گے''۔ عمرہ یا حج کا احرام پہننے سے پہلے غسل یا وضو کیا جاتا ہے غسل کرنا افضل ہے۔ اس اہم موقع پر غسل کریں اور پھر اپنے جسم پر احرام کی دو چادریں لپیٹ لیں۔ ان چادروں کے نیچے بنیان یا انڈرویئر قسم کی کوئی چیز نہ ہوگی۔ احرام باندھنے کے بعد سر کو ڈھانپ کر احرام کے دو نفل پڑھے جاتے ہیں پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ کافرون اور دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص پڑھی جاتی ہے اگر کسی کو سورۃ کافرون یا سورۃ اخلاص یاد نہ ہو تو وہ کوئی سورتیں پڑھ لیں۔ نفلوں کا سلام پھیر کر سر ننگا کیا جاتا ہے اور عمرہ یا حج کی نیت کی جاتی ہے جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بتایا گیا ہے۔ نیت کرنے کے بعد بلند آواز سے تین دفعہ تلبیہ یعنی لبیک پکاری جاتی ہے۔ عورتیں آہستہ آواز میں تلبیہ پکارتی ہیں۔ عورتیں مردوں کی طرح چادریں نہیں پہنیں گی بلکہ اپنے روزمرہ کے لباس کے علاوہ سر کے اوپر ایک رومال باندھ کر اپنے بال چھپالیں گی۔ وضو کرتے وقت عورتیں سر والا رومال اتار کر سر کا مسح کریں گی اور وضو کے بعد دوبارہ سر پر رومال باندھ لیں گی ۔ احرام کی حالت میں عورتیں باریک اور چست لباس نہیں پہنیں گی اور کپڑوں کے اوپر عبایا یا برقع پہن لیں۔

جن آفاقی حضرات کو حج سے قبل مکہ معظمہ میں

زیادہ مدت تک قیام کرنا ہوتا ہے وہ گھر سے ہی عمرہ کی نیت سے نکلتے ہیں۔ مکہ معظمہ پہنچتے ہی عمرہ مکمل کر کے احرام کھول دیتے ہیں۔ حج سے پہلے مدینہ شریف میں حاضری دے کر چالیس نمازیں پوری کر کے واپس مکہ معظمہ آجاتے ہیں اور آٹھ ذوالحجہ سے پہلے پہلے اپنے والدین' رشتہ داروں عزیزوں' بہن بھائیوں اور اپنے لئے نفلی عمرے بھی ادا کرتے ہیں۔ جو لوگ حج کے بعد مدینہ شریف جاتے ہیں۔ وہ بھی آٹھ ذوالحجہ سے پہلے پہلے اور 13 ذوالحجہ کے بعد مدینہ شریف کو روانگی کی تاریخ تک نفلی عمرے کرتے ہیں۔ نفلی عمروں کا ثواب اور سعادت حاصل کرنے کے لئے حجاج کی اکثریت حج قران کی نسبت حج تمتع کرنا پسند کرتی ہے۔ حج تمتع کا عمل آسان ہے اس میں احرام کی پابندیاں بھی زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرنا پڑتیں۔ اہل مکہ اور حدود میقات کے اندر رہنے والے حج تمتع نہیں کر سکتے۔

ابتدائی اور درمیانی حج پروازوں سے جانے والے عمرہ کی نیت کر کے جائیں اور حج تمتع ادا کریں۔ آخری حج پروازوں سے جانے والے حج قران کی نیت کر کے جا سکتے ہیں۔ حج بدل پر جانے والے بھی عام حالات میں حج افراد کی نیت کر کے جائیں۔ احرام کے بارے میں ایک عام غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ جب تک عمرہ یا حج مکمل نہ ہو جائے احرام تبدیل نہیں ہو سکتا اور احرام کی حالت میں غسل نہیں ہو سکتا یہ تاثر غلط ہے۔ محرم یعنی احرام پہننے والا حسب ضرورت غسل بھی کر سکتا ہے اور احرام کی چادریں میلی یا ناپاک ہو جائیں تو تبدیل کی جا سکتی ہیں۔ حج افراد کرنے والا احرام پہن کر حج کی نیت کے بعد تلبیہ پکارنا شروع کر دے گا اور طواف قدوم اور طواف نفل میں بھی آہستہ آواز سے تلبیہ پکار سکتا ہے۔ حج قران کرنے والا طواف عمرہ' طواف نفل اور طواف قدوم میں بھی آہستہ آواز سے تلبیہ پکار سکتا ہے جبکہ حج تمتع کرنے والا طواف عمرہ کے دوران تلبیہ نہیں پکارے گا بلکہ طواف کی نیت کرنے سے پہلے تلبیہ پکارنا بند کر دے گا پھر آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام پہن کر تلبیہ پکارنا شروع کرے گا۔ تینوں اقسام کا حج کرنے والے منیٰ، عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں تلبیہ جاری رکھیں گے۔ اور دس ذوالحجہ کو بڑے شیطان کے قریب پہنچ کر کنکریاں مارنے کا عمل شروع کرنے سے قبل تلبیہ پکارنا بند کر دیں گے۔

چونکہ عازمین حج، حج افراد، حج قران یا حج تمتع ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا مضمون ہذا میں انہی تین اقسام کے حج کا مختصر بیان کیا گیا ہے۔

ذیل میں ایک چارٹ دیا جا رہا ہے۔ اس چارٹ سے عمرہ، حج افراد، حج قران اور حج تمتع کے مناسک اور ان کی ادائیگی کے مقامات ایک نظر میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ حج پر جانے والے حضرات اس چارٹ کو اپنے پاس محفوظ کر لیں۔

ترتیب وار مناسک عمرہ و حج

O

ہر عمل سے پہلے اس کا نتیجہ سامنے رکھنا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔
ہمیں جو کچھ مل رہا ہے یا چھینا جا رہا ہے ہمارے کسی نہ کسی عمل کا ہی نتیجہ ہے۔

رمیز احمد
0331-5178929

میں ابن آدم دوسروں کی بہن کے لئے نظروں میں ہوس رکھتا ہوں اور دوسروں کی نظروں کی ...ایت کرتا ہوں۔

میں بنت حوا جسم چھپانے کے لئے کپڑے پہننے کی ...پائے جسم نمایاں کرنے والے کپڑے پہنتی ہوں اور ...سروں کی غلط نظروں کی شکایت کرتی ہوں۔ تو میں یہ ...یوں نہیں سوچتی کہ میرا ایسے کپڑے پہننے کے پیچھے مقصد ...یا ہے؟

میں ابن آدم کسی کی ہونے والی بیوی کو ورغلانے ...میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا پر مجھے میرے لئے پاکیزہ لڑکی ...ہے جس پر کسی کی پرچھائیں بھی نہ پڑی ہو۔

اس طرز منافقت کے بارے میں مجھے سوچنا ہوگا، ...رف شکایت کرنے سے کچھ ٹھیک نہیں ہو سکتا اور دنیا کو ...یک کرنے کی کوشش کرنے سے بھی کچھ ٹھیک نہیں ہو سکتا ...ب تک میں خود کو ٹھیک نہیں کرتا کچھ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

میں وہی ہوں جو ایک چاول کی پلیٹ پر اپنا سب ...سے بڑا جمہوری حق بیچ دیتا ہوں اور پھر حکومت کی شکایت ...ی کرتا ہوں۔

میں خود Signal توڑ کر دوسروں کو بھی توڑنے کی ترغیب دیتا ہوں اور جب میرا کوئی پیارا حادثے کا شکار ہوتا ہے تو پھر شکایت کرتا ہوں۔

میں اپنے باپ کو کم عقل سمجھ کر اس سے زبان درازی کرتا تھا اور اب جب میں خود ایک باپ ہوں تو اپنے ساتھ اسی بات کی شکایت کرتا ہوں حالانکہ میرے ساتھ کچھ غلط نہیں ہو رہا۔ میرے ساتھ یہ ہونا ہی تھا کیونکہ میں نے خود یہی کیا تھا۔ میں نے جو بیج ڈالا تھا آخر وہ ہی کاٹنا تھا۔ میں نے خود خدمت سے جی چرایا تھا تو اب شکایت کیوں؟ وہ وقت بیت چکا جب میں مضبوط تھا۔ اب میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں۔ میرے خون کی جگہ میری رگوں میں صرف پچھتاوا دوڑ رہا ہے۔ پر میں شکایت کے علاوہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔ اب میں جانتا ہوں کہ ہر عمل Investment ہے یہ برے موسم کے لئے Saving ہے۔ جو کچھ بھی میرے ساتھ ہو رہا ہے یہ میرے کسی نہ کسی عمل کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ مکافات عمل کی ہی دنیا ہے۔

ہر عمل سے پہلے اس کا نتیجہ سامنے رکھنا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ہمیں جو کچھ مل رہا ہے یا چھینا جا رہا ہے ہمارے کسی نہ کسی عمل کا ہی نتیجہ ہے۔ عمل لاثانی ہوا کرتا

وفادار

جو شخص خود اپنے ساتھ وفادار نہیں وہ کسی اور کے ساتھ بھی وفادار نہیں ہو سکتا۔ وفاداری کا آغاز انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے اللہ کے ساتھ دھوکا کرتا ہے وہ بھلا کسی انسان کو کیسے نواز سکتا ہے؟

(دستگیر شہزاد)

ہے کیونکہ یہ نتیجہ در نتیجہ چلتا ہے۔ یہ ایک Chain Reaction ہے عمل کا نتیجہ، نتیجے کا رد عمل اور اب اس کا نتیجہ اور یہ چلتا رہتا ہے۔

ہاں اب کہہ دو کہ یہ سب کتابی باتیں ہیں، کہانیاں ہیں تو اگر کہانیاں زندگی کی طرح ہو سکتی ہیں تو زندگی کہانیوں کی طرح کیوں نہیں ہو سکتی۔ کتابوں میں کیا کسی اور مخلوق کو دیکھ کر لکھا ہے انہوں نے؟

غور کیا کرو سوچا کرو، ہاں میں مانتا ہوں کہ سکون تو اس کو بھی ہے جس کو کوئی سوچ نہیں پر یہ بھی سچ ہے کہ اس کی وجہ سے کسی کو بھی سکون نہیں۔ سوچ کو مارنے سے بہتر ہے اس کی سمت درست کی جائے۔

خیر ہم بات شکایت کی کر رہے تھے۔ میں بہت کام کی باتوں کو اپنے ضمیر کی آواز کے باوجود لبیک کہنے کی بجائے کتابی باتیں کہہ کر فرار حاصل کر لیتا ہوں اور نقصان اٹھانے کے بعد شکایت کرتا ہوں کہ کسی نے سمجھانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

سو مجھے آج ہی شکایت کا دامن چھوڑ کر مثبت سوچ کا دامن پکڑنا ہوگا۔ خیال کو طاقتور بنانا ہوگا کیونکہ خیال کو دبانا اپنے سانس کو روکنے کے مترادف ہے اور سانس کے بغیر تو بس ایک بار موت ہوتی ہے پر خیال کے بغیر روز موت سے ملاقات کرنی پڑتی ہے۔

"ہم عزت دار خاندانی لوگ ہیں۔ باپ دادا کی قائم کی ہوئی روایات پر مرنے والے۔ زبان کا پاس رکھنے والے۔ غیرت مند لوگ اپنی منگ کبھی نہیں چھوڑتے۔

منگ

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

مولوی امیر الدین کا پارہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ساتویں آسمان پر تھا۔ گرجتے برستے مولوی کا ہوائی فائر کرنے میں تو کوئی ثانی ہی نہیں تھا۔ حالانکہ سیدانی بھی بڑی دل گردے والی عورت تھی۔ زبان کی کافی تیز۔ کرنے پر آتی تو ذرا لحاظ نہ کرتی مگر جب مولوی امیر الدین فائر کھولتے تو سیدانی سیز فائر کر دیتی۔ زندگی کی گاڑی بس یونہی چھک چھک کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ کسی سٹیشن پر ذرا زیادہ دیر رک جاتی اور جب تک سبز جھنڈی ہلتی نظر نہ آتی زمین و آسمان سانس روکے رکھتے۔

مگر آج تو حد ہی ہو گئی تھی مولوی امیر الدین کو دورہ کر غصے کے دورے پڑ رہے تھے۔ سب بچے اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے بس تیروں کی بوچھاڑ سہنے کے لیے سیدانی میدان میں ڈٹی ہوئی تھی۔ بات کچھ بھی نہ تھی بڑی بیٹی شرمین نے کالج میں داخلے کی ضد کر ڈالی تھی مولوی امیر الدین کو یوں لگا جیسے اس نے باپ دادا کی عزت پر کالک پوت دی ہو۔ بیٹی بھی ذہن کی پکی تھی۔ ایک ہی رٹ تھی کہ "آخر وہ کب تک گھر میں بیکار بیٹھی رہے گی۔ نہ آگے پڑھنے کی آزادی... نہ ہی کوئی ملازمت کرنے کا ماحول.... ایسے میں کوئی کرے تو کیا کرے؟

انگلینڈ میں رہتے ہوئے بھی اس قدر دقیانوسی ماحول.... ؟" شرمین اکثر بڑبڑاتی.....! مولوی امیر الدین بیوی اور بیٹیوں کو تو تہہ خانے میں چھپا کر رکھتا مگر محلے بھر کی نئی نئی جوان ہوتی ہوئی شوخ و شنگ لڑکیوں کو کن انکھیوں سے دیکھنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ مولوی کے اسی دوغلے پن سے اس کی بیٹی شرمین کو چڑ تھی کہ "خود میاں فضیحت اور دوسروں کو نصیحت......!" مولوی کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ شرمین اور ریان جڑواں بہن بھائی تھے اس کے بعد نرمین اور کامران..... بچے ماں باپ کے درمیان ہونے والی سرحدی جھڑپوں میں ملوث نہ ہوتے وگرنہ ماں کی طرفداری کرنے کی پاداش میں ان کی شامت آجاتی۔

سیدانی محلے بھر کی بچیوں کو قرآن پاک پڑھا کر ثواب دارین حاصل کرتیں۔ بسم اللہ۔ آمین.... عقیقے..... میلاد..... گیارہویں..... نذر نیاز.... نذرانے بس ایک شور سا مچا رہتا۔ چند ایک عورتیں ہمیشہ سیدانی کے پاس دعا کروانے کی غرض سے موجود رہتیں۔ ہر جمعرات کو خاص دعا کا اہتمام کیا جاتا۔ درود وسلام کی محفل منعقد ہوتی۔ جو مولوی امیر الدین کے گھر لوٹ آنے سے پہلے ہی ختم کردی جاتی۔

اگر کبھی عورتوں کو اٹھنے میں دیر ہو جاتی اور مولوی امیر الدین گھر لوٹ آتا تو اس کے قدموں کی چاپ سن کر سبھی عورتیں دوپٹے، چادریں دوبارہ سے درست کرنے لگ جاتیں۔ سیدانی ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کو کہتی کہ "مولوی امیر الدین راہداری سے گزر جائیں تو وہ پھر نکلیں۔" گویا ایک ہنستا بستا گھر نہ ہوا بیگار کیمپ ہو گیا۔ جہاں ہر وقت کسی انہونی کا دھڑکا لگا رہتا۔

مولوی کی بڑی بیٹی شرمین زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ جی بھر کر جینا چاہتی تھی۔ ہنستا۔ کھیلنا۔ کودنا چاہتی تھی مگر گھر کا ماحول یوں تھا جیسے شہر خموشاں۔ ایسے میں تنہائی سے گھبرا کر وہ کسی نہ کسی سہیلی کو گھر پر بلاتی کیونکہ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

چھوٹی بیٹی نرمین اللہ میاں کی گائے تھی۔ سکول ختم کرتے ہی گھر کی زیادہ تر ذمہ داری اس کے کندھوں پہ ڈال دی گئی تھی۔ کیونکہ اس کے اندر ایک فطری رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا جو کہ شرمین میں قدرے کم تھا۔ اس کی نٹ کھٹ طبیعت اسے کبھی سنجیدہ ہونے کا موقعہ ہی نہ دیتی۔ جبکہ نرمین بہت کم ہنستی اور بولتی..... اس نے کبھی شکایت کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں شرمین ہمیشہ مولوی کے لیے درد سر بنی رہتی۔ شکل وصورت اور رنگ روپ میں نرمین سے کافی دبتی تھی اس لیے اور کئی حیلوں بہانوں سے نمایاں ہونے کی کوشش میں لگی رہتی۔ کبھی بھڑکیلا لباس تو کبھی تیز میک اپ بات بے بات قہقہے لگانا۔ جن کی آواز سے مولوی کو سخت چڑ تھی۔ مولوی کا بس نہیں چلتا تھا کہ بے فکری سے قہقہے لگاتی ہوئی شرمین کا گلا دبوچ لے کیونکہ مولوی کے خیال میں "عورتوں کو زیادہ وقت گھرداری، عبادت، توبہ استغفار اور گریہ زاری میں گزارنا چاہیے کیونکہ اپنے ناشکرے پن کی وجہ سے جہنم میں زیادہ عورتیں ہی ہوں گی اور انہیں اس دنیا میں ہی اپنی بخشش کا سامان کرنا چاہیے۔"

مولوی امیر الدین کو فکر تھی کہ کسی طرح شرمین کے ہاتھ پیلے کر دے۔ کئی جاننے والوں سے رشتے کے بارے میں کہہ رکھا تھا مگر جب بھی کوئی رشتہ آتا شرمین کوئی نہ کوئی ڈرامہ رچا کر لوگوں کو گھر سے بھگا دیتی اور سیدانی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس کی نادانیوں پر پردہ ڈال دیتی۔ دراصل شرمین کو شادی کے نام سے ہی نفرت تھی۔ ابا اور اماں کے بے جوڑ رشتے کی نوعیت دیکھ کر تو وہ شادی کے نام سے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتی تھی کیونکہ وہ ابا جیسے کسی اور شخص کے پلے پڑ کر گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس قدر بے رنگ زندگی سے شرمین سمجھوتہ نہیں کر پا

رہی تھی۔ ایک دن بڑے بھائی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے
کس نے رنگین ٹی وی اور وی سی آر کرایے پر لے لیا۔
مولوی امیر الدین جیسے ہی گھر میں داخل ہوا۔ غیر مانوس
سی آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ لونگ روم
میں ٹی وی اور وی سی آر دیکھ کر تو وہ جیسے پاگل ہی ہو اٹھا۔
پہلے تو بیوی کی خوب خبر لی۔ کہ وہ جہنمی عورت ہی جو اولاد کو
غلط راہ پر لگا رہی تھی۔ سیدانی کے ترکی بہ ترکی جواب کے
نتیجے میں آج پہلی بار مولوی امیر الدین کا ہاتھ اس پر اٹھ
گیا تھا۔

"ہائے پاپی۔ مردود۔ ظالم۔ ارے لوگو دیکھو۔
بڑھاپے میں زندگی بھر کے صبر کا کیا صلہ مل رہا ہے۔
ارے میں تو سہاگن سے رانڈ بھلی۔ یہ خصم نہیں۔ سینے کا
زخم ہے۔ ہائے کدھر جاؤں میرے مولا۔ ایسے دوزخی
سے کب رہائی ملے گی۔" آج سیدانی کے صبر کا پیمانہ
چھلک اٹھا تھا۔

"خصم جا حرامزادی۔ حرافہ۔ ابھی مزہ چکھاتا ہوں
تجھے......" ایک اور زناٹے دار تھپڑ سیدانی کا دوسرا گال بھی
گلال کر گیا۔ سیدانی سنے سینہ پیٹ پیٹ کر لال کر لیا۔
مولوی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیا۔
شرمین بھاگ کر بیڈ روم میں جا چھپی۔ بڑا سا لوہے کا راڈ
اٹھا کر مولوی نے پوری قوت سے ٹی وی اور وی سی آر
توڑنے شروع کر دیے۔ جیسے اس کے اندر الہ دین کے
چراغ کا جن گھس گیا ہو۔ ٹی وی اور وی سی آر پر زور
آزمائی سے تھک جاتا تو بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیتا۔ بیٹا
بھی ایسا بسم اللہ کا گنبد کہ اف تک نہیں کی۔ ورنہ کڑیل
جوان تھا۔ باپ کا ہاتھ تو روک ہی سکتا تھا۔ مگر مولوی
امیر الدین نے گھر میں اپنی کچھ ایسی دہشت پھیلا رکھی تھی
کہ کوئی اس کے مقابل نہ آتا۔ سیدانی اپنے گال سہلاتی
ہوئی جھر جھر روئے جا رہی تھی۔ آج تو اس نے مولوی
امیر الدین کو بے نقط سنا ڈالیں گویا اگلے پچھلے سب

حساب برابر کروا لے۔

"بے غیرت، رانڈ۔ تیری کبھی بخشش نہ ہوگی۔ تُو دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں پھینکی جائے گی.... ناشکری۔ بے حیا۔" مولوی بکتا جھکتا گھر سے باہر چلا گیا۔

گھر میں وجہ حرارت ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ دوسرے دن پھر ہنگامہ ہوگیا۔ مولوی کا خیال تھا کہ شرمین اور ریان دونوں کی اب شادی کر دینی چاہیے۔ ریان کے لیے تو اس نے رشتے کے بھائی کی بیٹی سے۔ بغیر کسی سے مشورہ کیے...... پاکستان میں بات طے کر لی تھی، آج سیدانی نے اسے فون پر بات کرتے سنا تو گھر پھر سے پانی پت کا میدان بن گیا۔ سیدانی کا موقف تھا کہ "بچے جب پاکستان میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتے تو تم کیوں بضد ہو؟"

"دیکھتا ہوں کس میں میرے فیصلے کے خلاف جانے کی مجال ہے۔ یہ سب تیری ہی شہ کا نتیجہ ہے۔ تُو ہی ایک دوزخن ہے اس گھر میں۔ اور سب کو اپنے ساتھ جہنم میں لے کر جائے گی۔" مولوی امیر الدین پھر شعلہ بیانی پر اتر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سیدانی کوئی جواب دیتی۔ دروازے پر کسی نے کال بیل بجا دی۔ اور سیز فائر ہوگیا۔ اب ہر دوسرے تیسرے روز شادی کے مسئلے کو لے کر جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ پھر یوں ہوا کہ مطلع بالکل صاف ہوگیا۔ شادی کے ذکر سے جیسے مولوی کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ گھر بھر پُرسکون سا ہو گیا تھا۔ اس کایا پلٹ پر سب حیران سے تھے۔ مولوی اور سیدانی میں بات چیت ابھی تک بند تھی۔

چند ہفتوں کے بعد مولوی امیر الدین نے ایک دن اچانک اعلان کر دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے پاکستان جا رہا تھا...... سب نے سکھ کا سانس لیا...... تقریباً دو ماہ پاکستان میں رہ کر مولوی امیر الدین واپس انگلینڈ آیا تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ خوشی چہرے سے پھوٹی پڑتی۔ بات بات پہ باچھیں کھل جا رہی تھیں۔

سیدانی اور بچوں نے اسے اس سے پہلے کبھی اتنا نرم خو، ہنس مکھ اور مرنجاں مرنج نہیں دیکھا تھا۔ انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس پُرسکون تالاب کی تہہ میں کیسے کیسے طوفان چھپے بیٹھے تھے۔ مگر پوچھنے کی جرأت کس میں تھی؟

چند روز بعد مولوی امیر الدین نے بیوی بچوں کو لونگ روم میں بلا کر ایک لرزہ خیز انکشاف کر دیا۔ "ہم عزت دار خاندانی لوگ ہیں۔ باپ دادا کی قائم کی ہوئی روایات پر مرنے والے۔ زبان کا پاس رکھنے والے۔ غیرت مند لوگ اپنی منگ کبھی نہیں چھوڑتے۔ اس لیے خاندانی عزت اور ناموس کو بچانے کی خاطر میں نے ریان کی منگیتر سے پاکستان میں شادی کر لی ہے۔"

بچوں کے چہرے شرم سے زمین میں گڑ گئے......

سیدانی کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی اور اس نے آہ و بکا شروع کر دی۔

"ہائے ہائے اٹھارہ سال کی معصوم بچی۔ تیری ان بیٹیوں سے چھوٹی۔ یہ کیا ظلم کیا تُو نے۔ ہائے ہائے؟ وہ اپنا سر پیٹتی جا رہی تھی۔ "کیسے لوگوں سے نظر ملاؤں گی۔ ان بیٹیوں کی ڈولیاں اس گھر سے کیسے اٹھیں گی۔ اے میرے مولا۔ مجھے اٹھا لے۔ اب کچھ اور دیکھنے کی حسرت نہیں ہے......" وہ انتہائی دردناک انداز میں بین کر رہی تھی۔ مگر مولوی امیر الدین سنی اَن سنی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شرمین کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باہر سڑک پر جا کر چیخ چیخ کر لوگوں کو بتائے کہ غیرت کے نام پر صرف جسموں کا قتل ہی آنر کلنگ نہیں بلکہ معصوم لڑکیوں کے ارمانوں، ان کے جذبوں، ان کی آرزوؤں، ان کی امنگوں اور خوابوں کا قتل بھی آنر کلنگ ہی ہے......!

مگر ایسے قتل کی سزا......؟

▲

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

صحرائی جاسوس اور صحرائی طوفان (1)

قسط 16 ☆ ---------- 0300-4154083 ---------- میاں محمد ابراہیم طاہر

2 دسمبر 1990ء کو بغداد کے انتہائی جنوب میں، ایک شخص صحرائی بدو کے گندے سے لباس میں، بے حس وحرکت ایک وادی کے کنارے پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ صبح صادق کا وقت تھا اور رات کے وقت صحرا کا درجہ حرارت صفر درجے سے نیچے چلا گیا تھا۔ اس شخص نے اپنے سر کو صوفیاء کے قدیم اسلامی فرقے "صارای" جیسی چمڑے کی لمبی ٹوپی "بپتا" (Bupta) سے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ صوفی لوگ عراق کے صحرا میں گھومتے پھرتے رہتے تھے اور لوگ ان کا احترام کرتے اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن اس آدمی کی وفاداریاں، چھ سو میل دور، مغربی سمت اسرائیل سے وابستہ تھیں۔ وہ موساد کا ایجنٹ تھا۔ اسے یہ کپڑے موساد کے سٹور روم سے ملے تھے، جہاں دنیا بھر کے لوگوں کے لباس موجود رہتے تھے اور لوگوں کے رجحانات کے مطابق ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ مختلف ملکوں میں کام کرنے والے موساد کے تجربہ لباس اسرائیلی سفارتخانوں کو لا کر دیتے تھے، جہاں انہیں سفارتی تھیلوں میں بھر کر تل ابیب پہنچا دیا جاتا تھا۔ مخالف اور دشمن عرب ممالک سے ایسے لباس وہاں آنے جانے والے اسرائیل کے ہمدرد لے کر آتے تھے۔ کچھ لباس سٹور روم میں کام کرنے والی درزنیں خود بھی تیار کرتی تھیں۔ سٹور روم کی انچارج اور اس کی ساتھیوں کو مختلف ملکوں اور علاقوں کے لباس تیار کرنے میں کافی مہارت حاصل تھی۔

موساد کے اس ایجنٹ کا خفیہ (کوڈ) نام شالوم تھا اور یہ اس فہرست سے لیا گیا تھا جو "آپریشن ڈویژن" نے رافی ایتان کے موساد کی سربراہی کے دور سے تیار کر رکھی تھی اور یہ عرفی ناموں کی فہرست رافی نے اس وقت تیار کرائی تھی جب وہ آخمین آپریشن (Eichmann) کی تیاری کر رہا تھا۔ اوڈولف آخمین کو پکڑنے سے پہلے شالوم وائز (Shelom Weiss) کو موساد کا بہترین جعلساز سمجھا جاتا تھا۔ شالوم وائز 1993ء میں کینسر میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا لیکن اس کا نام زندہ رہا اور بعد میں کئی خفیہ ایجنٹوں نے اسی نام سے کام کیا۔ آئی ڈی ایف کے چند سینئر افسروں اور شبتائی شاوت اور شالوم کے اپنے باس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ صحرا میں کیا کر رہا تھا۔

اگست 1990ء میں صدام حسین نے کویت پر یلغار کر دی اور قبضہ کر لیا جو اگلی خلیجی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کویت پر عراق کا حملہ اور قبضہ مغربی دنیا کی تمام خفیہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کی مکمل ناکامی کا نتیجہ تھا۔ کسی کو بھی پہلے سے اس حملے کی توقع نہ تھی۔ موساد ان خفیہ اطلاعات کی تصدیق میں مصروف تھی کہ صدام نے کیمیائی ہتھیاروں کا ایک بڑا ذخیرہ بغداد کے جنوب میں چند خفیہ مقامات پر جمع کیا تھا جس سے نہ صرف کویت شہر ان کے نشانے کی رینج میں آتا تھا بلکہ اسرائیل کے بعض شہر بھی ان کے نشانے میں آتے تھے۔

موساد کے اندرونی حلقوں میں اس بات پر شک و شبہ پایا جاتا تھا کہ عراق کے پاس ایسے راکٹ موجود تھے جو وار ہیڈز (War Heads) کو اپنے ہدف تک پہنچا سکیں۔ گیرالڈ بل (Gerald Bull) کو منظر سے ہٹایا جا چکا تھا اور اس کی تیار کی ہوئی سپر گن ابتدائی آزمائش کے بعد امریکین سٹلائٹ نگرانی کے مطابق، اب ٹکڑوں کی شکل میں پڑی تھی۔ شاوت کا تجزیہ یہ تھا کہ اگر صدام کے پاس وارہیڈز ہوں بھی تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ ان میں کیمیکل بھرا گیا تھا۔ وہ ایسے اندازے پہلے بھی پیش کر چکا تھا۔

شبتائی شاوت جس نے ابھی نیا نیا موساد کا چارج سنبھالا تھا، اس بات میں بڑا محتاط تھا کہ اسے جو کچھ بتایا جا رہا تھا اور جو رپورٹیں مل رہی تھیں ان کا انکشاف کر کے خوف و ہراس پیدا کرے۔ شالوم کے ذمہ یہ مشن لگایا گیا

تھا کہ وہ اصلیت معلوم کرے۔ وہ اس سے پہلے بھی عراق میں ایسے کئی مشن مکمل کر چکا تھا۔ ایک دفعہ وہ اردنی تاجر بن کر بغداد بھی جا چکا تھا۔ بغداد میں تو پہلے سے موساد کا مخبر موجود تھا جس نے اس کی مدد کی تھی لیکن یہاں لمبے چوڑے بے آب و گیاہ صحرا کے اندر، اسے خود ہی اپنے وسائل پر بھروسہ کرنا تھا اور اس ہنرمندی کا ثبوت دینا تھا جس کے لئے اس کے استادوں نے اسے تیار کیا تھا۔

شالوم کو اسرائیل کے نیگیو کے صحرا میں زندہ رہنے کی تربیت دی گئی تھی اور ریت کے طوفان کے اندر بھی اپنے ہدف کو پہچاننے اور یاد رکھنے کی ٹریننگ کرائی گئی تھی اور اپنے آپ کو اپنے اردگرد کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کے گر سکھائے گئے تھے۔ وہ دن رات ایک ہی قسم کے کپڑے پہنے رکھتا تھا تا کہ وہ صحرائی بدو نظر آئے۔ اس نے پورا ایک دن شوٹنگ رینج میں گزارا تھا تا کہ دشمن سے دو بدو مقابلے کی صورت میں اندھا دھند فائرنگ کر سکے۔ اس نے فارمسٹ کے ساتھ ایک گھنٹہ یہ سیکھنے کے لئے گزارا تھا کہ صحرا میں اس نے اپنی ہنگامی صورت حال کی دوائیوں کو کس وقت اور کس طرح استعمال کرنا تھا۔ ایک پوری صبح نقشوں کے مطالعے میں صرف کی تھی تا کہ صحرا میں اپنے راستوں کا درست اور صحیح تعین کر سکے۔

اس کے تمام انسٹرکٹرز (Instructors) کے لئے اس کی پہچان صرف ایک نمبر تھا۔ انہوں نے نہ تو اسے ذلیل و خوار کیا اور نہ ہی اس کی ستائش کی۔ انہوں نے اس کے سامنے اس بات کا بھی اظہار نہیں کیا کہ اس کی کارکردگی کیسی تھی۔ وہ تو بے جان، جذبات سے عاری ''روبوٹ'' (Robots) کی طرح تھے۔ ہر روز اس کی جسمانی قوت جانچنے کے لئے اس کی پیٹھ پر پتھروں سے بھرا ہوا تھیلا باندھ کر بعد دوپہر کی شدید گرمی میں صحرا میں دوڑایا جاتا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے نگرانی میں تھا لیکن اسے کوئی یہ نہیں بتاتا تھا کہ وہ معیار پر پورا اتر رہا ہے یا نہیں۔ ایک دوسری قسم کی آزمائش اس طرح کی جاتی تھی کہ اسے اپنی مشقوں کے علاقے سے باہر لے جا کر اس قسم کے سوال پوچھے جاتے تھے۔ ''اگر صحرائی بدوؤں کی کوئی بچی تمہیں دیکھ لے تو کیا تم اپنے اخفاء کی خاطر اسے قتل کر دو گے؟''

''تمہارا سامنا کسی ایسے اسرائیلی زخمی فوجی سے ہوتا ہے جو کسی دوسرے مشن پر دشمن کے علاقے میں گیا ہوا تھا، تم اس کی مدد کرنے کے لئے رک جاؤ گے یا یہ خیال کرتے ہوئے اسے چھوڑ کر آگے نکل جاؤ گے کہ اس نے تو اب مر ہی جانا تھا؟''

شالوم کے جوابات کو حتمی نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ ان سوالوں کا مطلب ایک دوسرے طریقے سے اس کی اس قابلیت کو آزمانا تھا جس کا مظاہرہ وہ کسی بھی دباؤ کی کیفیت میں وہ کر سکتا تھا۔ وہ کسی سوال کا جواب دینے میں کتنا وقت لیتا تھا؟ وہ جواب دیتے وقت گھبراہٹ کا شکار یا مطمئن دکھائی دیتا تھا؟

وہ اتنی ہی خوراک کھاتا تھا کہ صحرا میں اس کے سانس کی ڈوری قائم رہ سکے اور پینے کے پانی کے لئے اسے کھاری پانی کے ان جوہڑوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا جو بارش کی وجہ سے ریت میں کہیں کہیں پائے جاتے تھے۔ اس نے موساد کے ایک ماہر نفسیات کے ساتھ اکیلے بیٹھ کر مایوسی سے بچنے اور پرسکون رہنے کی تربیت بھی لی تھی۔ ڈاکٹر یہ بھی چاہتا تھا کہ شالوم اپنے بارے میں بھی غور و فکر کرے تا کہ اپنی صلاحیت اور سنگدلی کا میدان عمل میں پیش آمدہ غیر متوقع صورت حال میں مظاہرہ کر سکے۔ ذہنی میلانات اور رجحانات سے اس کی جذباتیت اور قوت برداشت کے بھی ٹیسٹ لئے گئے تھے۔ اس کے بارے میں اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا تھا کہ ان سختیوں اور جان لیوا ٹریننگ کے نتیجے میں اس میں تنہائی پسندی، اکیلا بھیڑیا جیسے رجحانات تو پیدا نہیں ہو گئے کہ وہ دوسرے پیشے چھوڑ کر موساد کا ایجنٹ بننے ہی کیوں چلا آیا۔ اس

رجحان نے ماضی میں کئی ایجنٹوں کے مستقبل کو تباہی سے دوچار کیا تھا۔

ایک لب و لہجے اور زبان دانی کا ماہر اس کے ساتھ بیٹھ کر اس سے صوفیانہ اقوال سنا کرتا تھا۔ فارسی اور عربی زبان کا وہ پہلے ہی ماہر تھا اور اس نے بہت جلد صحرائی بدوؤں کا لب و لہجہ بھی سیکھ لیا۔ ہر رات کو سونے کے لئے اسے صحرائے نا گیو (Negev Desert) کے مختلف حصوں میں گاڑی کے پیچھے چھوڑا جاتا تھا۔ وہ ریت میں بھٹ بنا کر لیٹ جاتا تھا۔ چند لمحے آرام کرتا تھا، کچھ دیر اونگھتا تھا، گہری نیند بالکل نہیں سوتا تھا اور پہلا ٹھکانہ چھوڑ کر آگے روانہ ہو جاتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے انسٹرکٹر اس کی خفیہ نگرانی کرتے تھے اور اس کے تعاقب میں رہتے تھے۔ ان کے ہاتھوں پکڑے جانے کا مطلب تھا کہ اس کا مشن یا تو اس کی مزید ٹریننگ کے لئے ملتوی کر دیا جائے گا یا کسی اور ایجنٹ کو دے دیا جائے گا۔

شالوم ہمیشہ ان کی پکڑ سے بچ نکلتا تھا۔ 25 نومبر 1990ء کو اسے اسرائیلی وفاقی افواج کے علاقائی کمانڈ کے ہیلی کاپٹر سی ایچ 536 (CH536) سیکورسکی پر سوار کر دیا گیا۔

اس ہیلی کاپٹر کے کریوز کو اس مشن کی علیحدہ ٹریننگ دی گئی تھی۔ ناگیو صحرا کے ایک دوسرے حصے میں انہیں رات کے اندھیرے میں کم بلندی پر اڑتے ہوئے رستے کے فضائی رکاوٹوں سے بچنے کی تربیت دی گئی تھی۔ ہیلی کاپٹر کی چرخیاں صحرائی ریت سے ٹکرائی گئی تھیں تاکہ وہ عراقی صحرا میں اڑنے کی تکنیک کو بہتر بنا سکیں اور ریت سے بچتے ہوئے اپنی مشین کو اڑاتا تھا۔ ایک اور مشق میں انسٹرکٹر ہیلی کاپٹر کو فضا میں کھڑا کر کے اپنے اہداف پر ہتھیاروں سے فائرنگ کرتے تھے اور پائلٹ محکم انداز میں اپنی مشین کو سنبھالے رکھتا تھا۔ اس دوران پائلٹ کے معاون اپنے راستے کے نقشے کا مطالعہ کر لیتے تھے۔

صرف اس کے کمانڈنگ آفیسر، میجر جنرل ڈینی یاتوم (Dany Yatom) کو اس روٹ کا علم تھا جس سے انہوں نے عراقی بارڈر کی طرف پرواز بھرنی تھی۔ یاتوم (Elite Syeret Matkal) کمانڈو یونٹ کا ممبر تھا جو اسرائیل کی گرین بیریٹس کہلاتی تھی، جس نے 1972ء میں تل ابیب ائرپورٹ پر بلجیم کے اغوا شدہ جہاز پر نہایت کامیابی سے یلغار کی تھی۔ اس مشن کے دوسرے کمانڈوز میں (اسرائیل کا موجودہ وزیراعظم) بنیامین نیتن یاہو (Benyamin Netanyahu) بھی شامل تھا۔ اسرائیل کے مستقبل کے وزیراعظم سے دوستی کے نتیجے میں یاتوم کو موساد کی کمانڈ سپرد کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا عہدہ تھا جس نے نیتن یاہو سے اس کے تعلقات کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن یہ سب کچھ تو بہت بعد میں ہوا تھا۔

دسمبر کی اس صبح کو وادی کے کنارے جبکہ شالوم ابھی آنکھیں ملتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس کو اس دور دراز سفر اور دشمن کے علاقے میں اندر تک بھیجنے کا فیصلہ "کیریا" (Kirya) یعنی اسرائیلی مسلح افواج کے ہیڈ کوارٹر کے ایک کانفرنس روم میں کیا گیا تھا، جو تل ابیب میں واقع تھا۔

جس اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا تھا اس میں یاتوم کے علاوہ امنان (Amnon) شہاک، امان (Aman) یعنی ملٹری انٹیلی جنس کا سربراہ اور موساد کا ڈائریکٹر جنرل شبتائی شاوت بھی شامل تھے۔ یہ اجلاس اس اطلاع پر سوچ بچار کرنے کے لئے بلایا گیا تھا جو یورپ میں ایران کے وحشت گروپ میں سرایت کئے ہوئے مخبر نے فراہم کی تھی۔ شاوت کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا اطلاع دینے والا مخبر عورت ہے یا مرد۔ اسے صرف نمبر 1 سے جانا جاتا تھا۔ اس اطلاع سے شہاک اور یاتوم نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہی تھا کہ مخبر کو یقینی طور پر بون جرمنی میں واقع ایران

کے قلعہ نما سفارتخانے کی تیسری منزل تک رسائی حاصل تھی۔ اس سفارتی کمپلیکس میں چھ دفاتر اور ایک ایک سو اصلاتی (کمیونیکیشن) روم واقع تھا۔ اس عمارت کو بم پروف بنایا گیا تھا اور 20 انقلابی گارڈز ہمہ وقت اس کی نگرانی کرتے رہتے تھے جن کا یہ بھی کام تھا کہ مغربی یورپ میں دہشت گردانہ سرگرمیوں میں رابطہ قائم رکھیں۔ انہوں نے انہی دنوں لبنان سے ایک ٹن دھماکہ خیز مادہ سیمٹیکس (Semtax) اور الیکٹرانک ڈیٹونیٹرز چین سمگل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ دھماکہ خیز ساز وسامان یورپ میں پھیلے ہوئے ایران سے ہمدردی رکھنے والے دہشت گرد گروپوں میں تقسیم کرنے کے لئے تھا۔ موساد کی مہیا کردہ اطلاع پر سپینش (Spanish) کسٹم حکام نے اپنی سمندر حدود میں داخل ہوتے ہی بحری کشتی پر قبضہ کر لیا تھا۔

لیکن 1990ء کے موسم گرما کے آغاز تک ایران اپنے بون، جرمنی کے سفارتخانے کے ذریعے اسلامی بنیاد پرستی کے اثرات کو پھیلانے اور دہشت گردی کے فروغ کے لئے یورپ میں بڑے پیمانے پر پیسہ تقسیم کر رہا تھا۔ جو رقوم تقسیم کی جارہی تھیں اس پر حیرت ہوتی تھی کیونکہ عراق کے ساتھ آٹھ سالہ جنگ جو 1988ء میں سیز فائر پر ختم ہوئی تھی، ایران کی معیشت کو اپاہج بنا کے رکھ دیا تھا۔

لیکن کیریا، اسرائیلی دفاعی افواج کے ہیڈ کوارٹر کے کانفرنس روم میں نومبر کے اس روز ہونے والی میٹنگ میں اس اطلاع کو جو ڈبل ایجنٹ نے بھیجی تھی، ایران کی طرف سے کوئی نئی دھمکی خیال نہیں کیا گیا۔ یہ خطرہ عراق کی طرف سے تھا۔ ایجنٹ نمبر 1 کے ہاتھ عراق کے ایک ایسے جنگی منصوبہ کی کاپی ہاتھ لگ گئی تھی جو خود ایرانی انٹیلی جنس سروس نے بغداد کے ملٹری ہیڈ کوارٹر سے چرائی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ایران، کویت اور اسرائیل کے خلاف جنگ میں کیمیکل اور جراثیمی

ہتھیاروں کے ساتھ، استعمال کیا جائے گا۔

کانفرنس روم میں موجود افراد کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ''کیا یہ اطلاع قابل بھروسہ ہے؟'' ایجنٹ نمبر 1 نے اپنے آپ کو ماضی میں ہمیشہ قابل بھروسہ ثابت کیا تھا اور اس کا بھیجا ہوا ''ڈاٹا'' عموماً درست ثابت ہوتا رہا تھا۔ اگرچہ موجودہ اطلاع نہایت اہم تھی لیکن نمبر 1 کے بارے میں قدرے شکوک وشبہات بھی پیدا کرتی تھی۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ یہ جنگی منصوبہ ایرانی انٹیلی جنس ایجنسی کی اپنی اختراع ہوتا کہ اسرائیل کو عراق پر پیش بندی کے طور پر پہلے حملہ کرنے پر اکسایا جاسکے۔ کیا نمبر 1 کا نقاب اتر گیا تھا اور ایرانی اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کام کے لئے وقت چاہیے تھا تاکہ کسی دوسرے ایجنٹ کو تیار کر کے نمبر 1 سے رابطے کے لئے بھیجا جائے۔ اس میں کئی ہفتے بھی لگ سکتے تھے، ایک مخبر کو اس کی کمین گاہ سے کھود نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا اور انتہائی سست روی کا نازک کام تھا۔ اگر یہ ثابت بھی ہوجائے کہ وہ اب بھی اسرائیل کا ہمدرد اور وفادار تھا تو اس کی اپنی جان خطرے میں پڑ سکتی تھی لیکن عراقی پلان پر بلا تحقیق اور تصدیق ایکشن سے اسرائیل کی خود اپنی تباہی وبربادی کا باعث بن سکتا تھا۔ عراق پر پہلے حملے کرنے پر یقیناً عراق بھی جوابی حملہ کرے گا اور واشنگٹن میں کی جانے والی ان کوششوں کو ختم کر دے گا جو صدام کو کویت سے مار بھگانے کے لئے اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی خاطر مختلف ممالک کے درمیان کی جارہی تھیں اور بہت سے ہمسایہ عرب ممالک یقینی طور پر اسرائیل کے خلاف، عراق کا ساتھ دیں گے۔

عراق کے جنگی پلان کی تصدیق کا ایک ہی طریقہ بچا تھا کہ شالوم کو عراق بھیج جائے۔ رات کی گہری تاریکی

میں صحرا کے اوپر سے اڑان بھرتے ہوئے اس کے ہیلی کاپٹر نے اردن کی صحرائی پٹی کے اوپر سے بھی پرواز کی تھی۔ نظر نہ آنے والے رنگ سے رنگے ہیلی کاپٹر کے انجن کی آواز بند رکھی گئی تھی۔ لہٰذا اردن کے جدید ترین راڈار سسٹم کے لیے بھی اس کی اپنی فضائی حدود میں سراغ لگانا ممکن نہ تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے اڑا جا رہا تھا کہ اس کے گھومنے والے پر (روٹر بلیڈز) بھی کوئی آواز پیدا نہیں کر رہے تھے۔ لہٰذا انتہائی خاموشی کے ساتھ ہیلی کاپٹر عراقی حدود کے اندر اس مقام تک پہنچ گیا جہاں شالوم کو اتارا جانا تھا۔

زمین پر اترتے ہی شالوم رات کی گہری تاریکی میں غائب ہو گیا۔ انتہائی سخت ٹریننگ کے باوجود وہ اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اب اس نے اپنے زندہ رہنے، حفاظت اور وسائل کا خود ہی بندوبست کرنا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اردگرد کے ماحول میں ڈھالنا تھا۔ صحرا کے اندر جو ناقابل تصور صورت حال پیش آ سکتی تھی اس کے بارے میں اور کہیں روئے زمین پر سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ لمحوں میں ریت کا طوفان آ سکتا تھا، زمینی سطح اچانک تبدیل ہو کر اسے زندہ دفن کر سکتی تھی۔ آسمان کا رنگ لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہو رہا تھا۔ ایک رنگ کا مطلب اور دوسرے رنگ کا کچھ اور ہو سکتا تھا۔ اس نے موسم کی تبدیلی کا اندازہ خود ہی لگانا تھا اور ہر چیز خود ہی کرنی تھی۔ اپنے کانوں کو صحرا کی خاموشی کا عادی بنانا تھا اور صحرا کی خاموشی کی مثال کسی دوسری خاموشی سے نہیں دی جا سکتی اور اسے یہ بھی یاد رکھنا تھا کہ اس کی پہلی غلطی اس کی زندگی کی آخری غلطی بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

ہیلی کاپٹر سے صحرا میں قدم رکھنے کے تین دن بعد دسمبر کی اس سرد صبح صادق کو شالوم عراقی وادی میں منہ کے بل گرا پڑا تھا۔ اس کے چہرے (چٹا) کے نیچے اس کا دھوپ کا چشمہ تھا، جس کے شیشوں سے تاریکی میں زمین گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ شالوم کے پاس جو ایک ہتھیار تھا وہ سرائی یعنی ایک شکاری چاقو تھا۔ اس چاقو کی مدد سے اسے کئی طریقوں سے قتل کرنے کا طریقہ سکھایا گیا تھا۔ کیا وہ اسے اپنے سے زیادہ طاقتور کے خلاف بھی استعمال کرنے کے قابل ہو سکے گا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا، یا اسے اپنے ہی خلاف استعمال کرے گا۔ یا آرام سے وہ زہریلی گولی نگل کر خودکشی کر لے گا جو اس کے قبضے میں تھی۔ ایلی کوہن (Eli Cohen) کی اس کے تفتیش کنندگان کے ہاتھوں تشدد اور موت کے وقت سے ان مخبروں اور ایجنٹوں کو جو ایران، عراق، یمن اور شام میں خفیہ سرگرمیوں اور جاسوسی کی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ دشمن کے ہاتھوں وحشیانہ تشدد کا نشانہ بننے کی بجائے خودکشی کر لینے کا حق دے دیا گیا تھا۔ شالوم مسلسل ماحول کا جائزہ لینے اور انتظار میں مصروف تھا۔

وادی سے تقریباً آدھے میل کے فاصلے پر مقیم خانہ بدوشوں نے اپنے کیمپ میں صبح کی پہلی عبادت (نماز پڑھنے) کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ہوا کے دوش پر پہلے ہی آنی شروع ہو چکی تھیں لیکن ان کے بال مویشی طلوع آفتاب سے پہلے کیمپ سے باہر نہیں نکلیں گے۔ یہ صحرائی طور اطوار کا پہلا سبق تھا جو شالوم نے پڑھا تھا اور جو صحرا میں اس کی بقا کے لیے ضروری تھا۔

اس کو جو تفصیل بتائی گئی تھی، خانہ بدوشوں کا یہ کیمپ اس کے بائیں طرف وادی اور پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ ظاہری آنکھ سے اس راستے کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا جس پر اس سے قبل ملٹری قافلہ گزرا تھا۔ شالوم کے لیے یہ انتہائی واضح اور صاف تھا جیسے کہ ایک نشان زدہ سڑک۔ ریت کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں اس راستے کی نشاندہی کر رہی تھیں جہاں سے گاڑیاں گزر چکی تھیں۔

سورج بلند ہو چکا تھا، جب قافلہ نظر آنا شروع ہوا،
ـ گاڑی پر سکڈ میزائل اور اس کا لانچر لدے ہوئے
ے۔ یہ ابھی آدھا میل تھا کہ وہیں رک گیا۔ شالوم نے
ں کی تصویر کھینچنی شروع کر دیں اور وقت نوٹ کر لیا۔

سکڈ میزائل (Scud Missile) کو لانچر پر
ھانے اور چلانے میں عراقی فوجیوں کو پندرہ منٹ کا
ت لگا۔ اس نے کمان کی شکل اختیار کی، قوس و قزح کا
ـ کا چھوڑتا ہوا فضا میں غائب ہو گیا۔ چند منٹ بعد ہی
فلہ تیزی سے پہاڑوں کی طرف بھاگ رہا تھا۔ چند ہی
ٹ میں اس سکڈ میزائل نے تل ابیب یا کسی بھی
رے اسرائیلی شہر کو نشانہ بنا ڈالنا تھا۔ بشرطیکہ یہ ایک
بائی فائر نہ تھا۔ اب شالوم نے تل ابیب کی طرف
پسی کا اپنا لمبا سفر کر دیا۔

چھ ہفتے بعد 12 جنوری 1919ء کو شالوم اس
تر کہ ٹیم میں شامل تھا جو موساد اور امان کے افسروں پر
تمل تھی، جو یونائیڈ سٹیٹس جائنٹ سپیشل آپریشن کمانڈ
(JSOC) (اس کا سٹاف اسے "جے ساک" کہتا تھا)
نام "پوپ ائرفورس بیس" جارجیا کی کانفرنس روم کی میز
ے مہمان تھے۔ گرین بیرٹس (Green Berets)
سیلز (Seals) کی کمانڈ جے ایس او سی کے ہاتھ میں
ں اور اس کا موساد سے قریبی کاروباری تعلق تھا۔ شالوم
عراق سے واپسی کے بعد شاد مک نے جنرل ارل سٹینر
(Earl Stiner) کو اطلاع دی تھی، جو جے ایس او سی
آپریشن کمانڈر تھا کہ صدام ہمارے اندازوں سے بڑھ
جنگی تیاریاں کر رہا تھا۔ جنرل ملنسار طبیعت اور میٹھی
ن کا مالک تھا جسے اسرائیلی بہت پسند کرتے تھے لیکن
ں معاملات میں ضرب شدید لگانے کا عادی تھا اور وار
م کے اندر وہ اپنے مدبرانہ فیصلوں میں ذرا دیر نہیں لگاتا
ـ کمانڈو فورس کے سب سے اونچے عہدے پر ہونے
وجہ سے اسے اچھی انٹیلی جنس کا خوب اندازہ تھا اور

مڈل ایسٹ کے اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر وہ سمجھتا تھا کہ موساد نے بہترین جاسوسی مواد پیش کیا تھا۔

صدام کی کویت پر یلغار کے بعد سے وہ اپنے اسرائیلی ہم منصب کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا۔ اسے 1983ء کا وہ دور یاد تھا جب وہ نیا نیا بریگیڈیئر جنرل پروموٹ ہوا تھا اور اسے خفیہ طور پر پینٹاگان کی طرف بیروت بھیجا گیا تھا اور اسے براہ راست امریکہ کے جائنٹ چیف آف سٹاف کو رپورٹ دینی تھی کہ امریکہ کس طرح لبنان کی جنگ میں مداخلت کر سکتا تھا۔

بعدازاں اس نے موساد کے ساتھ مل کر اس وقت بھی کام کیا تھا اچیلے لورو (Achille Lauro) ہائی جیکنگ کے وقت اٹلی کی سسلی ائرفورس بیس پر اپنی ڈیلٹا فورس (Delta Force) کے کمانڈو اتارے تھے۔ جہاں ہائی جیکر، اپنی آزادی کی منزل، مصر کی طرف جاتے ہوئے اغوا شدہ جہاز کے ساتھ رکے تھے۔ اٹلی کے فوجیوں نے سٹنر کو ہائی جیکروں کو پکڑنے سے روک دیا تھا اور وہاں فائرنگ کا تبادلہ بھی ہو گیا تھا۔ ناکام اور جھلائے ہوئے سٹنر نے اغوا شدہ جہاز کا اپنے ملٹری جہاز میں گرم تعاقب کیا تھا اور یہ تعاقب اس وقت ختم کرنا پڑا تھا جب اغوا شدہ طیارہ روم کی فضائی حدود میں داخل ہو گیا تھا اور وہاں کے ائر کنٹرولر نے دھمکی دی تھی کہ فضائی حدود کی خلاف ورزی کے جرم میں وہ ڈیلٹا فورس کے جہاز کو شوٹ ڈاؤن (Shoot Down) کر دیں گے۔

1989ء میں سٹنر پانامہ (Panama) پر چڑھائی کرنے والی کمانڈو فورس کا گراؤنڈ کمانڈر تھا اور فوری طور پر مانوئل نوریگا (Manuel Norlega) کو پکڑنے کا ذمہ دار تھا۔

صرف جائنٹ چیفس کے چیئرمین جنرل کولن پاول اور جنرل نارمن شوازکوف (Norman Schwarzkopf) متحدہ افواج کے سربراہ کو علم تھا کہ

جنرل سٹر کے موساد کے ساتھ روابط ہیں۔ جس وقت سعودی سرحد کے ساتھ ایک دفاعی لائن قائم کر کے عراقی افواج کو کویت سے باہر دھکیلنے کی کوششوں میں جتا ہوا تھا، سٹر کے افسر موساد کے ساتھ مل کر عراق کے اندر مزاحمتی تحریک اٹھانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تاکہ صدام کے اقتدار کا خاتمہ کیا جا سکے۔

جب میجر جنرل وینے ڈاؤننگ جے ایس او سی نے کانفرنس روم میں میٹنگ بلائی، سب کو علم تھا کہ جیسے جیسے اقوام متحدہ کی جنگ کے لئے طے کردہ تاریخ قریب آ رہی تھی جو کہ منگل 15 جنوری 1991ء تھی، دنیا بھر کے حکمران صدام سے مکالمہ کرنے پر زور دے رہی تھی۔ صدام کا لگاتار یہی دعویٰ تھا کہ "یہ جنگ، سب جنگوں کی ماں ثابت ہوگی"۔

ڈاؤننگ نے اپنے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے یاد دہانی کرائی کہ "واشنگٹن اب بھی چاہتا ہے کہ اسرائیل اس جنگ سے باہر رہے۔ اس کے بدلے میں اسے لمبی مدت تک سیاسی حمایت اور اقتصادی امداد سے نوازا جائے گا۔"

اسرائیلیوں نے فوری طور پر شالوم کی کھینچی ہوئی سکڈ میزائلوں کی بڑے سائز میں تیار کی ہوئی تصویر دکھانا شروع کر دیں۔ پھر انہوں نے سوال پوچھنے شروع کر دیئے۔ "فرض کیا صدام سکڈ میزائلوں کے ساتھ ایٹمی وار ہیڈ فٹ کر دیتا ہے؟ موساد کو پہلے ہی اس بات کا یقین تھا کہ اس نے ایسے ہتھیاروں کی ابتدائی تیاری شروع کر رکھی تھی۔ اس کے پاس سکڈ میں کیمیکل اور جراثیمی ہتھیار فٹ کرنے کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ کیا ہم اسرائیلی ان کے برسنے کا انتظار کریں؟" کیا اتحادی افواج کے پاس ان سکڈ میزائلوں سے نبٹنے کا بھی کوئی منصوبہ ہے؟ قبل اس کے کہ وہ ہم پر گرا دیئے جائیں۔ کیا امریکیوں کے پاس کوئی ایسی اطلاع ہے کہ صدام کے پاس کتنے سکڈ ہیں؟

ڈاؤننگ کے افسران میں سے ایک نے جواب دیا۔ "ہمارا بہترین اندازہ ہے کہ صدام کے پاس پچاس کے قریب سکڈ ہو سکتے ہیں"۔

"ہمارا خیال ہے کہ صدام کے پاس اس سے پانچ گنا زیادہ اور ممکنہ طور پر پانچ سو تک سکڈ موجود ہیں"۔ شبتائی شاوت موساد کے سربراہ نے جواب دیا۔

کانفرنس روم میں سناٹا چھا گیا، جسے ڈاؤننگ کے سوال نے توڑا۔

"کیا آپ بالکل صحیح تعداد بتا سکتے ہیں؟" شاوت کے پاس کوئی مدلل جواب نہ تھا، سوائے اس کے سکڈ عراق کے مغربی صحرا اور ملک کے مشرقی حصوں میں دیکھے گئے تھے۔ امریکن افسروں نے ڈاؤننگ سے اتفاق کا اظہار کیا کہ "وسیع و عریض صحرا میں ان کے چھپائے جانے کا امکان ہو سکتا تھا"۔

"پھر آپ جتنی جلدی جنگ شروع کریں، اتنا ہی بہتر ہوگا۔" شاوت نے کہا۔ اس نے اپنی مایوسی کو چھپانے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی۔

ڈاؤننگ نے وعدہ کیا کہ وہ زوردار طریقے سے اس پر توجہ دے گا اور میٹنگ برخاست ہو گئی لیکن ساتھ ہی اس نے اسرائیلیوں کو دوبارہ یاد دلانا ضروری خیال کیا کہ اسرائیل آنے والے تصادم میں کودنے سے باز رہے۔ لیکن موساد اور امان کی طرف سے جو بھی اسے انٹیلی جنس مہیا کی جائے گی اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس دوران یونائیٹڈ سٹیٹس اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ سکڈز سے نبٹ لیا جائے گا"۔

اسرائیلی ٹیم یہ احساس لے کر گھر روانہ ہو گئی کہ انہیں اس میٹنگ سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

17 جنوری 1991ء کو صبح 3 بجے صحرائی طوفان (ڈیزرٹ سٹارم) نامی لڑائی کا آغاز ہونے کے فوراً بعد سات سکڈ میزائل تل ابیب اور حیفہ کی بندرگاہوں سے آ

کرائے جن سے 1587 بلڈنگیں تباہ اور 47 شہریوں کو
ی کردیا۔

بعدازاں اسی صبح کو اسرائیلی وزیراعظم یزہاک
امیر نے ہاٹ لائن پر واشنگٹن سے پوچھا کہ "کتنے
رائیلیوں کی ہلاکت کے بعد صدر بش کچھ کرے گا؟"
یہ مختصر کال صدر بش کے صبر و تحمل پر زور دینے اور
امیر کے اس انتباہ کے ساتھ ختم ہوئی کہ "اسرائیل زیادہ
میدان جنگ سے باہر بیٹھ کر اپنی تباہی کا تماشہ نہیں
یکھے گا"۔

شامیر نے پہلے ہی اسرائیلی ائرفورس کے جیٹ
یاروں کو حکم دے دیا تھا کہ وہ اسرائیل کی شمالی فضائی
رود، جو عراق سے ملتی تھی، نگرانی کریں۔ صدر بش نے
را وعدہ کیا کہ "اگر شامیر اپنے جیٹ طیاروں کو واپس بلا
لے تو وہ دو پیٹریاٹ میزائل شکن بیٹریز بھیج کر اس کے
ہروں کی حفاظت کرے گا اور اتحادی افواج چند دن کے
ر باقی سکڈز کو تباہ کردیں گی"۔

سکڈ میزائل برابر اسرائیل پر برستے رہے۔ 22
وری کو ایک سکڈ تل ابیب کے نواحی علاقے رامات گان
کرا جس سے 96 اسرائیلی شہری زخمی ہوئے، کچھ شدید
ی اور تین افراد دل کے دورے سے مر گئے۔ دھماکے کی
واز موساد کے ہیڈکوارٹرز تک پہنچی۔ ملٹری ہیڈکوارٹرز
میریا اسنان شاہاک نے ملٹری کمانڈ سینٹر سے کے
سری منزل پر واقع میناکان سے براہ راست رابطہ کیا۔
ں کی غصیلی کال شامیر سے بھی مختصر تھی۔ "کچھ کریں ورنہ
رائیل خود کرے گا"۔

چند گھنٹے بعد ڈاؤننگ اور اس کے ساتھی کمانڈوز
ودی عرب کی طرف کو پرواز تھے۔ عراقی سرحد کے
یب واقع گاؤں عرعر میں شالوم ان کے انتظار میں تھا۔
برٹش آرمی کی یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کبھی نہیں
ا اور نہ کبھی کسی نے اس سے پوچھا کہ یہ یونیفارم اسے
کہاں سے ملی تھی۔ جو خبر وہ لایا تھا وہ چونکا دینے والی تھی۔
وہ اس بات کی تصدیق کرسکتا تھا کہ وہاں سے تیس منٹ
سے کم فلائنگ ٹائم کے فاصلے پر چار سکڈ لانچر موجود تھے۔

"آؤ چلیں!" اس نے اپنے کمانڈوز سے کہا۔
"کچھ بیٹروں کو بھون آئیں"۔

چینوک ہیلی کاپٹر اس ٹیم کو عراق صحرا کے اندر تک
لے گیا۔ ان کے ساتھ ایک خصوصی طور پر تیار کردہ لینڈ
روور جیپ بھی تھی جو ناہموار، کھردری اور ریتلی زمین پر
چلنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ ایک گھنٹے کے اندر انہوں
نے سکڈ لانچر کا سراغ لگالیا۔ ایک محفوظ ریڈیو پیغام کے
ذریعے کمانڈو لیڈر نے یو ایس ائرفورس کے بمبار جیٹ
بلا لئے جو آتشگیر مادے اور ہزار پونڈ بموں سے لدے
ہوئے تھے۔ ایک فضا میں معلق بلیک ہاک ہیلی کاپٹر نے
سکڈز کی تباہی کی ویڈیو تیار کی۔

چند گھنٹے بعد ہی اسرائیلی وزیراعظم شامیر تل ابیب
میں اپنے دفتر میں بیٹھا ویڈیو دیکھ رہا تھا۔ امریکن صدر بش
کی ایک اور ٹیلیفون کال کے جواب میں شامیر نے
اعتراف کیا کہ اسرائیل کو جنگ کے دائرے سے باہر
رکھنے کے بارے میں وہ کافی کچھ دیکھ چکا ہے۔ دونوں
میں سے کسی نے بھی جنگ میں موساد کے کردار کا ذکر نہیں
کیا۔

گلف وار کے باقی دنوں میں سکڈ میزائلوں سے
مارے جانے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تقریباً 500
افراد تھی جن میں 128 امریکن ہلاک یا زخمی شامل تھے جو
سعودی عرب میں سکڈ میزائل کے حملے کا نشانہ بنے تھے،
اس کے علاوہ چار ہزار یہودیوں کو اسرائیل میں بے گھر
ہونا پڑتا تھا۔

گلف جنگ کے بعد اسرائیلی پارلیمنٹ کی خارجہ
امور اور ڈیفنس اور سائنٹ انٹیلی جنس اداروں کو عراق کی
طرف سے کویت پر یلغار کے بارے میں پیشگی اطلاع نہ

دے سکنے کی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا، نہ ہی دونوں ادارے عراقی خطرے کے بارے کوئی اہم اطلاع فراہم کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ کمیٹی روم کے اندر سے خفیہ میٹنگوں کی باہر آنے والی خبروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ کمیٹی کے ممبروں امان کے سربراہ امان شہاک اور موساد کے سربراہ شاوت کے درمیان الزامات اور جوابی الزامات کا پیچ پڑا ہوا تھا۔ آپس کی ایک جھڑپ کے بعد موساد کا سربراہ تو استعفیٰ دینے پر تیار ہو گیا تھا لیکن موساد کی کمان ابھی اس کے ہاتھ سے نکلی نہ تھی۔

موساد شعبہ نفسیاتی جنگ ایل اے پی جس کا کام اسرائیل کے دشمنوں کے خلاف ڈس انفارمیشن پھیلانا اور غیر ملکی اور لوکل صحافیوں کے ذریعے مخالفین کے کردار کو داغدار بنا کر پیش کرنا ہوتا تھا۔ اس نے اپنی توجہ کا مرکز مقامی ذرائع ابلاغ کو بنالیا۔ انہوں نے اپنے پسندیدہ اور چہیتے صحافیوں کو بلایا اور انہیں بتایا کہ مسئلہ انٹیلی جنس کی ناکامی یا خفیہ اطلاعات کا نہیں تھا بلکہ اسرائیلی پبلک، کو اس معاملے میں گمراہ اور اسے ہمیشہ کامیابیوں کی خبریں سننے پر تیار کیا جاتا رہا تھا۔

حقیقت حال کو لیپ (LAP) نے اچھالنا شروع کر دیا۔ دنیا کی کسی ملک کی انٹیلی جنس ایجنسی اپنی آبادی اور ملک کے رقبے کے حساب سے جھوٹے پروپیگنڈے کی اتنی ماہر نہیں جتنی تھی اسرائیل کی موساد تھی۔ اس میدان میں دنیا کی کوئی بھی خفیہ سروس موساد کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ لوگوں کے ذہن بدلنے، دشمنوں کے اندر مایوسی پھیلانے اور جھوٹے پروپیگنڈے کا طوفان اٹھانے میں گزشتہ پچاس سال میں اس کا کوئی مد مقابل نہیں تھا۔ اس کا خریدا ہوا پریس اور صحافی اندرونی خفیہ کہانیاں ان پر افشاء کرنے پر ہمیشہ لیپ کے ممنون احسان رہتے تھے۔

ایک دم سے اخبارات میں اس قسم کے مضامین شائع ہونے لگے کہ مختلف وار سے پہلے وفاقی بجٹ پر کٹ لگنے کے باوجود موساد نے لبنان، اردن، شام اور عراق میں اپنی خفیہ سرگرمیوں کی جنگ جاری رکھی۔ موساد کو سیاستدان اس لئے اپنی تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے کیونکہ انہوں نے وفاقی بجٹ کا جھٹکا کر دیا تھا۔ یہ ایک آزمودہ نسخہ تھا اور ہمیشہ کامیاب رہتا تھا۔ اسرائیلی پبلک جو سکڈ حملوں کے خوف سے باہر نکل رہی تھی، اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، لہٰذا پریس اور عوام کی طرف سے تمام تر تنقید کا نشانہ موساد کی بجائے سیاستدان بننے لگے۔ پھر اچانک ہی وفاقی بجٹ کے لئے پیسہ مہیا ہونے لگا۔ اب تک اسرائیل سٹلائٹ ڈاٹا (Satellite Data) کے لئے امریکہ پر انحصار کرتا چلا آ رہا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلی ملٹری سٹلائٹ پر مرکوز کر دی گئی، خصوصی طور پر عراق پر نظر رکھنے کے لئے ایک نئی قسم کے اینٹی میزائل میزائلوں کی تیاری میں تیزی لائی گئی۔ پیٹریاٹ میزائلوں کی کئی بیٹریوں کا امریکہ کو آرڈر دے دیا گیا۔

انٹیلی جنس سب کمیٹی موساد کے حق میں اتنے بڑے پیمانے پر پروپیگنڈے کو دیکھ کر اپنی اہمیت کھونے لگی۔ شاوت فاتح بن کر ابھرا اور وہ موساد کو پہلے جیسی اہم پوزیشن دلانے کے لئے پرعزم ہو گیا۔ عراق میں اہم پوزیشنوں پر سرایت کئے ہوئے موساد کے ایجنٹوں کو اس نے حکم بھیجا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ اتحادیوں کی بمباری سے عراق کے کیمیکل اور بائیولوجیکل (Chemical + Biologial) ہتھیاروں کے ذریعے کتنی مقدار میں بچ رہے تھے۔

ایجنٹوں نے معلوم کر لیا کہ عراق کے پاس اب بھی کافی مقدار میں انتھریکس، سمال پوکس، ایبولا وائرس اور کیمیاوی نروگیس، جو ہر آدمی، عورت اور بچے کو پورے اسرائیل میں ختم کر سکتی تھی بلکہ دنیا کے ایک بڑے حصے کی آبادی کو بھی نیست و نابود کر سکتی تھی، موجود تھی۔

O